خدا بخش لائبریری

جرنل

۷۸

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

خدابخش لائبریری

تماہی

جرنل

پٹنہ

۴۸

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۴۲۴/۷۷
شمارہ : اڑتالیسواں
قیمت : پچیس رُپے

قیمت فی شمارہ : پچیس رُپے
سالانہ : ۱۰۰ رُپے (ہند)
۲۰ ڈالر (ایشیا)، ۳۰ ڈالر (دیگر ممالک)

فہرست

۱۹۸۸ء

خدا بخش لائبریری نے پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین، پٹنہ ۴ اور لبرٹی آرٹ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کیا۔

ایڈیٹر : عابد رضا بیدار

وُرودِ مسعود

خودنوشت سوانحِ حیات

از

پروفیسر مسعود حسین خاں
علیگڑھ

حرفے چند

خدابخش لائبریری نے موجودہ صدی کے اردو فارسی کے اہم محققین، ادبا، شعرا اور ناقدین کی خود نوشت سوانح عمریاں شائع کرنے کی ایک اسکیم بنائی ہے۔ 'وردِ مسعود' اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے ——— ڈاکٹر اقبال حسین، وامق جونپوری اور ڈاکٹر معین احسن جذبی وغیرہ کی سوانح عمریاں بھی جلد ہی شائع ہوں گی۔

ڈاکٹر مسعود حسین (پ ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء) پروفیسر رشید احمد صدیقی کے شاگرد خاص اور بعد میں ان کے رفیق کار، ماہر لسانیات و دکنیات، اردو ادب کے اہم ناقد ——— اور ان موضوعات پر متعدد کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ نومبر ۱۹۴۳ء تا مئی ۱۹۶۲ء علیگڑھ کے شعبہ اردو سے وابستہ رہے، جون ۱۹۶۲ء تا جولائی ۱۹۶۸ء عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر رہے، اگست ۱۹۶۸ء تا اگست ۱۹۷۳ء علیگڑھ کے شعبہ لسانیات کے پروفیسر و صدر شعبہ رہے۔ نومبر ۱۹۷۳ء تا اگست ۱۹۷۸ء جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر رہے۔ اس کے بعد اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد اب یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے انھیں پروفیسر ایمے ریٹس کے عہدے پر فائز کیا ہے۔

اس خود نوشت سوانح عمری میں شائع ہونے والے مواد سے خدابخش لائبریری کا متفق ہونا ضروری نہیں، یہ مصنف کے اپنے تجزیے اور تجربے ہیں ——— ایسے مواد سے جو صریحاً کسی کو ناگوار ہو، نام حذف کر دیا گیا ہے پھر بھی اگر کوئی ایسا مواد راہ پا گیا ہو تو ادارہ کو اس میں شریک نہ سمجھا جائے۔

——— ادارہ

فہرست

ع

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

پہلا باب

خاندان ۔ وطن ۔ ولادت ۔ بچپن

وُرُودِ مسعود کی داستان کا آغاز ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء بروز منگل، فجر کی اذان کے وقت غُلام حُسین خاں کی حویلی سے (جو عُرفِ عام میں 'محل' کے نام سے مشہور تھی) شروع ہوتا ہے جہاں 'بڑے گھر' کی بیٹی فاطمہ بیگم نے اپنے چوتھے بچے اور دوسرے لڑکے کو جنم دیا۔ بچّے کے والد 'مظفّر حسین خاں' نے اُس کا نام مسعود تجویز کیا جس کے آگے مورثِ اعلیٰ کے نام 'حسین خاں'، کے اضافے کے بعد پورا نام 'مسعود حسین خاں'، قرار پایا۔

میرے والد مظفّر حسین خاں، چھٹی پیڑھی میں حسین خاں کی نسل سے تھے جو قائم گنج ضلع فرخ آباد (یوپی) میں اپنی درویش صفتی اور علمیّت کی وجہ سے 'مدّا خون'، (مدّآخون/آخوند= بڑے استاد) کے لقب سے مشہور تھے۔ وہ ۱۷۱۵ء کے لگ بھگ اپنے توام بھائی حُسن خاں کے ہمراہ صوبہ سرحد کے آزاد قبائلی علاقے تیراہ سے تلاشِ معاش میں قائم گنج آئے تھے۔ تیراہ، بنّوں کوہاٹ کے شمال میں آفریدی پٹھانوں کا علاقہ ہے، جن کی آبادیاں دُرّۂ خیبر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آفریدی قبیلے کا ذکر پہلی بار سکندرِ اعظم کے مورّخ ہیرودِڈَس نے 'اَپریدا' کے نام سے کیا ہے۔ اُس کے مطابق اس قبیلے نے سکندرِ اعظم کی فوجوں کو دُرّۂ خیبر سے گذرتے ہوئے سخت پریشان کیا تھا۔

قائم گنج کی نوآبادبستی میں آفریدی پٹھانوں کی آمد فرخ آباد کے نوابانِ بنگش کے بلاوے پر اٹھارویں صدی کے نصف اول میں ہوئی تھی۔ بنگش قبیلہ اُن سے قبل آکر گنگا کے کنارے

'ڈرانی ڈانگ' (پہاڑی) کے علاقے میں بس چکا تھا اور اس کا ایک من چلا نوجوان، محمد خاں بنگش، فرخ آباد کے نوابانِ بنگش خاندان کی داغ بیل ڈال چکا تھا۔ اسی نے سنہ ۱۷۱۳ میں اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج کا قصبہ آباد کیا اور اس کے ایک سال بعد ۱۷۱۴ میں فرخ سیر کے نام پر گنگا ہی کنارے بیس میل کے فاصلے پر فرخ آباد کو بسا کر اپنا صدر مقام بنایا۔ نووارد آفریدی پٹھان اپنے اپنے 'خیلوں'[1] کے نام پر قصبہ قائم گنج کے اردگرد محلّے بسا کر آباد ہو گئے مثلاً کلاں خیل، ٹکی خیل، مَوالخیل، شُشکل خیل وغیرہ۔ بعض محلّوں کے نام قدیم بستیوں کے نام پر رہے، ان میں سے بعض میں ہندو مسلمان مشترک طور پر اپنی اپنی حد بندیوں کے ساتھ بسے ہوئے ہیں، جیسے پتورہ، کُبیر پور، چلانکا، چلوکی وغیرہ۔ ہمارا آبائی مکان مَوالخیل میں ہے جب کہ ننھیال پتَورہ میں واقع ہے جو صرف چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ ددھیال کے مکان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ محلّے کے دوسرے مکانوں سے الگ تھلگ چاروں طرف باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ ابتدا میں ہمارے پردادا غلام حسین خاں عرف جھمّن خاں کا مکان موجودہ مکان سے تھوڑے فاصلے پر کھیتوں کے درمیان، شُشکل خیل میں واقع تھا۔ اس کی بنیاد کے آثار اب تک موجود ہیں۔ مَوالخیل کا مکان ہمارے پردادا نے دکنی کن ٹنجنٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے دوسرے وکیل بیٹے، فدا حسین خاں کی آمدنی سے ذاتی بھٹّا لگا کر لکھوری اینٹ کا (جسے قائم گنج میں 'گیا' اینٹ کہتے ہیں) ۱۹۰۰ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بارے میں خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ دورانِ تعمیر ایک دن انھوں نے نہایت غیض و غضب کے عالم میں مزدوروں اور معماروں کو سخت سُست کہا، اس وقت درویش کرم علی شاہ میاں، جن سے انھیں حد درجہ عقیدت تھی، وہاں موجود تھے۔ وہ نہایت خاموشی سے اس منظر کو دیکھتے رہے۔ جب جھمّن خاں کا غصّہ (جس کے لیے وہ سارے قائم گنج میں مشہور تھے) فرو ہو گیا تو انھوں نے انگلی کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا "جھمّن خاں اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا تعمیر کردہ نیا مکان آباد رہے تو تمہیں آج کی نازیبا حرکت کا کفّارہ دینا ہوگا اور وہ یہ

---

[1] "سرحدی پٹھانوں کی سیاسی اور معاشری تنظیم کی اکائی 'خیل' کہلاتی ہے" (یادوں کی دنیا) ان کے اوپر 'جرگہ' ہوتا ہے۔

ہے کہ تعمیر کا کام فوراً بند کر دو اور میرا رقعہ لے کر فلاں سادھو کے پاس متھرا چلے جاؤ۔ وہاں چالیس روز تک اپنے مٹھ میں وہ جو خدمت تم سے لے اسے خوش دلی کے ساتھ انجام دو!"
چنانچہ غلام حسین خاں نے اپنے مُرشد کی ہدایت پر عمل کیا، تعمیر کا کام بند ہو گیا اور وہ مختصر سے زادِ راہ کے ساتھ متھرا کے لیے چل پڑے۔ کرم علی شاہ میاں کے سُنّت دوست نے ان سے چالیس روز تک جاروب کشی کی خدمت لی۔ اس تزکیۂ نفس کے بعد وہ قائم گنج لوٹے اور تعمیرِ مکان کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

اُن کے اِس کفّارے کا "محل" کی آبادی پر کہاں تک اثر پڑا یہ محلِ نظر ہے، اس لئے کہ ۱۹۰۰ء تا حال یہ مکان صحیح معنوں میں کبھی بھی آباد نہیں رہا۔ البتہ شادی بیاہ کے موقعوں پر اہلِ خاندان جمع ہو جاتے اور یہ کچھ دن کے لیے کھُل جاتا۔ یا دادا اور والد دِق کے موذی مرض میں گرفتار ہو کر اپنی زندگی کے آخری دن بِتانے کے لئے یہاں آ گئے تھے، یا ہماری دادی بیوہ ہو جانے کے بعد ۱۹۰۷ء میں اپنے بچوں کی ٹولی لے کر چند سال تک اس میں مقیم رہیں اور پھر طاعون کی وبا کا شکار ہو گئیں۔

۲۸ر جنوری ۱۹۱۹ء کو میری پیدائش اسی گھر کے زنانے حصّے کی بائیں طرف والی کوٹھری میں ہوئی تھی۔

میری والدہ کے پاس کافی دودھ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے گھر کی دھوبن پَنچا کی جُردا (جورو) کا دودھ پینا پڑا۔ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا اثر میری شخصیت پر کیا پڑا (غالباً کچھ بھی نہیں) البتہ میری آمدنی پر یہ اثر ضرور پڑا کہ میرے برسرِ کار ہو جانے کے بعد ہمیشہ مجھ سے اپنا حق لیتی رہی اور مسلمان ماں کی روایت کے مطابق مجھے یہ دھمکی دیتی رہی کہ اگر میں اس کا حق نہیں دوں گا تو وہ مجھے دودھ نہیں بخشے گی۔ آج جو میں اپنے نواسوں اور نواسیوں کے دودھ کے لئے حفظانِ صحت کے جس انتظام اور اہتمام کو دیکھتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے عہدِ طفلی کو جیتے جاگتے کیسے پار کر لیا۔ میں نے تو دھوبن ہی کا دودھ پیا تھا۔ میرے منجھلے ماموں کو تو گدھیا (گدھی) کا دودھ پینا پڑا تھا! اُس وقت میرے والد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے۔ اِل۔ اِل۔ بی کرنے کے بعد ریاست حیدر آباد کے ضلع ورنگل میں محکمۂ عدالت میں مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز

تھے۔ ابھی ملازمت کو تین سال کی مدت نہیں گزری تھی کہ دِق کے خاندانی مرض نے گھیر لیا۔ اُن کی زندگی کے آخری سال مرض الموت میں گرفتار اسی مکان میں گزرے جہاں انھوں نے اپریل ۱۹۲۱ء میں عمر ۲۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس وقت میری عمر دو سال دو مہینے کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ میں اکثر دبے پاؤں اُن کے کمرے میں پہنچ جاتا اور چارپائی کے پاس پڑی ہوئی جھاڑو اٹھا کر زور سے مارتا۔ اُنھیں سراسیمہ دیکھ کر مجھے لطف آتا۔ وہ چھوت کی وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ کوئی بچّہ ان کی چارپائی کے پاس آئے اس لیئے زور سے چلّا کر پکارتے "ارے کوئی ہے۔ دیکھو یہ مسعود نے پھر وہی حرکت کی"۔ ان کی شخصیت اور اعادات کے بارے میں اہلِ خاندان سے بہت سی کہانیاں سنتا رہتا تھا لیکن حافظے پر زور دینے کے باوجود میرے ذہن میں ان کی کوئی تصویر نہیں بنتی۔ یہ بھی سنا تھا کہ وہ بہت کم سخن تھے۔ ان میں ایک خاص قسم کی متانت تھی جس سے ان کے تمام چھوٹے بھائی خوفزدہ رہتے تھے۔ چھوٹے بھائیوں سے جو انھیں "بھائی جان" کہتے تھے وہ عام طور پر رقعوں کے ذریعے بات کرتے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اُن میں تحفظِ زن کا افغانی جذبہ شدّت سے موجود تھا اور ان کی ممانعت تھی کہ والدہ کسی قسم کا باریک کپڑا جس سے بدن جھلکے، نہ پہنیں، بلکہ اس بات پر ایک بار اُنھیں مارا بھی تھا، جس پر میرے نانا "جانِ عالم خاں" اپنی رئیسِ اعظمی کے زعم میں مکان پر چڑھ کر آئے تھے۔ اس پر میرے والد نے بھی سخت روّیہ اختیار کیا۔ بہرحال معاملہ آگے نہ بڑھا اور عزیزوں کی مداخلت سے رفع دفع ہو گیا۔

والد کے انتقال کے بعد ہماری والدہ بچّوں کو لے کر اپنے میکے پتورہ چلی آئیں۔ میری ننہال ایک بھرا پُرا خاندان تھا۔ میری نانی صاحبہ اپنی بڑی بیٹی کو بہت چاہتی تھیں لیکن وہ بھی بیوگی کے صدمے کا کچھ علاج نہ کر سکیں۔ والدہ دن بھر روتی رہتیں یہ تو دیکھنے والوں کا بیان ہے، دل پر کیا گزرتی ہوگی اس کا علم کسی کو نہیں۔ بالآخر رو رو کر انھوں نے خود کو اس درجہ ہلکان کیا کہ داغ میں رسولی بن گئی۔ سال بھر تک میری نانی صاحبہ انھیں فتح گڑھ اور لکھنؤ ہر جگہ علاج کی خاطر لے گئیں لیکن ہونی اَن ہونی نہ ہو سکی اور بالآخر اپریل ۱۹۲۳ء کو والد کے انتقال کے تین سال بعد چار چھوٹے چھوٹے بچّوں کو بلکتا چھوڑ کر وہ بھی راہیٔ ملکِ عدم ہوئیں۔ میں اس وقت ۵ برس دو مہینے کا تھا۔ اُن کے کل پانچ اولادیں ہوئیں: ۱۔ امتیاز حسین خاں ۲۔ خدیجہ بیگم

۳۔ رفیعہ بیگم۔ ۴۔ مسعود حسین خاں اور ۵۔ شاہد حسین خاں۔ رقیہؔ کا انتقال اُن کے سامنے بچپن میں ہوگیا تھا۔ شاہد والد کے انتقال کے بعد پیدا ہوا اور والدہ کے انتقال سے کچھ ہی عرصے کے بعد ڈیڑھ سال کا ہوکر، اپنی انّا کی ہڑک میں، جو اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی، اور جسے وہ اپنی ماں سمجھتا تھا، رو تاڑلاتا گذر گیا۔ میرے حافظے میں اس کی موت کا منظر محفوظ رہ گیا ہے۔ ننہال کے زنانے میں چھجّے کے نیچے ایک چارپائی پر اس کی ننھّی سی لاش رکھی ہوئی تھی اور خاندان کی عورتیں اس کے نزدیک بَین و بکا کر رہی تھیں۔ بار بار میری والدہ فاطمہ کا نام لیا جارہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر میں ایسا مبہوت کھڑا ہوا تھا گویا میں خود مر گیا ہوں!

اس طرح مظفرؔ حسین خاں اور فاطمہ بیگم کی اولاد کا سلسلہ تین بچّوں سے چلا۔ ۱۔ اِمتیاز حسین خاں ۲۔ خدیجہ بیگم اور ۳۔ مسعود حسین خاں۔ امتیاز حسین خاں جنھیں میں قائم گنج کی زبان میں "ادّا"[1] کہتا تھا عثمانیہ یونیورسٹی میں پہلے صدرِ شعبۂ کامرس اور بعد کو پرنسپل سکندر آباد کالج کے عہدے تک پہنچے۔ ملازمت ہی کے دوران مارچ ۱۹۶۲ء میں حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال کیا۔ میری اور ان کی عمر کے درمیان تقریبًا، سال کا فرق تھا۔ اس لئے میرے اور ان کے مابین بڑے اور چھوٹے بھائی کی دوری کا رشتہ قائم رہا، دوستی کا نہیں۔ وہ بڑی محبّت اور مروّت کے انسان تھے۔

میری بیوی کا خیال ہے کہ اُن سے زیادہ نیک انسان ہمارے خاندان میں کوئی دوسرا نہیں ہوا ہے۔ اُن کے بارے میں میرے جذبات کا اندازہ اس قطعے سے کیا جاسکتا ہے جو میں نے اُن کے لوحِ مزار پر کندہ کرایا ہے۔

وہ لختِ دل تھا مُظفرؔ[1] کا فاطمہؔ[2] کا لال
مُحبِّ ذاکرؔ[3] و محبوبِ یوسفؔ[4] و محمودؔ[5]
جہانِ مہر و محبّت کا اک حسین خیال
دلِ خدیجہؔ[6] تھا وہ اور دیدۂ مسعودؔ[7]

---

[1] یہ لفظ پنجابی زبان میں بڑے بھائی اور باپ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور قائم گنج کی زبان میں اسی علاقے کے پٹھانوں کے ساتھ آیا تھا۔

[1] مظفر حسین خاں (والد) [2] فاطمہ بیگم (والدہ) [3] ذاکر حسین خاں (چچا) [4] یوسف حسین خاں (چچا) [5] محمود حسین خاں (چچا) [6] خدیجہ بیگم (بہن) [7] مسعود حسین خاں (بھائی)

خدیجہ بیگم میری بڑی بہن ہیں جو حیات ہیں اور فی الحال اپنی چھوٹی صاحبزادی کے ساتھ علی گڑھ میں مقیم ہیں۔

والدیا والدہ کا چہرہ مہرہ میرے حافظے میں بالکل محفوظ نہیں رہا۔ صرف اس قدر یاد ہے کہ لکھنؤ میں وہ جس محلے میں علاج کے سلسلے میں مقیم تھیں وہاں بندروں کی کثرت تھی جو ان کی تشویش اور میری تشویق کا باعث رہتے۔ دماغ کی رسولی کا اثر اُن کی ایک آنکھ پر بھی پڑا تھا جو انگارے کی طرح سرخ رہتی تھی۔ ننہال میں بچپن گذرنے کی وجہ سے اُن کا تذکرہ میں بار بار سُنتا، اس لئے اکثر تنہائیوں میں ان کو اپنے تصوّر میں لانے کی کوشش کرتا اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو بے تحاشا میرے آنسو نکل پڑتے اور یتیمی کے غم کو میں شدّت کے ساتھ محسوس کرتا۔

مورثِ اعلیٰ حسین خاں (مدآخون) نے پٹھانوں کی کئی نسلوں کی تربیت کی تھی۔ ان کا انتقال سو برس سے اوپر ہوا تھا اس لیے آخر میں ایک صوفی باصفا کی حیثیت سے بہت سے پٹھانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کرلی تھی۔ ان کے بیٹے احمد حسین خاں اور پوتے محمد حسین خاں نے قلم پر شمشیر کو ترجیح دی اور مختلف رجواڑوں میں فوجی ملازمتیں اختیار کیں۔ اِن دونوں کی حیات کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں۔ پَردادا غلام حسین خاں (عرف جھمّن خاں) نے ریاست حیدرآباد میں فوجی ملازمت اختیار کی۔ وہ افسرالملک کے ساتھیوں میں تھے۔ خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد، ساتھیوں کے اصرار کے باوجود، انھوں نے اپنے وطن قائم گنج کی سیدھ لی۔ تقریباً یہی وطیرہ قائم گنج کے اُن تمام پٹھان گھرانوں کا رہا ہے جو فوجی ملازمت کے سلسلے میں خود باہر رہتے اور بال بچّوں کو قائم گنج میں رکھتے، جہاں ہر گھرانے کی کچھ سکنی و صحرائی جائیداد ہوتی تھی۔ آموں کے موسم میں طویل مدت کی رخصت پر وطن آتے۔ اپنی طویل غیر حاضری کی وجہ سے وہ اپنے بال بچّوں کی تعلیم و تربیت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے پاتے تھے۔ یہی صورتِ حال ہمارے دادا فدا حسین خاں کی تھی جو جھمّن خاں کے دوسرے بیٹے تھے۔ اُن کے بڑے بھائی عطا حسین خاں نے تو والد کے نقشِ قدم پر چل کر ریاست حیدرآباد میں فوجی ملازمت اختیار کی اور رسالدار کے عہدے تک پہنچے لیکن چھوٹا بھائی جو جسمانی اعتبار سے بھی کمزور تھا قائم گنج ہی میں رہ کر مڈل اسکول کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس سے فارغ ہو کر کچھ مرادآبادی سامان کے ساتھ وہ ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد

پہنچے جہاں خاندان اور وطن کے کئی اشخاص بسلسلۂ ملازمت پہلے سے موجود تھے۔ تجارت کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے پڑوس کے ایک وکیل صاحب کی توجہ سے وکالت کے امتحان کی تیاری شروع کردی۔ چونکہ اِن امتحانات کا ذریعۂ امتحان اردو تھی اور اس پر اُنھیں خاصا عبور تھا، اس لئے امتیاز کے ساتھ وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد ترقی کے زینے کھُلتے گئے۔ کچھ عرصہ حیدرآباد میں وکالت کرنے کے بعد وہ اورنگ آباد منتقل ہو گئے۔ جب وہاں اپنی ذہانت کا سکّہ جمالیا تو ہائی کورٹ میں وکالت کرنے کی غرض سے پھر حیدرآباد مراجعت کی۔ یہاں اُن کی قانونی ذہانت کے جوہر اور کھلے اور بہت جلد ان کا شمار چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔ پیشہ ورانہ کامیابی کے ساتھ ہُن برسنے لگا۔ اُن کا انتقال ۱۹۰۷ء میں صرف ۳۹ برس کی عمر میں ہو گیا اور انھوں نے صرف سولہ سال وکالت کی، لیکن اس قدر کمایا کہ حیدرآباد کے بیگم بازار میں ایک شاندار دو منزلہ تعمیر کرایا جس کے بالائی حصّے میں اہل خاندان کی رہائش تھی اور نچلی منزل میں اُن کا ذاتی پریس تھا جس میں اُنکی تصانیف، قانون کی کُتب اور رسالہ "آئینِ دکن" طبع ہوتا۔ حیدرآباد پہنچ کر وہ قائم گنج کی جانب سے غافل نہیں رہے جہاں ان کے والد مقیم تھے۔ دو گاؤں خریدے اور اپنے والد کو آمادہ کیا کہ وہ اپنی نگرانی میں پختہ حویلی تعمیر کرائیں، جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس حویلی کا زنانہ حصّہ تو قائم گنج کے دیگر متموّل گھرانوں جیسا ہے یعنی ایک کوٹھا ایک وسیع دالان جس کے کناروں پر دو کوٹھریاں یا کمرے ہیں سامنے اونچی کرُسی کا چوڑا سا چبوترہ اور اس کے نیچے بڑا سا آنگن۔ البتہ مردانہ حصّہ قائم گنج کی عام حویلیوں سے مختلف ہے اور اس میں حیدرآبادی فنِ تعمیر کا ٹھاٹھ آگیا ہے جس کی وجہ سے عام لوگوں نے اسے "چھمّن خاں کا محل" یا صرف "محل" کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔

فدا حسین خاں کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہو گیا۔ اُس وقت تک اُن کے چھ بیٹے پیدا ہو چکے تھے، ساتویں محمود حسین خاں انتقال کے کچھ عرصے بعد پیدا ہوئے۔ میرے والد مظفر حسین خاں سب سے بڑے تھے۔ اُن کا سنہ پیدائش ۱۸۹۳ء ہے۔ تیسرے بیٹے ذاکر حسین خاں اور پانچویں یوسف حسین خاں سے سب متعارف ہیں۔ دادا کے انتقال کے بعد ہماری دادی نازنین بیگم (عرف دجّو) حیدرآباد سے قائم گنج آئیں تو ان کے ساتھ چھوٹے بچوں کی ایک کھیپ سی تھی۔

محمود حسین خاں کو چھوڑ کر، جو بہت چھوٹے تھے، باقی پانچوں بھائی (پچھلے بھائی جعفر حسین خاں کا بچپن میں انتقال ہو چکا تھا) اِٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کر دیئے گئے جہاں سے فارغ ہو کر میرے والد علی گڑھ کالج میں ایف۔اے، بی۔اے اور ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ ان کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے بھائی عابد حسین خاں، زاہد حسین خاں اور ذاکر حسین خاں بھی پہنچ گئے۔ یوسف حسین خاں اور محمود حسین خاں نے کچھ عرصے علی گڑھ گورنمنٹ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں نئی قائم شدہ جامعہ ملیۂ اسلامیہ میں داخلہ لیا۔ والد نے علی گڑھ سے تمام امتحانات امتیازات کے ساتھ پاس کئے اور اس کے بعد حیدر آباد جا کر ریاست کے محکمۂ عدالت میں مجسٹریٹ ہو گئے۔

میری والدہ فاطمہ بیگم، جانِ عالم خاں (عرف ننھے میاں) اور امنوی بیگم (عرف 'بی') کی سب سے بڑی اولاد تھیں۔ جانِ عالم خاں اس زمانے میں تموّل اور جائیداد کے اعتبار سے قائم گنج کے رئیسِ اعظم کہلائے جاتے تھے اور ان کا مکان عرفِ عام میں 'بڑا گھر' مشہور تھا۔ ننہال کی خوشحالی کے اصل بانی میرے نانا کے چچا حاجی فضل امام خاں تھے جنھوں نے نہ صرف صحرائی جائیداد پیدا کی بلکہ کپڑے کی تھوک تجارت اور نیل کی کوٹھیوں سے اس قدر کمایا کہ پٹھانوں میں ممتاز حیثیت اختیار کر لی۔ وہ لاولد تھے، اس لیے انھوں نے اپنے بھتیجے کو سب کچھ سونپ دیا۔ جانِ عالم خاں انھیں کی جائیداد اور کمائی کے بل بوتے پر ساری عمر جانِ عالم پیا کا کردار ادا کرتے رہے اور رامش و رنگ سے زیادہ سروکار رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ سر سید احمد خاں نے جب علی گڑھ میں اسکول اور کالج قائم کیا تو ان کے گماشتے مسلمان زمینداروں کے نوجوانوں کی تلاش میں قائم گنج بھی پہنچے اور حاجی فضل امام سے جانِ عالم خاں کے بارے میں بات چیت کی لیکن حاجی صاحب کسی قیمت پر اپنے بھتیجے کو فرنگی طرزِ تعلیم دلانے پر تیار نہیں ہوئے۔ قائم گنج کے ماحول میں ان کی اسلامی تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔ اس لیے ان کی لیاقت اُردو کے مُنشی سے آگے نہ بڑھ سکی۔

میری ننہال نہ صرف تموّل بلکہ مشترکہ خاندان کی آبادی کے لحاظ سے بھی 'بڑا گھر' تھا۔ میرے نانا دو بھائیوں میں تنہا اولاد تھے لیکن خود ان کے نصف درجن سے زائد بچے پیدا ہوئے جن میں سے چار بھائی اور دو بہنوں کی نسل کا سلسلہ خوب چلا۔ میری والدہ فاطمہ بیگم سب سے

بڑی اولاد تھیں۔ دوسری بہن راحت بیگم عرصے کے بعد میرے چچا یوسف حسین خاں سے منسوب ہوئیں۔ ماموں سُلطان عالم خاں نے خاندان کی معاشی حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یو۔پی کی سیاست میں خوب نام کمایا اور سمپورنانند کی کانگریسی وزارت میں نائب وزیر کے عہدے تک عروج حاصل کیا۔ چوں کہ وہ کچھ عرصے تک مسلم لیگ کے بھی سرگرم رکن رہے تھے، اس لئے بعد کے ہر الیکشن میں ان پر اس کی فردِ جرم لگائی جاتی اور بالآخر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ میرے دوسرے ماموں، قدوس عالم خاں (جو میرے خُسر بنے) جائیداد کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی انتظامی صلاحیت سے جائیداد کی آمدنی دونی کر دی۔ باغات لگائے اور ایک بہت بڑا فارم بنالیا۔ دونوں بھائیوں میں عشق سا تھا اس لیے کہ میں نے جائیداد یا آمدنی کے حسابات کے سلسلے میں دونوں میں کبھی من و تو کا جھگڑا نہیں دیکھا۔ سُلطان عالم خاں کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ اُن کے پاس مالیات کا ماہر اور فراہم کنندہ ایک چھوٹا بھائی ہر وقت اُن کی پشت پر موجود رہتا۔ میرے تیسرے ماموں، ناکام وکیل اور کامیاب شاعر، غلام ربّانی تاباںؔ ہیں۔ جن کے اور میرے درمیان بہت سی ذہنی قدریں مشترک رہی ہیں۔ وہ خاندان کے پہلے شاعر ہیں اور میں دوسرا۔ ہم دونوں کے علاوہ خاندان کے کسی فرد کو پہلے یا بعد کو توفیقِ شعر نہیں ہوئی، حالانکہ ذاکر صاحب اور یوسف صاحب دونوں کا مذاقِ شعری نہایت لطیف تھا۔ یوسف صاحب نے اقبالؔ اور غالبؔ کے نقاد کی حیثیت سے نام بھی پیدا کیا۔ چوتھے ماموں خورشید عالم خاں، جو ڈاکٹر ذاکر حسین کے داماد بھی ہیں، پارلیمنٹ کے رکن اور مرکزی سرکار کے مختلف محکموں کے ریاستی وزیر کی حیثیت سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی تخصیص یہ ہے کہ وہ میرے ہم عمر ہیں اور بچپن کے ساتھی۔ ان کا مزید تذکرہ اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے وقت کروں گا۔

والدہ کے انتقال کے بعد مجھے بڑی ممانی (بیگم سلطان عالم خاں) نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ وہ بڑی نیک بی بی تھیں۔ ان کا تعلق رائے پور کے ایک ممتاز خٹک پٹھانوں کے خاندان سے تھا۔ میں ان کے ساتھ اکثر ڈولی میں بیٹھ کر اُن کے میکے رائے پور جاتا۔ اُن کی اور میری نانی میں ساس اور بہو کی روایت کے مطابق، اکثر چل جاتی۔ مجھے اس وقت بڑی تکلیف ہوتی جب نانی صاحبہ حقارت کے لہجے میں انھیں 'خٹکنی' کہہ کر پکارتیں۔ گویا خٹک کوئی نیچ ذات ہے۔

ہمارے علاقے میں ایک پست ذات کا نام کھٹک تھا۔ بچپن میں، مَیں سمجھتا تھا کہ یہ اُن کا سلسلہ اس ذات سے ملا رہی ہیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ خٹک پٹھان نسلی اعتبار سے آفریدی پٹھانوں سے کم نہیں۔ لیکن پٹھانوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کا نسلی تفاخر ہے جو صرف دوسری ذاتوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ جس کی زد میں پٹھانوں کے دوسرے قبائل تک آجاتے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ میرے منجھلے ماموں، قدوس عالم خاں کی شادی جب علی گڑھ کے شیروانی پٹھانوں میں ہوئی تو قائم گنج میں اس پر بھی بڑی چہ می گوئیاں رہی تھیں۔

پتورہ کے 'بڑے گھر' کی سب سے عظیم شخصیت نانی صاحبہ یا 'بی' تھیں۔ میری ابتدائی زندگی پر اُن کا گہرا اثر رہا ہے۔ وہ ایک عجیب وغریب شخصیت کی مالک تھیں، ولایتی رنگ روپ، گوری چٹّی، کرنجی آنکھیں اور گراں ڈیل جس محفل میں بیٹھتیں، چھا جاتیں۔ حقّہ اور پان کی شوقین، آخر عمر میں جب منہ پوپلا ہوگیا تھا تو 'پَن کُٹّی' ساتھ چلتی۔ حُقّہ کا ہر وقت تازہ رہنا ضروری تھا۔ وہ پڑھی لکھی تو معمولی تھیں لیکن علمِ مجلسی سے اچھی طرح واقف تھیں۔ مَردوں تک کے کان کاٹتی تھیں۔ ڈاکٹر امیر وا (ڈاکٹر محمد امیر خاں) کا بھائی کہتے منہ سوکھتا تھا اور وہ اپنے سامنے بحیثیت طبیب کے انھیں ہیچ پوچ بھتیں۔ اُن کے تجویز کردہ ہر نسخے کو 'چھے دُت'، کہہ کر رد کر دیتیں۔ طبّی معلومات رکھنے کے علاوہ چھوٹی موٹی سرجن بھی تھیں۔ دور دور دیہات سے لوگ ٹوٹے ہوئے ہاتھ پیر جُڑوانے پتورہ آتے۔ آج بھی قائم گنج میں اُن کی اس مہارت کے معترف مل جائیں گے جنھوں نے اُن کے گھامڑ طریقوں کے ضرب و کرب جھیل کر اپنے اُترے ہوئے کولھے یا بازو ٹھیک کرائے ہیں۔

اس قسم کے علاج کے لئے جب کوئی دیہاتی پھنستا تو گھر کے بچوں کے لیے جشن کا سا سماں بندھ جاتا۔ پہلے اس کو فرش پر لٹایا جاتا پھر گھر کے ملازمین کی جس قدر کمک مل سکتی تھی وہ حاصل کر کے اس کو گانٹھ لیا جاتا، اِس طرح کہ ہل ڈُل بالکل نہ پائے۔ پھر ڈنڈا لے کر نانی صاحبہ آتیں۔ حکم ہوتا کہ مُنہ پر رومال ڈال، کہ پردے کا التزام لازم ہے۔ اس طرح وہ بیچارہ جلّاد کی شقاوت کا نظّارہ تک نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد عضو کی رعایت سے ڈنڈے کا سہارا لے کر ہلکا یا بھاری پاؤں رکھا جاتا۔ اِس دوران مظلوم درد سے بے قرار ہو کر چیختا تو ڈانٹ پڑتی اور پاؤں کا وزن بڑھا دیا جاتا۔ وہ جس قدر بلبلاتا اور 'دُیا رام مر گیا' کی آواز بلند کرتا اسی کے عضو کو کچلنے کا عمل تیز تر کر دیا جاتا

غرض اسی دھما چوکڑی میں کہیں ہڈیوں سے چٹ یا کھٹ آواز آتی، اعلان کیا جاتا کہ ہڈی بیٹھ گئی۔ گرفت ڈھیلی کر دی جائے اور دباؤ بھی۔ مریض اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد اَدھ مُرا سا ہو جاتا۔ پھر اسے مَلنے کی دوائیں تجویز کی جاتیں۔ وہ روتا ہوا جاتا لیکن ہفتہ عشرہ کے بعد دعائیں دیتا، ہنستا ہوا آتا۔

انھوں نے اپنے دو معرکۃ الآرا علاج میرے اور اپنی پوتی نجمہ پر بھی (جو بعد کو میری دلہن بنی) بچپن میں کامیابی سے آزمائے تھے۔ میری عمر آٹھ برس کی ہوگی کہ مجھے گنڈ مالا (کنٹھ مالا، خنازیر) کا مرض ہو گیا تھا۔ مختلف قسم کے علاج کیے لیکن گلے کی گانٹھیں مکمل طور پر ختم نہ ہوئیں۔ ایک دن بولیں مسعودا کا (قائم گنج میں غالباً پشتو کے زیر اثر ناموں کے آگے ایک الف کا اضافہ کر دیا جاتا تھا) علاج اب میں کروں گی۔ چنانچہ اپنے بنجر پر بسے ہوئے کنجڑوں کو حکم دیا گیا کہ جہاں سے بھی ہو کالا سانپ مار کر فراہم کریں۔ جب وہ آگیا تو اسے کڑوے تیل میں اس قدر رُبالا گیا کہ اس کا گھُلوا ہو گیا۔ اس کے بعد اس کو کپڑے میں چھان لیا گیا۔ یہ تھا کالے سانپ کا تیل۔ اب میرے گلے کے دونوں جانب کی گلٹیوں پر روزانہ اس کی مالش کی جاتی ساتھ میں شکر آمیز کسی چیز کے بیج کے لڈو بنا کر کھلائے جاتے۔ لیجئے صاحب! جو کام مہینوں میں نہیں ہوا تھا وہ ہفتوں میں ہو گیا اور اس کے بعد مجھے یہ عارضہ کبھی نہیں ہوا۔

اسی طرح نجمہ جو کہ تقریباً اندھی پیدا ہوئی تھیں اور جن کے بارے میں ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ یہ لڑکی اندھی رہے گی اس لئے کہ اس کی پتلی نہیں بنی ہے، جب ہر طرف سے مایوسی ہو گئی تو الااللہ کہہ کر اس کو صحتیاب کرنے کا بیڑا خود اٹھا لیا۔ نانی صاحبہ کو طب کے مجربات کے علاوہ ٹوٹکے بھی بہت یاد تھے جو انھوں نے درویشوں، فقیروں اور جوگیوں سے سُن رکھے تھے۔ چنانچہ حکم دیا گیا بچّی کے لیے روز آدھ پاؤ بکری کے گوشت کے پارچے لائے جائیں۔ یہ پارچے آنکھوں کے اوپر ایک مخصوص مدّت کے لیے باندھ دیئے جاتے۔ رفتہ رفتہ سُرخی غائب ہونے لگی اور چند ہفتوں کے اندر آنکھوں میں روشنی آگئی۔ ایسی کہ آج ۵۸ سال کی عمر میں بھی قائم ہے!

بی، بڑی اچھی داستان گو بھی تھیں، ایسی کہ گھر کے سارے بچے اُن کے افسانوں

کو بھی حقیقت سمجھتے۔ مثلاً گورکھپور اور اس کے نواح کا (جہاں والد کے ساتھ ان کا بچپن گزرا تھا) ذکر کرتے ہوئے کہتیں: گھنے گھنے جنگل ہیں، جس میں سانپ ہیں کہ قدم قدم پر کلبلاتے پھر رہے ہیں۔ کہار ان کی ڈولی لیے جنگل سے گزر رہے ہیں کہ اتنے میں دیکھا سیتا پھل ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ کہار اور ملازم دوڑ کر اٹھاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو کنڈلی مارے ہوئے سانپ ہیں! اس کے بعد ہم لوگوں کو ہر سیتا پھل ایک لپٹا ہوا سانپ نظر آتا تھا۔

میرے اُن کے درمیان ایک خصوصی ربط تھا۔ کہتی تھیں مجھے مسعود اکو دیکھ کر اپنی مری ہوئی بیٹی فتّو (فاطمہ) یاد آجاتی ہے۔ وہ اکثر مجھے اپنی مری ہوئی بیٹی کی نشانی کہتیں۔ اس پر ہم دونوں کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور میں خیال کی دنیا میں اپنی ماں کو ڈھونڈھنے لگتا جن کی کوئی نشانی میرے حافظے میں محفوظ نہیں تھی۔ چنانچہ اس جذبہ کے تحت مجھے گھر میں کئی رعاتیں ملی ہوئی تھیں مثلاً دن بھر مٹی کی ہانڈی میں کئی بھینسوں کا دودھ ہلکی آنچ پر اوٹتا رہتا تھا، سہ پہر تک اس پر ملائی کی ایک سُرخ روٹی سی بن جاتی۔ ملائی میری کمزوری اُس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے۔ مجال نہیں تھی کہ انکی اجازت کے بغیر اس کا ایک ٹکڑا بھی کسی کو دیا جائے۔ وہ اسے بلو کر پہلے مکھّن بناتیں اور پھر اُرد کی دال اور جاڑوں میں کھچڑی کے لیۓ اصلی گھی نکال لیتی تھیں۔ لیکن جب کبھی یہ اُن کی 'مری بیٹی' کی نشانی' بالائی پر بالادستی کر بیٹھتا تو اُسے کچھ نہیں کہتیں۔ "چلو اُسے کھا لینے دو۔" بس یہ منہ سے نکلتا۔

ننہال میں میرے ہاتھ میں پیسہ بہت کم آتا تھا۔ نانا صاحب بیٹوں اور پوتوں کو تو اپنی داد و دہش کا درخور سمجھتے تھے، لیکن نواسے اور لڑکیاں ان کی مرحمت کے دائرے میں بہت کم آتے۔ مجھے کبھی کچھ ملتا تھا تو بی بی سے۔ یہ خاص طور پر اس وقت جب ان کا پیسوں کا صندوقچہ کھلا ہو اور میں کھڑا ٹھنک رہا ہوں۔ ننہال میں کھانے پینے کی چیزوں میں کوئی امتیاز اور تخصیص نہیں کی جاتی تھی اور چونکہ ان پر اختیار نانی صاحبہ کا ہوتا یا بڑی ممانی صاحبہ کا، مجھے دونوں کی ہمدردی حاصل تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں دودھ، ملائی، گھر کا نکلا ہوا تازہ مکھّن، گھی دہی اور عمدہ گوشت خوب کھایا۔ باغات سے موسم کے پھلوں کی جنس، آجاتی، تالابوں سے مچھلیاں اور سنگھاڑے غرضیکہ ایک زمیندار گھرانے کے اللّے تللّے تھے۔ تعطیلات میں جب

میں دہلی سے گھر آتا تو مہینے دو مہینے کی پُرخوری سے صحت بن جاتی اور چہرے پر سُرخی دوڑ جاتی، اس کے بعد سال کے باقی ۹، ۱۰ مہینے کی کم خوری انھیں زائل کرنے کے لیے کافی تھی، اِس طرح کہ داد وستد کا حساب برابر ہو جاتا۔

بی، عبادت گزار تھیں۔ ایک چوکی پران کی جانماز بچھی رہتی جس پر پنج وقتہ پابندی سے ادا کرتیں لیکن انھوں نے تمام اسلامی شعائر و فرائض کو اپنی سہولت کے مطابق سہل بنا لیا تھا، مثلاً نماز پڑھتے وقت اگر وہ دیکھتیں (اور نماز میں وہ دائیں بائیں دیکھتی ضرور رہتیں) کہ کوئی ملازمہ اُن کی مرضی کے خلاف کام کر رہی ہے تو بِلا تکلّف نیّت توڑ کر اس پر لام کاف شروع کر دیتیں۔ اِس سے فارغ ہونے کے بعد پھر اطمینان سے نیّت باندھ لیتیں۔

ناناصاحب نے آخر عمر تک اپنے اوپر اس قسم کی کوئی مذہبی پابندی عائد نہیں کی۔ غالب کی طرح وہ روزہ کو روزی بنا لیتے تھے۔ غالب کو اپنی بیوی سے یہ گلہ رہتا تھا کہ وہ ہر وقت گھر کو فتح پوری کی مسجد بنائے رکھتی ہیں، ناناصاحب کو اپنی بیوی سے "ٹکریں" لگاتے رہنے کی شکایت تھی۔ دونوں رندِ شاہد باز تھے!

اِس ماحول میں میری ابتدائی تربیت ہوئی تھی۔ مذہب کی جانب میرا روّیہ اسی لیے "پر طبیعت اِدھر نہیں جاتی" کا رہا۔ اپنے مسلمان ہونے پر فخر رہا لیکن اسلامی شعائر کی پابندی کو غیر ضروری جانا۔ جنسی آزاد خیالی کی بنیاد بھی اسی ماحول میں پڑی جہاں بزرگ اپنی جنسی فتوحات کا تذکرہ بے دریغ کرتے تھے اور ایسے ایسے لفظ اور فقرے فحشیات کے طور پر استعمال کرتے تھے جن سے فیلن اور سید احمد دہلوی جیسے فرہنگ نویس تک شرما جائیں۔ میرا دامن جو فحشیات سے بچا رہا وہ صرف اس لیے کہ میری ددھیال کی روایات میری ننہال کی روایتوں پر غالب رہیں! جنس کی جانب سے میں خیالات میں آزاد رہا لیکن عملی طور پر جھینپو ہونے کی وجہ سے مَس و مَساس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پیرس کے نگار خانے میں یہ اعتراف نہ کرتا ؎

خیالِ دامنِ اُلفت کہاں، کہاں مسعود
وہ نارسا ہی رہا، اور شرمسار رہا (پیرس)

میری ننہال تین پختہ حویلیوں پر مشتمل تھی۔ زنانہ مکان، جو سب سے قدیم تھا، سنہ ستاون کے ہنگامے میں اسے گوروں کے ساتھ مل کر گرمیوں نے جلادیا تھا، جس کے جلنے کے نشانات اس کے زینے کی کڑیوں پر اس وقت تک موجود تھے۔ گھر والے بھاگ کر رشتہ داری میں تلہر یا کے گاؤں میں چلے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ساری نقدی گھر کے کنوئیں میں ڈال گئے تھے جو واپسی پر انھیں مل گئی۔ گلی کے دوسری طرف نیا مکان تھا، یہاں مردانی نشست رہتی۔ دونوں مکانوں کو ایک پل کے ذریعے جوڑ دیا گیا تھا۔ زنانے مکان سے متصل کسی اور کا کچا گھر تھا اور اس کے بعد پھر لکھوری اینٹ کی بنی ہوئی پختہ کوٹھی، جہاں بوڑھے ابا حاجی فضل امام خاں کی نشست تھی۔ میں نے بڑھاپے میں انھیں دیکھا تھا، سُرخ و سفید چہرہ، بھک سفید داڑھی، کاندھے پر رومال اور ہاتھ میں ملاکا کین کا موٹا سا بید۔ شام کا کھانا وہ پابندی کے ساتھ زنانے گھر میں آکر مغرب سے پہلے کھاتے تھے۔ ان کے ہم دسترخوان ہونے کا شرف صرف مجھے اور خورشید کو حاصل تھا۔ اور ہماری لاگ صرف اُن کی کھیر تھی جو سیر بھر دودھ میں تھوڑے سے چاول ڈال کر گھنٹوں پکتی رہتی تھی اس طرح کہ بالکل ربڑی بن جاتی تھی۔ وہ کھاتے وقت سُڑ سُڑ کرتے جاتے تھے جس سے ہمارا جی گھبراتا تھا۔ ہم دونوں بلیوں کی سی کھیر پر تاک لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ کھیر وہ اپنی انگشتِ شہادت سے کھاتے تھے اور حسب منشاء استعمال میں لانے کے بعد مٹی کا طباق ہم دونوں کی جانب بے نیازی کی شان سے بڑھا دیتے تھے۔ ابھی وہ ہاتھ دھونے سے فراغت حاصل نہیں کر پاتے کہ ہم چھینا جھپٹی کر کے باقی ماندہ کھیر چٹ کر جاتے۔ اس قدر سوندھی اور مزیدار کھیر میں نے اپنی عمر میں پھر کبھی نہیں کھائی۔

میرا زیادہ وقت زنانے میں گذرتا، یہاں بہت سی ماموں زاد بہنیں تھیں۔ ہر وقت ایک ہنگامہ سا رہتا۔ اس میں ماماؤں اور ملازماؤں کے بچے بھی شامل ہو جاتے، جن کی تعداد ہم لوگوں سے بھی زیادہ تھی۔ اَشرا کی ماں (اشرف کی ماں) ہم سب کے لیے بہت زیادہ اہمیت کی مالک تھی۔ وہ بڑی باکمال باورچن تھی اور نانی صاحبہ کا ترکی بہ ترکی جواب۔ شاید ہی کوئی دن جاتا ہو جب دونوں میں نوک جھونک نہ ہوتی ہو۔ بی کی گالی گفتاری کے باوجود یہ ناممکن تھا کہ وہ بڑے گھر کی ملازمت چھوڑ دے۔ کبھی بیماری کی وجہ سے یا لڑ کر غصے میں گھر بیٹھ جاتی تو نانی صاحبہ

کو اس دن کھانا اچھا نہیں لگتا۔ کہتی تھیں کہ اَشرا کی ماں کے ہاتھ کی بات ہی اور ہے۔ وہ خود بھی کھانا بہت اچھا پکاتی تھیں اور انھیں اچھے کھانے کی پرکھ بھی خوب تھی۔ دونوں کا پکایا ہوا قورمہ اور چپاتی خاصے کی چیز ہوتا۔ اَشرا کی ماں نہ صرف کھانا پکانے میں استاد تھی، کھانے میں بھی باکمال تھی۔ وہ اپنی پسند کی بوٹیاں گرم گرم پوپلے منہ میں رکھ لیتی اور جب تک کوئی بچہ چیخ کر کہتا کہ کھا گئی، کھا گئی وہ انھیں نگل لیتی اور پھر منہ کھول کر دکھاتی اور کہتی "دیکھو تو بچے بھی کیا طوفان لگاتے ہیں"۔ گھر جاتی تو اپنے سارے گھر کے لیئے کھانا چھپا کرے جاتی

گلی کا ایک سرا ایک گول کھلے میدان میں کھلتا۔ یہیں پر محلے کی مسجد تھی۔ ایک طرف جہان خانی پٹھانوں کا پھاٹک اور احاطہ تھا اور اس سے ملحق ابّو خاں کا زنانہ اور بیٹھک تھی۔ ابّو خاں عمر کے اُس حصّے میں تھے جب انسان نماز اور گالی دینے کے علاوہ اور کوئی دوسرا کام نہیں کرتا۔ ان کی سب سے دلچسپ گالی خود 'پٹھان'، سے متعلق ہوتی جسے وہ 'بدذات'، کہتے تھے۔ میدان کے عین درمیان میں نیم کا ایک چھتنار درخت تھا، جس کی عمر کے بارے میں مختلف روایتیں تھیں۔ اس کے نیچے کھٹّے پڑے رہتے اور آس پاس درختوں کی کچھ موٹی جڑیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں جو اسٹول کے طور پر کام آتیں۔ اس جگہ کو محلّے والوں نے 'نیم تلّے'، کا نام دے رکھا تھا۔ اسی سے نانا جان نے 'نیم تلّے کی دوستی'، کا محاورہ تراشا تھا۔ ظاہر ہے صدرِ مجلس جان عالم خاں ہی ہوتے، باقی سب چھٹ بھیئے۔ لیکن ان چھٹ بھیئوں کو مساوات کا حق حاصل تھا۔ انھیں محبّت سے قابو میں رکھا جا سکتا تھا کسی دباؤ سے نہیں۔ مجال نہیں کہ جان عالم خاں اپنی دولت یا رسوخ کے باوجود کسی کو تم سے تو کہدیں۔

نیم تلّے کی نشست میں پابندی سے موجود ہونے والوں میں ایک گل شیر خاں تھے۔ جو سامنے کے پھاٹک میں رہتے تھے۔ وہ جنّو خاں (جان عالم خاں) کے کارندے رہ چکے تھے لیکن بے تکلفی سے انھیں 'جنّو'، کہتے تھے۔ شہباز خاں تھے جو جان عالم خاں کے ہم پیشہ و ہم راز تھے اور باہر کے موکوں کے گماشتے۔ آخر عمر میں جب جنّو خاں بہت اونچا سننے لگے تھے تو شہباز خاں کو چیخ کر بات کرنا پڑتی تھی۔ لطف جب آتا جب وہ کسی 'نو بہارِ ناز'، کو تاک کر آتے اور اس کی اطلاع پنچم سُروں میں یہ کہہ کر دیتے کہ 'بڑے راز کی بات بتا رہا ہوں'، اور یہ راز کی بات

ضرورت کے پیشِ نظر اس قدر بلند آواز سے کہی جاتی کہ ع

ایں راز ہماں راز کہ معلومِ عوام است

مجھے یاد نہیں کہ میری بسم اللہ ہوئی یا نہیں ہوئی یا کب ہوئی، البتہ یہ جانتا ہوں کہ چھ سال کی عمر میں مجھے محلّے کے میونسپل اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اسکول میں ایک ہیڈ منشی احمد حسین تھے (جو یک چشم تھے، اس لیے کانے منشی کے نام سے معروف تھے) اور دو چھوٹے منشی تھے جن میں ایک ذات کا کُرمی تھا۔ ٹاٹوں پر پڑھائی ہوتی تھی، صرف منشی صاحبان کرسیوں پر براجمان ہوتے۔ تختیوں پر لکھائی، درسی کتب کی رٹائی اور جولاہے کا ایک لڑکا، جس کا کوئی قریبی عزیز کوٹھے میں تھا، اس کے لائے ہوئے اخروٹوں کا کھانا یاد ہے۔ پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد مدرسے کے پشت پر واقع میدان میں دوڑ لگوائی جاتی تھی۔ پتورے کے اس اسکول میں میں نے کیا سیکھا اور کیا نہیں سیکھا، ذرا بتانا دشوار ہے۔ کانے منشی کو جب لڑکے تنگ کرتے تو مدرسے کے نیم سے ایک تازہ سنٹی توڑ کر ان کی خبر لیتے بلکہ اکثر سنٹی کے ساتھ ٹاٹوں کے درمیان ٹہلتے رہتے۔ اس وقت ہم لوگ کم از کم نصف وقت تک خود کو محفوظ سمجھ کر خوب شرارتیں کیا کرتے تھے۔ جب منشی جی کی کانی آنکھ دوسری جانب ہوتی تو دوسرے رُخ کے طلبہ کو ہری جھنڈی دے دی جاتی تھی، یعنی اب انھیں آزادی ہے۔ اس طرح باری باری سے ہم لوگ لطف اندوز ہوتے تھے۔

چھوٹے مسلمان منشی کے طاقت ور ہونے کا بڑا رعب تھا۔ کہتے تھے کہ وہ وکٹوریہ کے زمانے کا موٹا پیسہ کرسی کی درز میں پھنسا کر انگوٹھے سے موڑ دیتے تھے۔ یہ بھی روایت تھی کہ ان کے قبضے میں جن ہیں۔ ہمارے کُرمی منشی سے اس قسم کی کوئی روایت منسوب نہیں تھی۔ وہ محنت کے ساتھ پہاڑے رٹاتے تھے۔ جب اسکول چھوڑا ہے تو ہمارے علم کی کل کائنات اردو لکھنا پڑھنا اور حساب کی گنتی اور پہاڑے تھے۔ آگے اللہ اور صفر!

دس برس کی عمر تک میرے ارد گرد جو ماحول تھا اور اس کے کردار جب حافظے کے پردے پر اُبھرتے ہیں تو بیٹھا گھنٹوں محظوظ ہوتا ہوں۔ مردانے میں روز کے حاضر باشوں میں نور عالم خاں تھے جنھیں عزیز داری کی بنا پر احتراماً چچا نوری کہا جاتا تھا۔ ان کی مالی حالت خستہ تھی۔

اس لیے بڑے گھر والوں کی جانب سے حسد کا جذبہ رکھتے تھے۔ باوجود جاہلِ مطلق ہونے کے علم مجلسی میں طاق تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ انھوں نے اپنی دوسری بیوی کو جوئے میں جیتا تھا۔ جب مقابل کا پٹھان جواری مسلسل ہارتا گیا تو اس نے آخر میں اپنی کنواری لڑکی کو داؤں پر لگا دیا۔ زہے قسمت 'چچا نوری وہ داؤں بھی جیت گئے۔ جیتنے کے بعد جھٹ بچّہ لائے اس پر چادر باندھی اور نئی نویلی کو لے کر گھر چلے۔ بات کے دھنی پٹھان نے اُف تک نہ کی۔ گھر پہ پہنچتے ہی کسی ملّا کو پکڑ کر لائے اور کھڑے کھڑے نکاح کیا۔ اس کے بعد وہی اُن کی چہیتی بیگم رہیں اور اُن سے کئی اولادیں ہوئیں۔ چچا نوری غریب تھے لیکن پٹھانوں کی مساوات کی روایت کے مطابق وہ اپنی عزت کرانا جانتے تھے۔ مجال نہیں تھی کہ کوئی ان پر فقرہ بھی کس سکے۔ سب کا نام لیتے اور تخاطب میں برابری کا سلوک رکھتے۔ فخاری اور ہیکڑی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتے تھے۔ اگر کسی کے ساتھ میلے میں جا کر بھینس خریدنے میں (جس کی شناخت کے وہ ماہر تھے) مشورہ دے دیتے تو اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے کہ میں نے فلاں خاں کو بھینس خرید وادی۔

زنانے گھر کے پڑوس میں ڈاکٹر امیروا (محمد امیر خاں) کا پختہ مکان تھا وہ فوج میں گھوڑوں کے ڈاکٹر تھے۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد تخفیف میں آ گئے۔ اب ان کی توجہ چوپایوں کے بجائے 'دو پایوں' کے علاج کی جانب ہو گئی۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد انھوں نے محض دل لگی کی خاطر اپنا مطب قصبے کے بازار میں کھول لیا تھا۔ ان کا زیادہ تر وقت برادری کے پٹھانوں کی مفت خدمت کرتے گزرتا۔ گھر میں کسی کی بھی طبیعت خراب ہو جاتی، سب سے پہلے وہی طلب کیے جاتے۔ ۱۹۲۷ء میں جب میں ڈھاکے سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے کر اعصابی امراض میں گرفتار آیا تو مجھے بھی ان کی 'حذاقت' سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ مجھ پر جب دورے کی سی کیفیت ہوتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے اور میں موت کے قریب آ کھڑا ہوا ہوں۔ یہ منظر میری نانی اور دیگر تمام عزیزوں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر امیروا ایک دو ملاقاتوں میں میری بیماری کو بھانپ گئے۔ کچھ انھیں اس بات سے بھی کوفت تھی کہ وہ وقت نا وقت بلائے جاتے تھے۔ ایک بار جب میں نے اس قسم کی تکلیف کی شکایت

کی اور چیخا چلایا اور ڈاکٹر امیر دا کو فوری طور پر طلب کیا گیا تو انھوں نے آتے ہی کہا "مجھے دیا سلائی لاکر دو، میں آج مسعودا کے پاجامے میں آگ لگا دوں گا۔" دیا سلائی آگئی اور جب وہ واقعتاً اسے جلا کر میری جانب بڑھے تو میں نے خیال کیا کہ یہ پاگل ڈاکٹر آج مجھے نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ یا تو میں حد درجہ کمزوری کا اظہار کر رہا تھا یا مجھ میں اس قدر توانائی آگئی کہ چارپائی سے تڑپ کر سیدھا دروازے کی جانب بھاگا۔ ڈاکٹر امیر دا کو اس کے بعد یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ اسے مراق ہو گیا ہے، یہ بیمار دیمار کچھ نہیں ہے، بس جب دورہ پڑے اس کے ساتھ یہی حرکت کرو۔ اس کے بعد کبھی میری طبیعت غیر بھی ہوتی تو میں کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرتا لیکن ڈاکٹر امیر وا کے بارے میں عرصہ تک میری رائے خراب رہی۔

میری اس رائے کی تصدیق ان کے بعض طبی کارناموں سے بھی ہوتی ہے جو ان سے سرزد ہوئے۔ محلے کے قمردا خاں کی داڑھ میں سخت درد اٹھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے۔ وہ گھر میں جا کر اندر سے ایک زنگ خوردہ زنبور لائے۔ کہا منہ کھولو اور درد والی ڈاڑھ کے قریب کی اچھی داڑھ زنبور سے پکڑ لی۔ اب قمردا خاں لاکھ چیخیں چلائیں، دو جھٹکوں میں اچھی ڈاڑھ زنبور سے مروڑ کر کھینچ لی۔ جب قمردا خاں نے واویلا مچایا تو کہنے لگے اب دوسری داڑھ خود بخود اچھی ہو جائے گی۔ بازار کے مطب میں جہاں وہ کبھی کبھی جاتے تھے ایک لڑکا دوا کی خشک شیشیوں میں پانی ڈال کر انھیں ہلاتا اور مکسچر تیار کر دیتا۔ ان کے علاج سے جو بھی اچھا ہو جائے اسے ھُوَالشافی کا معجزہ سمجھنا چاہیئے تھا۔

ان کے بھائی نواب میر خاں کو میں زیادہ پسند کرتا تھا۔ وہ قائم گنج کے شاید پہلے میٹرک تھے اور ان کی انگریزی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ ساتھ ساتھ ذوقِ سخن بھی رکھتے تھے اور استادانہ انداز کے گرم گرم عشقیہ شعر نکالتے تھے۔ میری اور ان کی عمر میں بڑا تفاوت تھا لیکن عمر کا یہ فاصلہ ہمارے مشترک ادبی ذوق نے ختم کر دیا تھا۔ وہ اکثر مجھے اپنے اشعار سناتے اور داد کے طالب ہوتے۔ بہت بعد کو میں نے ان کی شاعری پر ایک مضمون "ہماری زبان" میں لکھا تھا۔ عقیدے کے اعتبار سے وہ مائل بہ الحاد تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دہریے تھے۔ میرے خیال میں بنیادی طور پر وہ آزاد خیال تھے۔ یعنی سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود نہیں تھے۔ نانی صاحبہ سے ان کی بھی

نوک جھونک رہتی۔ کبھی ہمارے یہاں شام کو لڑکیاں مل کر مولود شریف پڑھتیں تو دوسرے دن صبح نمودار ہوتے۔ نانی صاحبہ کو پڑوس کے رشتے سے بھاوج کہتے تھے۔ آواز دیتے کہ ذرا دوپٹے کی اوٹ کر لو تو میں آجاؤں۔ آکر پاس کے پلنگ پر بیٹھ جاتے اور نہایت سوکھے منہ سے پوچھتے۔ "بھاوج! رات کو کیا ہنگامہ تھا، یہ کون گا رہا تھا۔

ہاتھوں میں چھپک چھلّے کانوں میں بالیاں
ہم کو غریب جان کے دیتے ہیں گالیاں

یہ سن کر نانی صاحبہ سر پیٹتیں اور کہتیں "دیکھو تو بڈھے کو کیا ہو گیا ہے؟" اور نواب میر خاں ہنستے ہوئے دروازے کے باہر لپک جاتے۔ محلّے کی مسجد میں جب کبھی لوٹا چوری ہوتا (اور یہ اکثر ہوا کرتا تھا) تو لوگ کہتے ہو نہ ہو یہ چوری نواب میر خاں نے کروائی ہے۔ وہ اس کی کبھی تردید پیش نہیں کرتے۔ حالانکہ اس فعل سے ان کا دور دور واسطہ نہیں ہوتا۔ ع بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ قدرے مشترک تھی تو صرف یہ کہ دونوں نے اپنی پسند کی لونڈیوں سے نکاح کر لیا تھا۔ قائم گنج کے پٹھانوں کیلئے سانولی سلونی لونڈیوں، مہترانیوں اور دھوبنوں میں گوری چٹی پٹھانیوں سے زیادہ جنسی کشش ہوتی تھی۔ اسی کشش کے نتیجے کے طور پر اکثر گھرانوں میں خانہ زادوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جنھیں قائم گنج والے "خنادار" کے نام سے پکارتے تھے۔

جنسی آزادی کی اس فضا میں اِکّا دُکّا ایسی شخصیتیں بھی موجود تھیں جنھیں خیرِ مجسّم کہا جا سکتا تھا۔ انھیں میں ایک حافظ عطا میاں تھے، جن کا پیشہ مدرّسی تھا اور محلّے کی مسجد میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ بچّوں اور بچیوں کو مکان پر آ کر قرآن کا درس دیتے۔ ہمارے گھر کے سب بچوں اور بچیوں نے اِن ہی سے درسِ قرآن لیا ہے اور سب کے سب اِس فرشتہ صفت انسان کی نیکی کے معترف رہے ہیں۔ مجھ پر بچپن میں ان کی شخصیت کا جادو اس قدر چل گیا تھا کہ ہر چند میں اُن کے نجی مدرسے کا طالب علم نہیں تھا لیکن اکثر وہاں پہنچ جاتا۔ مدّھم لہجے اور مدّھم چال کا یہ فرشتہ لنگی باندھے لمبا کرتا

زیب تن کئے اور ہاتھ میں چھوٹا سا ڈنڈا لیے جب ہماری گلی سے گزرتا تھا تو خیال ہوتا تھا کہ پٹھانوں کی اِس بستی کا انسان نہیں ہے۔ عطامیاں کوئی عالم نہیں تھے لیکن ان کے ساتھ ساتھ نیکی کا ایک ہالہ سا چلتا تھا۔ یہ میرا ہی نہیں، گھر کے دوسرے بچّے اور بچیوں کا بھی خیال تھا۔

محلّے کے ایک ٹھیٹھ پٹھان سَون خاں بھی تھے۔ وہ 'نیم تلّے' کے سامنے کے پھاٹک کے احاطے میں رہتے تھے۔ عمر ساٹھ کے پیٹے میں تھی لیکن دانت گر جانے کی وجہ سے منھ پوپلا بہت پہلے ہو گیا تھا۔ ہر وقت اضطراری کیفیت میں رہتے اور اس قسم کی حرکتیں بھی کرتے تھے۔ وہ ہمارے مردانہ مکان کی روزانہ نشست کے مستقل حاضرین میں تھے۔ انھیں غصہ دلانا بہت آسان تھا۔ ذرا سی بات میں بھڑک اُٹھتے۔ اس وقت ان کی ٹھڈّی کپکپانے لگتی۔ بعض اوقات ہم لوگ صرف یہ دلچسپ منظر دیکھنے کے لئے ان کو غصّہ دلایا کرتے تھے۔ غصّہ کی انتہائی کیفیت میں وہ ایک دم مونڈھے سے اُٹھ کھڑے ہوتے اور اپنا چمڑودا جوتا اُتار کر اپنے سر پر تڑ تڑ مارتے اور کہتے جاتے "اب اگر سونا تمھارے یہاں آئے تو اس میں کھلانا جس میں کتا کھاتا ہے۔" اس کے بعد یہ جاؤ وہ جا۔ چند روز تک اُن کی غیر حاضری رہتی۔ اس کے بعد پھر اس طرح چلے آتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا! ہم لوگوں میں آپس میں اشارے ہوتے کہ سون چچا کی چاند کو اب کچھ دنوں تک آرام کر لینے دو۔ تھوڑے دنوں کے وقفے کے بعد یہ عمل پھر شروع ہو جاتا۔

اسی طرح عزیز چچا (عزیز خاں) تھے۔ جو بڑھاپے میں پنجر بن گئے تھے لیکن باتیں وہی ہیکڑی کی جب آتش جوان تھا۔ انھیں بڑھاپے یا کمزوری کے الزام کی برداشت نہیں تھی۔ فوراً ہاتھ زمین پر رکھ کر ڈنڑ لگانے کی پوزیشن لے لیتے حالاں کہ ایک دو ڈنڑوں کے بعد ہی زمین پر چِت دھڑ سے جاتے۔ قائم گنج کی زبان میں آن بان کے لئے ایک لفظ ہے 'مَرَک' اور دوسرا 'ٹھنولی'؛ ہے۔ یہ سب اسی کے کرشمے تھے۔

چوں کہ بڑے ماموں، سلطان عالم خاں ابتدا سے ایک سیاسی شخصیت کے مالک تھے اس لیۓ اُن سے ملنے کے لیۓ ہمارے مردانے میں بھانت بھانت کے لوگوں کا صبح سے شام تک تانتا بندھا رہتا حقّہ اور پان سے تواضع ہوتی تھی اور ایک ملازم، اجوا (آرزو حسن) مسلسل زنانے اور مردانے مکانوں کے درمیان دوڑتا رہتا۔ اجوا مردانے مکان کی جان تھا۔ اُس سے زیادہ وفادار ملازم کا تجربہ مجھے اپنی زندگی میں نہیں ہوا۔ جس گھر میں... عمری

میں داخل ہوا اسی سے مر کر نکلا۔ وہ میرے دونوں بڑے ماموؤں کی صبح سے شام تک ہر قسم کی خدمت کرتا۔ گھر کے بچے اس سے مانوس تھے۔ گھر میں اس کی حیثیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب میری شادی کا مسئلہ چھڑا اور گھر ہی کی ایک 'بنتِ عم' سے ہونا قرار پائی تو اسے باقاعدہ شکل دینے کے لیے اجواہی کو استعمال کیا گیا۔ اسی نے آکر میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ میں اپنے بڑے بھائی اور بہن کو حیدرآباد لکھوں کہ وہ میری نسبت کے لیے باقاعدہ سلسلہ جنبانی کریں۔

محلّے کے بچّوں (اور بعد کو نوجوانوں) میں ایک اور شخصیت جس کا میری زندگی میں بڑا عمل دخل رہا ہے، حکیم سرور عالم خاں کی ذات ہے۔ وہ میرے بچپن کے ساتھی ہیں اس وقت سے جب وہ عرفِ عام کے 'حکیم جی' ابھی تک نہیں بنے تھے۔ انھوں نے طبابت کی سند بہت بعد کو طبیہ کالج دہلی سے لی تھی۔ میں اُن کی طبابت کا تو کبھی قائل نہیں رہا لیکن بحیثیت مخلص دوست اور اچھے انسان کے ہمیشہ قدر کی۔ ان کی وضع داری کا یہ عالم ہے کہ وہ اوّل تا آخر ایک ہی انداز میں تعلقات نباہتے رہے ہیں۔ دائمی نزلہ کے مریض ہونے کی وجہ سے اپنے سر اور کانوں کو ایک بڑے سے مفلر سے ہمیشہ لپیٹے رہتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے معاً غزل کے کسی شاعر کا وہ خیال یاد آجاتا ہے کہ جب 'مسیحا' خود بیمار ہو تو مریض کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔

درونِ خانہ میرے ہر وقت کے ساتھیوں میں میرے چھوٹے ماموں خورشید عالم خاں تھے۔ ہم دونوں کی عمروں میں صرف سوا سال کا فرق تھا۔ میں ان سے چھوٹا تھا۔ لیکن عمر یا رشتے کی بزرگی سے ہماری یاری میں فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہر قسم کے کھیل کود میں میرا ان کا ہمہ وقت کا ساتھ تھا۔ وہ چاہے کنّوں کا شکار ہو، گلّی ڈنڈا ہو یا آموں پر زور آزمائی۔ ہمارا محبوب مشغلہ 'تعمیر' تھا یعنی اینٹوں یا مٹی سے گھروندے بنانا۔ یہ کام اکثر گرمیوں کی طویل دوپہروں میں ہوتا، جب گھر کے سارے بڑے خراٹوں کے ساتھ فرشی پنکھوں کے نیچے سوتے تھے اور ہم باوجود نانا صاحب کی تنبیہ اور ہدایت کے تھوڑی دیر لیٹ کر دبے پاؤں باہر نکل جاتے۔ گھروندے سازی کے اس کھیل میں مجھے خورشید سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ وہ خود راج کا رول ادا کرنے لگتے اور مجھے مزدور کا کام کرنے کے لیے کہتے۔ اینٹیں لاؤ، گارا بناؤ، چھت کے لیے پٹاؤ تیار کرو۔ میری انا کو اس سے

ٹھیس لگتی، میں بغاوت کر بیٹھتا اور پھر اس کے بعد سارا کھیل بگڑ جاتا۔

پتورے کے مدرسے سے نکل کر میں تو جامعہ ملیہ چلا گیا اور خورشید فرخ آباد کے مشن اسکول۔ اس کے بعد ملاقات صرف تعطیلات میں ہوتی۔ خرگوش کے شکار کا سلسلہ جاری رہا لیکن اب توجہ زیادہ تر ڈنڈ مگدر، دودھ کی پلائی اور آموں کی کھلائی، کی جانب ہو گئی تھی۔

قائم گنج کی یادوں میں میرے لیے سب سے دلچسپ وہاں کی مخصوص زبان تھی۔ قائم گنج کا قصبہ قنوجی بولی کے علاقے میں آباد ہے جو برج بھاشا سے بہت ملتی جلتی ہے۔ وہاں پونے تین سو برس پہلے پٹھان خاندان درۂ خیبر سے پشتو بولتے ہوئے آئے تھے۔ دو تین پیڑھیوں تک پشتو کے اثرات نمایاں رہے خاص کر عورتوں کی بولی میں۔ میرے زمانے تک آتے آتے پشتو کے صرف چند لفظ رہ گئے تھے وہ بھی نسوانی محاورے میں مثلاً مُندِگر (عصر) مَشختن (عشا)، پیغلا (کنواری لڑکی)، تربوُر (دشمن، لغوی معنی چچازاد بھائی جو خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ہمیشہ دشمن ہوتا تھا)۔ پیشے (بلّی)، تنبے (کواڑ)، واپے زان (پیچھے ہٹو)۔ خوارا (خواہر)۔ غرغرے کا وقت (مشکل کا وقت)، شر ینو بیٹی (جس کے سب مر گئے ہوں) حریان پیٹی (بدتمیز)۔

مفرد الفاظ اور محاورات کے علاوہ پشتو کے کچھ گیت بھی تھے جو ڈومنیاں (افغانی نسل کی)، بچّے کی پیدائش یا شادی کی رسموں کے وقت بغیر معنی سمجھے گاتی تھیں۔ بچّے کی پیدائش کے گیت کو "راے خوری" کہتے تھے جو اس کی ابتدا میں آتا ہے۔ اسی طرح سہرے کے گیت تھے بچوّں کی لوریاں تھیں حتیٰ کہ خاندان کی بڑی بوڑھیاں نماز کی نیت تک پشتو میں کرتی تھیں۔ پشتو کے ان اثرات سے قطع نظر جو نسلاً بعد نسلٍ کم ہوتے گئے، قائم گنج کے پٹھان گھرانوں میں کھڑی بولی اردو بولی جاتی تھی جس میں قدیم اردو کے متروک الفاظ اور تراکیب کثرت سے ملتی تھیں مثلاً کدھو، کدھیں (کبھی) لگُوں (تک)، اِتّا، اِتّیا، جتّا، اِن نے، اُن نے، کن نے، محاورے بھی بہت دلچسپ تھے جو اور کہیں سننے میں نہیں آتے جیسے:

لاربار ہونا = خوشامد کرنا

پینکڑے باڑی = پاگل ہونا

کونیوں سے نکل جانا = بالکل ختم ہو جانا (دوستی وغیرہ)

اَبّے تبّے = اگلے تلّے

پَنْپیر پڑنا = صلح صفائی کرانا

کُلف پڑنا = لڑائی ہونا (قفل)

اُورے پُورے کرنا = خوشی کو ختم کر دینا

مَنّوے پڑنا = منانا

لگّے نگّے = یار دوست

نَخ نَخ کرنا = گلا سوکھنا (پیاس سے)

تُخ پُخ کرنا = ڈر سے ہگ دینا

گونا گرجانا = زور ختم ہونا

بلکیاں کھانا = بل کھانا

پٹھانوں کی زبان گالیوں اور کوسنوں سے بھری ہوتی۔ گالیوں کی تو فہرست کیا دوں اُن سے اُن کی "جنسیت" کے علاوہ کچھ اور ظاہر نہیں ہوتا۔ البتہ کوسنے جو میں نے نانی صاحبہ کی زبان سے سنے ہیں وہ دلچسپ ہیں۔

تجھے سہار کا دیو/کالا دیو مارے (سہار = سحر)

تو کالی آندھی پر اُڑے = برباد ہوئے

تو پیلے تکوؤں سے نکلے = اچانک مر جائے

پچھپاتی کھٹیا نکلے = اچانک مر جائے

رنس کی ایڑھیاں رگڑے = لمبی بیماری سے مرے

کڑ کڑاتی بجلی گرے = اچانک موت ہوئے

دانہ دانہ کرنا = برباد کرنا

تنت منّت ہونا = برباد ہونا

نندو خاں کے ڈھیلے کھائے = مرادمر جائے (نندو خاں قائم گنج کا پرانا قبرستان ہے جہاں ہمارے مورثِ اعلیٰ حسین خاں دفن ہیں)

دلچسپ بات ہے کہ قائم گنج کے پٹھانوں کی آبادی قنوجی کے بحرِ ذخار میں ٹاپوں کی طرح تھی۔ یہاں کے پٹھان اپنے علاقے کی بولی بہ خوبی سمجھتے تھے لیکن شان یہ تھی کہ بولتے تھے اپنی کھڑی (اردو)۔ میں نے بچپن میں اکثر یہ سین دیکھا کہ اسامی نانا جان کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ وہ مونڈھے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسامی زمین پر اکڑوں بیٹھے سرکار، ہجور کر رہے ہیں۔ وہ اپنی بات قنوجی میں کر رہے ہیں اور نانا جان اس کا جواب کھڑی میں دے رہے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی بات مکمل طور پر سمجھ رہے ہیں۔ لیکن ایک پارٹی بہ مجبوری اور دوسری فخریہ جا کے طور پر ابلاغ کے زینے پر چڑھنے یا اُترنے سے انکار کرتی ہے۔ کھاں صاحب، خاں صاحب رہتے ہیں اور گنوار گنوار!

پٹھانوں کی اس اردو میں بہت سی لسانی خصوصیات ایسی تھیں جن کی معیاری اردو متحمل نہیں ہو سکتی۔ قنوجی کی صرفی و نحوی شکلیں بھی در آئی تھیں جن کا خاں صاحب کو احساس تک نہیں تھا لیکن ہماری نسل جو جامعہ ملیہ اور علی گڑھ کی تعلیم یافتہ تھی متبسّم ہو جاتی تھی مثلاً ہیَں (یہاں) ہُوَن (وہاں)، اُتے خَن (اسی وقت۔ خن یا کھن = لمحہ) مَنوں آدمی (بہت سے آدمی)۔ چکّو (چاقو)، کُرآن (قرآن)، کُلف (قفل)۔ وہ جاتا ہیگا۔ (جا رہا ہے)، ہوئے گا (ہوگا)۔ بعدی (بعد)، متی (مت) ہلا (ہاں) وغیرہ۔ قائم گنج کے پٹھانوں کی زبان کی ایک جھلک ذیل کے مکالموں میں مل جائے گی۔

دو پٹھانوں کے درمیان مکالمہ

مِدّو خاں (مُدبّرالدّین خاں)

مُدّو خاں (عبدالحمید خاں) ہوت! ارے تم کاں جارئے اُدّ و
کہاں جا رہے ہو

داں بجو۔ میں بی آیا۔
شہرو بھی

مدّو خاں (عبدالحمید خاں)

ہلا' ارے ادّا تو میہاں؟ کلاں خیلوں سے کب آیا؟ ارے آمیرے سنگ، ایک
ہاں بھائی یہاں (محلہ کا نام) ساتھ
ضروری کام ہے۔

مدّو خاں:

ارے مَیں کل سے تیرے مارے ہینگو ہینگو پھر رّیا ہوں برے تو ملتا ای نیئں۔ ملوم
وجہ سے ڈانواں ڈول رہا لیکن ہی نہیں معلوم
بھی ہے کگی خیلوں میں متّو خاں اور بنی عالم خاں میں لٹھ پونگا چل گیا۔ ارے مدوا! دونوں بڑے
(محلہ کا نام)
سنگ اور بہت چھٹ ہیں' پٹھونی پر آجاتے ہیں تو نہ کنواں دیکھتے ہیں نہ کھائی۔ کل جو اُن میں
سنگھ 'پٹھانیت'
لٹھ پونگا ہوا تو میں بھی ہُوایئں کھڑا تھا۔ اللہ کی سوں بال بال بچ گیا نیئں تو ہُواں ہی ڈھیر
وہاں ہی قسم نہیں وہیں
ہوتا۔ یہ پٹھان بھی بڑے مڑک کے لوگ ہوتے ہیں۔ جان چلی جائے موچھ نیچی نہ ہونے پائے۔
آن بان
اسی کو 'پٹھونی' کہتے ہیں۔

زنانی بولی میں محاورے کا رنگ اور چوکھا ہوجاتا ہے۔

دو پٹھانیوں کا مکالمہ

حمیدن: اری خوارا تینے کھول نا، کِتّے خن کھڑی بھئی ہوں۔ کوئی ہیَں سُنتا ای نئیں۔
خواہر بہن کواڑ کتنی دیر ہوئی یہاں ہی نہیں

حنّا: اری آرئی ادں بوبو! کئو سب خیر سلاّ ہے۔
رہی ہوں (بہن) کہو خیریت

حمیدن: اری کائے کی خیر سلاّ۔ مڑد کا زن کدن چل ریا ہے۔
مرد مجیلا

کوئی ڈانگٹر مَرَض کو سمجھ ای نئیں پاتا۔ مَیں کیتی اُوں یہ اوپرکی ہَوا ہے۔ وہ

ہی نہیں کہتی ہوں

بڈھا اٹیریاں رگڑے گا بَرے میری سُنے گا نئیں۔

لیکن نہیں

مُنّا: اری یہ متی کئو۔ یہ گھرا گھر پٹینا ہے۔ جَرواں تو کسی گنتی شمار میں کا ہے کو

مت کہو عورتیں

ہونے لگیں میں نے کیا تھا لڑکی کو سُسرال متی بھیجیو بَرے اُس کے بھایئں

کہا مت لیکن اثر

نہیں ہوئی۔ اب ہواں پھانے کرے۔ یا چند وپیٹے کوئی خبر کا لیوّیا نئیں ہے۔

وہاں فاقے سر لینے والا نہیں

حمیدن: اری خوارا تو اُسے مُلائے گی کیسے۔ وہ تو دوسرے جی سے ہے۔ کیا اُس کی

بہن حاملہ

سُسرال کے ٹول ٹبّر کو بھی کھلائے گی۔ اچھا یہ بتا کل ننے ادّا کے وَزر کو چلے گی۔

خاندان تعزیت

اب میں چلتی ہوں۔ وہ، آگیا ہوگا، نَدِگر کی نماز پڑھنا ہے۔

شوہر عصر

مردوں کی زبان ہو کر عورتوں کی جنسی اشاروں اور حوالوں سے بھری ہوتی تھی۔ جامعہ ملیہ کے ثقہ ماحول میں رہنے کے بعد ان کی جانب عجیب وغریب قسم کا ردِّ عمل ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں منجھلی مُمانی (قدوس عالم خان کی اہلیہ اور میری ساس، جن کا تعلق علی گڑھ کے شیروانی خاندان سے تھا) اس عجیب وغریب آزاد محاورے، کو سُن سُن کر شرم سے زمین میں گڑ جاتی تھیں۔ وہ شیروانی خاندان کی روایت کے مطابق ہم سب کے ناموں کے آگے 'میاں'، لگا دیتی تھیں۔ مسعود میاں، خورشید میاں لیکن جب دوسرے دالان سے مسودا، خورشیدا کا نعرہ بلند ہوتا تو بھونچکی رہ جاتیں۔ ہماری ددھیال کا تعلق چوں کہ حیدرآباد

دکن سے رہا تھا اس لئے ہمارے خاندان میں 'میاں' کا لفظ احتراماً یا شفقت کے طور پر بڑے چھوٹے دونوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً میں اپنے چچا کو 'یوسف میاں' کہتا اور وہ مجھے 'مسعود میاں' کہتے۔

اس ماحول سے گھبرا کر منجھلی ممانی صاحبہ نے اپنی مستقل رہائش بالائی منزل پر کرلی تھی' اسی لیے نانی جان طنزاً انھیں 'چھینکے کی ہنڈیا' کہا کرتی تھیں۔ کہتیں "اری اس حریان (حیران) پیٹی سے کبو (کہو) کہ کبھو نیچو (نیچے) بھی آجایا کرے۔"

قائم گنج کے پٹھانوں کے عموماً دو نام ہوتے تھے، ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا۔ بعض اوقات دونوں میں صوتی تعلق نظر آتا جیسے جنّو خاں (جان عالم خاں) اجّو (آرزو حسن)، بدّو خاں (بدیع الدین خاں)۔

اور بعض اوقات دونوں میں کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اور دوسرا نام عموماً غیر اسلامی دیسی ہوتا تھا مثلاً بدّا خاں (عبدالستار خاں)، حوخاں (عبدالغفار خاں) گنجو خاں (چراغ الدین خاں)، بدھن خاں، مچنا خاں، منّا خاں، ننھو خاں، ٹھنیا خاں، مدھن خاں، منن خاں، منّو خاں۔ یہاں تک کہ بعض انگریزوں تک کے نام فوجی ملازمت کے توسط سے قائم گنج پہنچ گئے تھے جیسے لٹور خاں جو اصل میں 'لیٹور' تھا۔

پٹھانوں کا عمومی لہجہ کھڑا ہوتا لیکن اکھڑ نہیں جیسا کہ میرٹھ اور اطراف کے اضلاع کی کھڑی بولی میں پایا جاتا ہے۔ کوئی پٹھان 'بڑی بولی' نہیں بولتا لیکن برج بھاشا کے کچھ اثرات اس کے لہجہ میں پائے جاتے ہیں جو دوآبہ کے کھڑے لہجہ سے اسے ممیز کرتے ہیں۔ پٹھان بچے کو اردو کے معیاری لہجے یا محاورے پر قدرت حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اردو کے نقطۂ نظر سے اہلِ زبان ہوتا ہے۔

پٹھانوں کی زبان کے زیر اثر ہندوؤں کی بعض ذاتیں اور طبقات بھی کھڑی کا استعمال کرنے لگے تھے جیسے کائستھ اور بازار کے بنئے۔ چھوٹی عدالتوں میں ابھی تک اس کا چلن تھا اور قصبے کے 'تحصیلی اسکول' میں اردو ہی کا رواج زیادہ تھا۔ مسلمان بچوں کی دینی پڑھائی زیادہ تر مساجد سے ملحق مکتبوں میں ہوتی یا بعض متموّل گھرانوں میں مولوی اور منشی گھر پر آکر پڑھا

جاتے تھے۔

یہ سن کر تعجب ہوگا کہ قائم گنج کے پٹھانوں کا لباس دھوتی تھا۔ جان عالم خاں آخر وقت تک اسے استعمال کرتے رہے۔ حالاں کہ تحقیراً وہ گنوار اور بزدل کے لیے 'دھتیال' کی ترکیب بھی استعمال کرتے رہے۔ جب قائم گنج سے باہر جاتے تو لمبا کوٹ اور علی گڑھ کٹ پاجامہ ضرور نکل آتا۔ خود میں نے بچپن میں دھوتی باندھی ہے۔ دھوتی 'سنگی' (بہادری) کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ نوجوان پٹھان لونڈے جو کسرت اور دودھ کے شوقین تھے اپنی پنڈلیوں کے بالوں کو اُسترے سے مونڈتے تھے جس سے ان کی پہلوانی کا شوق نمایاں ہوتا تھا۔ جیب میں قائم گنج کا بنا ہوا خنجر نما چھوٹا یا بڑا چاقو رکھتے تھے۔ یہ قائم گنج کی خاص صنعت شمار کیا جاتا تھا۔ میں نے بھی اس قسم کے چاقو کو برسوں اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اس کے پاس ہونے سے ایک نفسیاتی مضبوطی کا احساس ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے جب کہ قائم گنج کے لونڈے اس کی بار بار آزمائش کرتے رہتے تھے مجھے اس کے کھولنے تک کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قائم گنج کی زبان میں اسے 'ڈیگلو' کہتے تھے اور سب سے چھوٹے چاقو کو 'ڈیکیا'۔ لکھنؤ کا چوڑی دار تو قائم گنج کو نہ زیر کرسکا لیکن علی گڑھ کے تنگ مُہری کے پاجامے کا رفتہ رفتہ میرے بچپن میں رواج بڑھتا گیا۔ سر پر عموماً صافہ باندھا جاتا تھا لیکن نئی نسل کسی قسم کی ٹوپی بھی پہننے لگی تھی۔ شیروانی کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ اس کا رواج تو ان خاندانوں کے ذریعے رفتہ رفتہ پھیلا جن کا تعلق علی گڑھ یا حیدر آباد سے ہو گیا تھا۔ جب گھر سے باہر نکلتے تو ہاتھ میں لاٹھی یا مرزا پور کا ڈنڈا ضرور ہوتا۔ بیت یا چھڑی بھی تعلیم یافتہ نسل قائم گنج میں لائی ہے۔ البتہ بندوق رکھنے اور شکار کھیلنے کا شوق عام تھا۔ ہمارے پردادا شیر کا شکار کھیلنے ہمالیہ کی ترائی تک جاتے۔ ہم لوگ شکاری کتّوں کو لے کر آس پاس کے کھیتوں اور باغات میں نکل جاتے جہاں خرگوش کے شکار میں بڑا مزہ آتا۔ شکاری کتّوں کو "لگے لگے" کہہ کر ہلکارنا اور پھر شکار کے پیچھے دوڑنا، مہم جوئی کا سا لطف آجاتا تھا۔ ہمارے گھر میں ماموؤں کے پاس ہر قسم کے آتشیں اسلحہ تھے لیکن احتیاط تھی کہ بچے اس کو ہاتھ نہ لگائیں۔ چنانچہ میں نے بندوق سے پہلا فیر ۱۹۸۰ء میں کیا۔ وہ بھی لائسنس کی تجدید کراتے وقت، حالاں کہ میرے پاس بندوق پچھلے اٹھارہ برس سے موجود ہے، اور میری بیوی اس بندوق سے کئی بار فیر کر چکی ہیں۔

جب وہ اس سلسلے میں میرے اوپر ہنستیں تو میرا بندھا ٹکا جواب یہ ہوتا کہ میں نے بندوق کا لائسنس چوروں کی وجہ سے لیا ہے۔ جب کسی چور سے سابقہ پڑے گا تو اس وقت فَیر کر دوں گا۔ پندرہ برس تک میرے لائسنس کی تجدید سفارشوں کے ذریعے بغیر ذاتی حاضری کے ہوتی رہی۔ پچھلے سال اچانک حکم ملا کہ تھانے میں ذاتی حاضری دینا ضروری ہے اور سب انسپکٹر کے سامنے دو فَیر داغنا ہوں گے۔ بندوق لے کر دو دپور تھانے میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ حاضر ہوا۔ میرے عزیز کو تشویش تھی کہ جب آج تک بندوق نہیں چلائی ہے تو یہ امتحان کیسے دے سکوں گا۔ خیر انسپکٹر صاحب نے تھانے کے احاطے میں کھڑے نیم کے درخت پر لٹکے ہوئے سیاہ کپڑے پر مجھ سے فَیر کرنے کو کہا۔ میں نے نہایت اطمینان سے کارتوس نال میں ڈالا، گھوڑا چڑھایا اور دَن سے سیاہ کپڑے پر مار دیا۔ جس اطمینان اور صفائی کے ساتھ میں نے یہ پہلا فَیر کیا اس پر مجھے اور داروغہ جی دونوں کو تعجب ہوا۔ کہنے لگے "شری مان جی، آپ تو بہت اچھے بندوقچی معلوم ہوتے ہیں اب دوسرے فَیر کی ضرورت نہیں۔" میں نے اپنے جی میں کہا ع سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

اب میں اپنے دوسرے فَیر کے لیے یا تو کسی چور اُچکے یا تین سال کے بعد تجدید لائسنس کا انتظار کر رہا ہوں!

خرگوش کے شکار کے لیئے علاوہ میں نے پتنگ بازی کا بھی ناکام شوق کیا ہے۔ یعنی میری پتنگ کبھی دس فٹ سے اوپر نہ جا سکی جس پر مجھے بہت غصہ آتا اور اُسے پھاڑ کر پھینک دیتا۔ گلی ڈنڈا بھی کھیلا معمولی کامیابی کے ساتھ۔ گولیاں اور تاش بھی کھیلے، اس طرح کہ ہمیشہ ہارا۔ شطرنج سے بھی شوق کیا لیکن ہمیشہ مات کھائی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں کسی کھیل میں کامیابی حاصل نہیں کر سکوں گا اور نہ کی۔ بچپن سے کانوں میں یہ تُک بندی پڑی ہوئی تھی ؎

پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے نواب
جو کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب

حواسِ خمسہ میں میری قوتِ شامّہ اور سامعہ بچپن سے نمایاں رہی ہیں چنانچہ جب بھی بچپن کی یادیں ذہن میں آتی ہیں تو دماغ معطّر ہو جاتا ہے۔ نیم اور مٹھے کے پھولوں

کی مہک سے اور آم کے بور کی بھینی بھینی خوشبو سے ہمارے مکانات میں نیم یا مولسری کے درخت کا ہونا لازمی تھا۔ اس کے ساتھ پاس کے باغات کے تُرشاوے کے پھولوں اور آم کے بور کی لپٹیں آتیں۔ صبح کے وقت ان میں گہری سانسیں لینا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ گھروں کے اندر بیلے، چمبیلی اور جوئی کے درخت ہوتے۔ نواڑی سب سے پہلے پھولتی اس کے بعد بیلا اور پھر چمبیلی۔ شوقین نوجوان اُن کے گجرے بنا کر پہنتے۔ عورتیں بالوں میں گوندھتیں۔ میں رات کو انھیں سرہانے رکھتا۔ پھولوں کی قدرتی مہک میری آج بھی کمزوری ہے جس کو میں ہر قسم کے عطر پر ترجیح دیتا ہوں۔

قوتِ شامّہ کی طرح میرا سامعہ کا حس بھی بچپن سے تیز رہا ہے۔ اس لیے بچپن میں چڑیوں کی چہچہاہٹ، کوئل کی کوکو اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ میرے لیے ہمیشہ سامعہ نواز ہوتی تھیں۔ خاموشی میرے لیے ہمیشہ باصدا ہوتی اس لیے کہ جس قدر یہ گہری ہوتی میں گلہریوں، چوہوں اور ٹڈوں کی آوازیں سنتا۔ قوت سامعہ کی اس مہارت ہی کی وجہ سے آگے چل کر میں اچھا ماہر صوتیات بن سکا۔ شور و غل چاہے وہ نوحۂ غم کا ہو یا دنغۂ شادی کا میرے لیے ہمیشہ عذابِ جان بن جاتا ہے۔

دوسرا باب

جامعہ مِلّیہ اسلامیہ (۱)

ننہال میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی جانب بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ نانا صاحب علی گڑھ جاتے جاتے رہ گئے۔ بڑے ماموں ضرور پہنچ گئے لیکن انٹرمیڈیٹ کی پہلی کلاس سے ایسے بھاگے کہ مڑ کر نہ دیکھا۔ منجھلے ماموں جامعہ ملیہ اسلامیہ بھیجے گئے اُنھوں نے بھی آٹھواں درجہ پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مذہبی تعلیم کی جانب بھی توجہ کم رہی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کسی بھی مولوی سے قرآن کا ایک سیپارہ بھی پڑھا ہو۔ میری جہالت کا یہ دور شاید طویل تر ہو جاتا اگر ۱۹۲۶ء میں بڑے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین جرمنی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز نہ ہو جاتے۔ وہ منظر میں کبھی نہیں بھولوں گا جب فروری ۱۹۲۶ء کی ایک سہ پہر اہلِ قائم گنج کا ایک ہجوم انھیں لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر آگرے کی جانب سے آنے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں بھی اپنی لمبی ٹانگوں کے باوجود ایک ملازم کی گود میں لدا وہاں موجود تھا۔ ریل سیٹی دیتی ہوئی پلیٹ فارم پر آکر رکی۔ اس سے ایک متین و مقطع جوان گاڑی سے برآمد ہوا جسے ہجوم نے گھیر لیا۔ مجھے اُن تک پہنچتے پہنچتے کافی عرصہ لگ گیا، لیکن انھوں نے مجھے ایک نظر میں پہچان لیا اور گود میں لے کر سینے سے لپٹا لیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میرے چھوٹے چچا محمود میاں (ڈاکٹر محمود حسین خاں) مجھے اپنے ساتھ لے کر جامعہ ملیہ داخلے کے لیے جائیں گے۔ جو اس وقت قرول باغ میں کرائے کی عمارتوں میں تھی۔ جامعہ ملیہ میں میرا داخلہ ۱۰ اگست

۱۹۲۷ء کو درجۂ دوم میں ہوا۔ چھوٹے چچا نے اندازے سے میری عمر ایک سال چار مہینے زیادہ لکھوادی جو بعد کو میٹرک کے سارٹیفکٹ میں جوں کی توں رہی اور مجھے یونیورسٹی کی ملازمت سے اس مدّت کے بقدر پہلے ریٹائرڈ ہونا پڑا۔

جامعہ ملیہ میں میری رہائش بچوں کی اقامت گاہ، خاکسار منزل میں رہی جس کے دو حصّے تھے ایک کے نگراں ارشادالحق صاحب تھے اور دوسرے حصّے کے جہاں نسبتاً زیادہ عمر کے بچے رکھے جاتے تھے، اختر حسن فاروقی صاحب۔ ارشادالحق صاحب، ہمارے انگریزی کے استاد بھی تھے اور اختر صاحب ڈرائنگ کے ٹیچر۔ ساتھی طلبہ میں پوربی یو.پی کے آفتاب، قائم گنج کے شفیق احمد اور قدوائی خاندان کے اخلاق الرحمٰن قدوائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میری اور آفتاب کی دوستی اور ہمہ وقت کی یک جائی پر اختر صاحب کو اکثر فقرہ کستے ہوئے سنا، حالاں کہ معاملہ صرف "افلاطونی محبت" تک محدود تھا۔ پانچوں وقت کی نماز کی پابندی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد لائن بنا کر سب طالب علم کچھ فاصلے پر پہاڑیوں سے گھرے ہوئے میدان کا رُخ کرتے جہاں جامعہ کالج کے استاد پروفیسر کیلاٹ عمر اور غذا دونوں سے غیر متناسب ڈنڈ بیٹھک اور دوڑ لگواتے۔ شام کو ہاکی کھیلنے کے لیے پھر اسی میدان میں آنا پڑتا تھا جہاں تک جسمانی تربیت اور ڈسپلن کا تعلق ہے اس میں کیلاٹ صاحب کے انہماک کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ ایک مالاباری عیسائی تھے جو نہ معلوم کس طرح ۱۹۲۲ء میں بھٹک کر جامعہ آگئے تھے۔ کنوارے تھے اور دمہ کے دائمی مریض۔ بایں ہمہ انھوں نے کالج میں درس دینے کے ساتھ جامعہ کے اسکول کے بچوں اور کالج کے طلبہ کی جسمانی حالت بہتر بنانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ دہلی کی کڑاکے کی سردی میں بھی وہ سب سے پہلے میدان میں پہنچتے اور ورزش اور کھیل دونوں میں بساط بھر حصّہ لیتے۔ ان کا کرایہ کا مکان قرولباغ کی پہاڑیوں کے کنارے پر تھا، جہاں سے ان کی ہمہ وقتی موجودگی کا احساس رہتا۔ ان کی شخصیت کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ علی گڑھ اور دہلی میں ایک عمر بتانے کے بعد بھی وہ بہت ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بول سکتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی لڑکا ڈنڈ لگاتے لگاتے اپنا سینہ زمین پر ٹیک دیتا یا دوڑ میں پھسڈی رہ جاتا تو اس کے چوتڑوں پر ہاتھ مار کر کہتے "تم گدّا (گدھا) الّو کا موافق (موافق)، یا "تم دوتی (دھوتی) والا"، حالاں کہ مکان پر وہ خود بنیان اور پاجامی

قسم کی دھوتی میں ملبوس رہتے تھے۔ انھوں نے ایک طرح سے کالج کی اعلیٰ درسیات کے علاوہ نونہالانِ وطن کی جسمانی تربیت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ جامعہ ملیہ کے نظم وضبط میں اس جسمانی ورزش اور تربیت کا خاص مقام تھا۔ قوم کے ننھے سپاہی کو ایک روشن ذہن اور سیرت کے ساتھ ایک مضبوط جسم کی بھی ضرورت تھی۔ آج جامعہ ملیہ کیلاٹ صاحب جیسے خدائی خدمت گار کو بالکل بھول گئی ہے۔ انھوں نے ایک پوری نسل کی ذہنی اور جسمانی تربیت کی ہے۔ جسمانی تربیت کی شہادت کے لئے مجھ پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ کیلاٹ صاحب کالج میں پڑھاتے تھے اور میں اسکول کا طالب علم تھا اس لئے ذہنی سطح پر انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کا ذکر ایک سینیئر جامعی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی زبانی سنیئے:

"ہمارے اساتذہ میں سب سے زیادہ لائق اور با فیض مسٹر کیلاٹ تھے جو سیاست اور تاریخ کے پروفیسر تھے۔ نصاب کے علاوہ وہ طالب علموں کی عام معلومات بڑھانے کے لئے روزانہ ایک لکچر دیتے تھے جو نہایت دلچسپ ہوتا تھا اس کا موضوع بدلتا رہتا تھا۔ کبھی مذہب اور اخلاق اور کبھی علم الانسان (انتھراپولوجی) طرزِ بیان شستہ اور برجستہ تھا انگریزی زبان پر بڑی قدرت تھی۔ بولتے بھی اچھی تھے اور لکھتے بھی اچھی تھے......تاریخ کے علاوہ انھیں انگریزی ادب سے بھی خاص لگاؤ تھا.... کیلاٹ صاحب کے لکچروں میں ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارے سامنے علم کی دنیا کے دروازے کھل گئے ہوں جو اب تک بند تھے۔

کیلاٹ صاحب کی وضع اور سیرت کے استاد آج ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ناپید ہیں...... کیلاٹ صاحب کا اوڑھنا بچھونا جامعہ تھی۔" (یادوں کی دنیا)

کیلاٹ صاحب کی آج کوئی یادگار جامعہ ملیہ میں نہیں لیکن ان کے شاگردوں کے دلوں میں موجود ہے ع

رفتید و لے نہ از دلِ ما

جامعہ ملیہ کے دارالاقامہ کی زندگی میں 'اسپارٹن' اسپرٹ کی خاص اہمیت تھی۔

ورزش کے میدان سے لوٹتے تو دو بڑے پاپے اور ایک پیالی دودھ کا ناشتہ ملتا۔ جی میں کہتا: قائم گنج کے مکھن، ملائی اور گھی والے مسعود کہاں آ کر پھنسے ہو! لیکن رفتہ رفتہ اس تزکیۂ نفس کا عادی ہوتا گیا۔ ناشتے کے بعد کتابیں لے کر اسکول چلے جاتے جس کی عمارت خاکسار منزل سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ یہیں شیخ الجامعہ کا صدر دفتر تھا۔

چھوٹے بچوں کے دارالاقامہ کے نگراں، ارشاد الحق صاحب ایک بااصول شخصیت کے انسان تھے۔ وہ بچوں سے ہمدردی بھی رکھتے تھے اور ڈسپلن پر نظر بھی۔ پابندیٔ نماز و اوقات پر اصرار کرتے۔ بچوں کو صفائی کی تاکید رہتی۔ صبح اٹھتے ہی ہر بچہ اپنا بستر خود ٹھیک کرتا۔ میرے دل میں ان کی بہت عزت تھی اور وہ میرا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں جب میں جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر ہو کر دکھلا پہنچا تو اس وقت وہ بستر مرگ پر تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں وہ چمک آگئی جو ایک استاد کو اپنے چہیتے شاگرد کو اعلیٰ منصب پر فائز دیکھ کر ہوتی ہے۔ میری توجہ جامعہ ملیہ کی زیر تعمیر جامع مسجد کی جانب خصوصی طور پر مبذول کرائی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ان کے یہاں ایک وقت کا کھانا ضرور کھاؤں۔ میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا کہ جلدی کیا ہے جب آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی تو کھالوں گا۔ لیکن اس کی نوبت کبھی نہیں آئی اور وہ اپنے مولا سے جا ملے۔

خاکسار منزل کے بڑے بچوں کے دارالاقامہ کے (جہاں میں چند سال کے بعد منتقل ہو گیا تھا) نگراں اختر حسن فاروقی صاحب تھے جنھوں نے لکھنؤ کے اسکول آف آرٹس میں تعلیم پائی تھی۔ وہ اپنے فن کے ایک کامیاب استاد تھے اور طالب علموں میں آرٹس سے دلچسپی پیدا کر دیتے تھے۔ حلیے کے اعتبار سے بھی وہ آرٹسٹ معلوم ہوتے تھے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ بیگم کو دو مختصر سے کمروں میں جو انھیں بحیثیت نگراں ملے ہوئے تھے پس پردہ رکھتے تھے، حالاں کہ ہم میں سے کسی کی عمر اس وقت چودہ برس سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔ بورڈنگ ہاؤس کے اس حصے میں اخلاق الرحمٰن قدوائی میرے روم فیلو تھے۔ اخلاق تحریر و تقریر کے اعتبار سے اوسط درجے کے طالب علم تھے، لیکن انسانی معاملات میں ان کی سوجھ بوجھ مجھ سے اچھی تھی۔ خود جوڑ توڑ سے فوڈ مانیٹر بن جاتے اور مجھے کہہ سن کر پریئر مانیٹر بنوا دیتے! انھیں

اپنی دنیا اور میری عاقبت کا بہت خیال رہتا تھا۔ میں اِس بار اِس انتخاب پر بہت زیادہ خوش نہیں تھا، خاص طور پر دہلی کے کڑاکے کے جاڑے میں فجر کی اذان کیلئے صبح صبح اٹھنا قیامت تھا۔ وضو کے لئے گرم پانی کا انتظام بس یوں ہی سا تھا۔ زیادہ تر ہمیں کنوئیں کے تازہ پانی پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ان حالات کے تحت اکثر ایمان متزلزل ہو جاتا۔ ایک صبح میری آنکھ زرا دیر سے کھلی۔ پَو پھٹ چکی تھی۔ اس لئے تڑپ کر اٹھا اور بغیر وضو کئے برآمدے میں کھڑے ہو کر اذان دینا شروع کر دی۔ اختر صاحب اس وقت تک اُٹھ چکے تھے اور گرم پانی سے وضو کر کے اذان کا انتظار کر رہے تھے۔ جونہی میں نے اللہ اکبر کہا وہ اپنے کمرے سے برآمدے میں برآمد ہوئے۔ ایک نظر میں بھانپ لیا کہ میں بغیر وضو کے اذان "ٹرخا" رہا ہوں۔ چپکے سے پیچھے آ کر انھوں نے عین اذان میں میرا کان پکڑ لیا۔ اذان یک لخت رُک گئی۔ بولے "ہَٹ نالائق! پر پر ماسٹر ہوا اور بغیر وضو کے اذان دیتے ہو"۔ غالباً میری اس ترکیب کے بارے میں وہ کئی روز سے شبہ کر رہے تھے اور موقع کی تاک میں تھے۔

میں نے اپنے جُرم کا فوراً اقرار کر لیا اور اس کے ساتھ یہ اعتذار کہ " ماسں صاحب! (ماسٹر صاحب) اس کڑاکے کی سردی میں بغیر گرم پانی کے وضو کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ میں نے خدا کو حاضر ناظر کر لیا تھا"، لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ مجھے طلبہ کے سامنے رسوا کیا گیا۔ البتہ اس واقعہ کا یہ مثبت نتیجہ ضرور نکلا کہ دوسرے روز سے فجر کی نماز کے لئے طالب علموں کو گرم پانی ملنے لگا۔ میں نے اپنی عاقبت خراب کر کے اپنے ساتھیوں کی دُنیا اچھی کر دی!

اِسی زمانے کا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ تعلیمی سال کے شروع میں طالب علم اپنے گھروں سے آتے تو از قسم حلوہ وغیرہ ضرور ساتھ لاتے، جسے وہ سینت سینت کر رکھتے تاکہ زیادہ دنوں تک لطف اندوز ہو سکیں۔ اخلاق الرحمٰن نے سونگھ لیا کہ بعض متموّل گھرانوں کے طالب علم اس سال حلوہ اور خشک میوہ جات قسم کی چیزیں کافی مقدار میں لائے ہیں اور اپنے خاص خاص دوستوں کے علاوہ کسی کو اِن کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔ مجھ سے بولے کہ فجر کی نماز میں جس دن اختر صاحب نہ آئیں اور تم امامت کرو اس روز سورت طویل کر دینا اور رکوع و سجدہ میں خشوع خضوع بڑھا دینا۔ چنانچہ ایک روز یہی ہوا اور ایسا ہی کیا گیا۔ اُدھر اخلاق چند باکمالوں کے ساتھ پچھلی صف سے نیت توڑ کر دھیرے سے کھسک لئے اور کمروں میں جا کر غارت گری شروع

کردی۔ جب کام مکمل کر لیا تو مالِ یغما کو چھپا کر پچھلی صف میں آ کر پھر کھڑے ہو گئے اور کھنکھار کے ذریعے اپنی کامرانی کا اشارہ کیا۔ پھر سلام پھیر کر دعا مانگی گئی "اے میرے رب! تو سب کا رزاق ہے" اس کے تھوڑے ہی دیر بعد ایک طرف کہرام تھا اور دوسری طرف 'فتوحات' کے شادیانے۔ شکایت ہوئی لیکن اس سے قبل 'فتوح'، خلوئے معدہ کو پُر کر چکی تھیں۔

اسکول کے اساتذہ میں سب سے بارعب شخصیت برکت علی صاحب کی تھی جو عام حاضری بھی لیتے تھے اور ریاضی بھی پڑھاتے تھے۔ بڑے رکھ رکھاؤ کے اُستاد تھے لیکن چوں کہ ساری عمر عالمِ تجرد میں گذری تھی اس لیے طبیعت میں قدرے سختی تھی۔ وہ اردو خالص کھڑی بولی کے (بجنور سے تعلق تھا) لہجہ میں بولتے تھے یعنی 'اُس کو'، 'کو' واؤ معروف سے اور فعل مضارع کے صیغے کو "تا" کے بغیر جیسے کرے ہے جائے ہے وغیرہ۔ ہم سب ان کے پڑھانے اور سمجھانے کے معترف تھے لیکن ان کے قریب آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ کچھ آتش اور آتش پرست کا سا رشتہ تھا۔ اُن کی ہنسی سے بھی ڈر لگتا تھا اور زکام سے بھی، معلوم نہیں دونوں کس وقت بگڑ جائیں۔

اُن کے برعکس ہمارے عربی اور دینیات کے استاد مولوی سعد انصاری صاحب طلبہ میں بہت مقبول تھے۔ وہ اپنی ناراضگی زیادہ سے زیادہ " نالائق " سے ظاہر کرتے۔ مصر ہو آئے تھے اور وہاں کے قومی ترانے "مصرُ عزیزۃٌ لی وطن" سے بہت متاثر تھے۔ ایک لفظ کی تحریف کے بعد اُنھوں نے اسے ہندی ترانے میں بدل دیا تھا۔ "ھندُ عزیزۃٌ لی وطن"۔ کلاس میں ہم سب سے اسے گانے کے لیے کہتے۔

اردو کے اُستاد سعید انصاری صاحب تھے جو میرے جامعہ ملیہ وائس چانسلر ہو کر آنے تک حیات تھے۔ اس وقت وہ جامعہ کی جامع مسجد کی تعمیر کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے اس کی تعمیر میں دل و جان سے مصروف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسجد کا سارا فرش سنگِ مرمر کا ہو۔ میں نے لاکھ اقبال کے اس شعر کا حوالہ دیا ہ،

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

لیکن وہ اپنے منصوبہ پر اڑے رہے۔ آخر میں جب روپے کی کمی پڑ گئی تو میں نے سعودی سفارت خانے

سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کیا اور وہاں سے تین لاکھ کی نقد رقم ملنے کے بعد اس کام کی تکمیل ہوئی۔ یہ مسجد حیدرآباد کے مشہور آرکیٹیکٹ فیاض الدین صاحب کے ذہن کا نقشہ ہے اور اس کا مادی وجود سعید انصاری صاحب کی لگن اور ریاضت کا پھل ہے۔

جامعہ ملیہ کے اسکول میں، مَیں نے ۱۹۲۷ تا ۱۹۳۳ء تعلیم حاصل کی۔ اس چھ سال کے قیام نے میری کایا ہی بدل دی۔ میں قائم گنج سے ایک کندۂ ناتراش آیا تھا جس میں "ا، ۱" کی صفت کے علاوہ اور خصوصیت نہیں تھی۔ جامعہ ملیہ کے ماحول میں مجھے قومی احساسات اور تصورات کا پہلی بار علم ہوا۔ ساری فضا قومیت اور ایثار سے سرشار تھی۔ ہر دفتر میں اقبال کا یہ شعر کتبے کی شکل میں آویزاں پایا ؎

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اور مولانا حالی کی یہ رباعی:

دنیائے دَنی کو نقشِ فانی سمجھو　　　ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا　　　ہر لمحے کو عمرِ جاودانی سمجھو

یہیں میں حالی اور اقبال کی عظمت سے بھی آشنا ہوا۔ فکرِ اقبال، جو تقسیم ملک کے بعد عرصہ تک 'فکرِ ممنوعہ' کے طور پر عتاب کی نظروں سے دیکھی گئی ہے، اُس وقت اس کا غلغلہ تھا۔ جامعہ کے طلبہ کے سامنے ایک اچھے ہندوستانی اور سچے مسلمان کا مسلک تھا اور بتایا جاتا تھا کہ دونوں میں تضاد نہیں ہے۔ یہیں میں نے غالب کی فرضی تصویر اور اصلی دیدہ زیب دیوان کو دیکھا جو شرکت کاویانی، برلن نے شائع کیا تھا۔ جامعہ ہی کی چہار دیواری میں میں نے ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور گاندھی جی کو پہلی بار دیکھا۔ گاندھی جی اپنے پوتے کی وفات پر آئے تھے جسے انھوں نے جامعہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے پوتے کے انتقال کا ذکر نہایت رقّت آمیز لہجہ میں کیا جس سے ہم سب بہت متاثر ہوئے لیکن جب انھوں نے مِیں مِیں کرنا شروع کیا (گجراتی مَیں کا تلفظ مِیں کرتے ہیں) تو مجھے اُن پر رحم آنے لگا۔ بُرا ہو اردو والوں کے اس احساسِ تفوق کا! انھیں کے ایما سے بعد کو ان کے صاحبزادے دیوداس گاندھی نے جامعہ میں کئی سال تک قیام کیا اور ہم لوگوں کو ہندی پڑھانے کے علاوہ تکلی اور چرخہ

کاتنے کا فن سکھایا۔ ہاتھ کے کام کی تعلیم میں اہمیت کو یہیں جانا۔ ماسٹر عبدالحئی صاحب سے کارپنیٹری سیکھی اور رستم قلم محمد علی فرخ آبادی سے خوشخطی۔ باغبانی اور زراعت کے فن کی شُد بُد یہیں ہوئی۔ جامعہ میں سب کھدّر پوش تھے کیا اُستاد کیا طلبہ۔ کئی بار ہمارے ساتھیوں نے ولایتی کپڑوں کے ڈھیر لگا کر اسے نذرِ آتش کیا تھا۔ تیرہ اپریل کو جلیانوالہ باغ کے خونی حادثے کی یاد میں دن بھر کا سارا کام ہم لوگ اپنے ہاتھوں سے کرتے، جس میں بیت الخلاء کی صفائی بھی ہوتی۔ اردو زبان و ادب کا چسکا بھی جامعہ کی دین ہے۔ ہماری انگریزی کی استعداد تو واجبی رہی لیکن اُردو میں اسی زمانے میں چھوٹے موٹے ادیب بن گئے۔

اسی زمانے میں مجھے پہلی بار کشمیر جانے کا موقع ملا۔ یہ اس اعتبار سے بھی یادگار ہے کہ اسی سفر میں علّامہ اقبال سے اُن کے درِ دولت پر ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جامعہ ملّیہ کے کالج کے استاد سید نذیر نیازی صاحب نے جو علامہ اقبال کے ہموطن اور عقیدت مند تھے، ڈھائی مہینے کی طویل رخصت اس غرض سے لی کہ وہ کشمیر جا کر وہاں علامہ کے انگریزی خطبات کا اردو میں ترجمہ کریں گے۔ اس کا وعدہ وہ بہت پہلے کر بیٹھے تھے، لیکن دہلی کی مصروفیات میں اس کام کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ اس کا ذکر جب انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے کیا تو انھوں نے کہا کہ "آجکل مسعود کی صحت ٹھیک نہیں رہتی ہے بہت دُبلے ہو گئے ہیں انھیں بھی اپنے ہمراہ لیتے جایئے۔ اُن کا خرچ میں برداشت کروں گا"۔ کشمیر جاتے ہوئے ہم لوگ راستے میں دو روز کے لیے لاہور ٹھہرے۔ ظاہر ہے نذیر نیازی صاحب علامہ اقبال سے بغیر ملے کیوں کر آگے بڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن سہ پہر کو علامہ اقبال کی کوٹھی پر گئے جو میکلوروڈ پر واقع تھی۔ علامہ کوٹھی کے باہر مونڈھے پر پاؤں سمیٹے ہوئے قمیص اور شلوار زیب تن کئے تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ نیازی صاحب کو پہچانتے ہی انھوں نے کہا "آؤ جی نیازی جی! کہو کیا حال چال ہیں"؟ نیازی صاحب نہایت نیازمندی کے ساتھ ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے علامہ سے بولے: "یہ مسعود حسین ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھتیجے۔ صحت کی تلاش میں میرے ساتھ کشمیر جا رہے ہیں۔ آپ کے پسند ہیں اور انھیں آپ کا سارا اردو کلام ازبر ہے"۔ علامہ ایک مشفقانہ نظر ڈالتے مجھے

مجھ سے بولے "کشمیر جا کر ایک شفتالو روز کھاؤ، سرخ ہو جاؤ گے"! اتنا کہہ کر وہ نیازی صاحب سے محو گفتگو ہو گئے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا دونوں کی گفتگو کا محور علامہ کے خطبات تھے۔ انھوں نے اس بات پر طمانیت کا اظہار کیا کہ اب نیازی صاحب کشمیر کے دوران قیام میں انھیں ضرور مکمل کر لیں گے لیکن کشمیر میں ڈھائی ماہ قیام کرنے کے بعد جب لوٹے تو ترجمہ چند صفحات سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ انھوں نے اب مصلحت اسی میں سمجھی (میرے اصرار کے باوجود) کہ علامہ سے ملاقات نہ کی جائے۔ علامہ سے اُنھوں نے اپنا وعدہ اُن کے انتقال کے بیس برس بعد پورا کیا!

دہلی پہنچ کر لوگوں نے جب علامہ اقبال کے بارے میں میرے تاثرات معلوم کرنے چاہے تو میں نے یہی کہا کہ میرے ذہن میں جو شاعر کا تصور تھا میں نے اُنھیں اس سے مختلف پایا۔ باریک ترشی مونچھیں، کُرو کٹ بال، بھاری بھر کم ڈیل ڈول! مجھے ان پر پنجابی پہلوان ہونے کا گمان زیادہ گزرا۔ میرے ذہن میں اردو شاعر کی نستعلیق شخصیت کا جو تصور تھا وہ یک لخت پاش پاش ہو گیا اور میری ذہنی کیفیت کچھ اس طرح کی ہوئی ع

تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی

میرا کشمیر کا یہ سفر کئی لحاظ سے کامیاب رہا۔ وہیں میں نے پہلا شعر کہا۔ ڈھائی مہینے میں وہاں کی خوشگوار آب و ہوا اور فواکہات نے مجھے سرخ و سفید بنا دیا۔ ہمارا وہاں قیام ستمبر تا وسط دسمبر ۳۲ء رہا۔ اس لیے وہاں کے خزاں کی رنگینی بھی دیکھی اور سیب، ناشپاتی اور خشک میوہ جات کی بہتات بھی۔ قیام نذیر نیازی صاحب کے رشتے کے بھائی کے یہاں وبند، پر سرکاری کوارٹرس میں تھا۔ روز شام کو ٹہلتے ہوئے لال چوک پہنچ جاتے جہاں سے سیب، خشک میوہ اور خاص طور پر علامہ اقبال کے تجویز کردہ شفتالو خرید کر لاتا۔ نذیر نیازی صاحب کی بھاوج کشمیری کرم کا ساگ بہت اچھا پکاتی تھیں جو چاولوں کے ساتھ بڑا مزہ دیتا تھا۔ اس مستقر سے وادی کے دوسرے دلچسپ مقامات کے دھاوے مارے جاتے گلمرگ اور کھلن مرگ کے دھاوے میں سیالکوٹ کے صہبائی پال بھی ساتھ تھے۔ وہ وہاں کسی مقدمے کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے لیکن شاعر کی حیثیت سے زیادہ معروف تھے۔ ان کی اور نذیر نیازی صاحب کی ادبی بحثیں ہوتیں۔ میرے لیے تفریح کا سب

دلچسپ مشغلہ دریائے جہلم کے کنارے کا 'بند' تھا۔ اُس زمانے میں ولایتی اسباب سے بھری ہوئی دوکانوں اور منتخب سیاحین کے خرید و فروخت کا بازار ہونے کی وجہ سے یہ بہت بارونق تھا۔ جہاں آج سرکاری ایمپوریم ہے، اُس میں ریزیڈنٹ کی رہائش گاہ اور دفاتر تھے۔ دریا کے پار پبلک لائبریری تھی جہاں شکارے میں پار کر کے جاتا اور وہاں سے شرر کی ناولیں پڑھنے کے لیے لاتا۔ میں نے جس قدر ناولیں اُس زمانے میں پڑھی ہیں بعد کو سب ملا کر بھی اتنی نہیں پڑھیں۔

پاس میں ریزیڈنٹ کے میر منشی سراج الدین صاحب کا مکان تھا، جہاں کبھی کبھی چلا جاتا تھا وہ علامہ اقبال کے بڑے معتقد تھے۔ ان کے مکتوب الیہ بھی رہے ہیں۔ وہ بڑے صاحب علم اور سخن فہم تھے۔ ڈاکٹر اقبال نے ایک خط میں انھیں لکھا تھا "آپ ہندوستان کے اُن چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے اور اگر نیچر ذرا سی فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ شعرا میں شمار کرتی۔"

لیکن میری دلچسپی کا مرکز وہ اِس لیے بنے کہ وہ ایک چابکدست جلد ساز تھے اور اپنے فرصت کے اوقات میں اپنی کتابوں کی نہایت خوبصورت جلدیں باندھنے میں معروف رہتے۔ اُن کے پاس جلد سازی کا مکمل ساز و سامان تھا۔ باتیں کرتے جاتے اور اپنے ہاتھ کے کام میں مصروف رہتے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بھی دیکھنے کے لائق تھا۔ ہر چند وہ اپنی کُتب مُستعار دینے کے قائل نہیں تھے لیکن اس کو دیکھ کر ہی خوش ہوتا اور جی میں منصوبہ باندھتا کہ علم سے ہر دلچسپی رکھنے والے کو انھیں کی طرح جلد ساز ہونا چاہیے۔

یہ مہاراجہ کے استبداد کا زمانہ تھا۔ پوری وادی پر سیاسی سکوت چھایا ہوا تھا۔ البتہ کبھی کبھی لال چوک میں جھنڈیاں اڑتی نظر آجاتی تھیں۔

ہر طرف چہل پہل رہتی صرف مظلوم کشمیری منظر سے غائب رہتا۔

تیسرا باب

"بنگلہ دیس، اک رنگ بھون" (ددیم)

۱۹۳۳ء کا سال میری زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سال میرے چھوٹے چچا، ڈاکٹر محمود حسین خاں، جرمنی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے اور تلاشِ روزگار میں اپنے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے یہاں حیدرآباد میں مقیم ہوئے۔ اتفاق سے دہلی سے بڑے چچا، ذاکر میاں، بڑے بھائی امتیاز حسین خاں اور میں بھی گرما کی تعطیلات گزارنے کے لیۓ وہاں پہنچے۔ یہ ایک طرح کا عرصے کے بعد خاندان "ملن" تھا۔ محمود میاں ریاست حیدرآباد کے محکمۂ تعلیم میں کسی اسامی کے لیۓ کوشاں تھے اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں بھی درخواست دے رکھی تھی۔ حسنِ اتفاق ایک روز ڈھاکے سے اطلاع ملی کہ وہاں یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں اُن کا انتخاب بحیثیت ریڈر ہو گیا ہے۔ احساسِ دوری کے باوجود فوراً وہاں کے لیۓ پابہ رکاب ہو گئے، شرط یہ لگا دی کہ مسعود کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اس وقت تک اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ دوری اور تنہائی دونوں کو بہ یک وقت برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سب بزرگوں نے اُن کی ہاں میں ہاں کی۔ بس پھر کیا تھا بے سروسامانی کی حالت میں اُن کے ساتھ طویل سفر پر روانہ کر دیا گیا۔ اس طرح جامعہ سے میرا چھ سال کا تعلق ختم ہو گیا۔ کلکتے اور اس کے بعد دریائی بندرگاہ گوالندو تک کا سفر ہم نے ریل سے طے کیا۔ اس دوران محمود میاں کے "مجھن خانی، جلال کا مظاہرہ دیکھا جب انھوں نے ایک قلی کے حجت کرنے پر

اپنی چھتری اس کے سر پر توڑ دی۔ وہ بہت باغ وبہار انسان تھے۔ ان کا قہقہہ مشہور تھا، لیکن غصے میں بے آپے ہو جاتے۔ قائم گنج کی بوڑھیوں کا ایک محاورہ اُن جیسوں ہی کے لیے تھا، 'پٹھان کا پوت، ذرا میں ولی ذرا میں بھوت!'

گوالندو سے اسٹیمر پکڑا جس نے چند گھنٹے کے دریائی سفر کے بعد ہمیں بندرگاہ نرائن گنج پہنچا دیا۔ وہاں سے پھر ریل لی اور گھنٹہ بھر میں ڈھاکہ پہنچ گئے۔ یونیورسٹی کیمپس کے اندر نیل کھیت روڈ پر پہلے سے ایک مکان الاٹ ہو چکا تھا۔ یہ سلیم اللہ مسلم ہال کی پشت پر تھا۔ آس پاس یونیورسٹی کے اساتذہ کی رہائش کے لیے دوسرے چھوٹے بڑے مکان بنے ہوئے تھے۔ ہمارے ایک پڑوسی رام پور کے فدا علی خاں تھے، جو شعبۂ فارسی و اردو کے صدر تھے۔ تھوڑے فاصلے پر 'شیر شاہ' کے مشہور مصنف قانون گو صاحب کا مکان تھا۔ وہ بڑے محنتی انسان تھے۔ برآمدے میں ایک فارسی داں منشی صبح تا شام بیٹھا رہتا جس سے استفادہ کرتے رہتے۔ صدرِ شعبۂ انگریزی حسن صاحب کی کوٹھی تھی۔ وہ انگریزوں کے انداز میں نہایت ٹیپ ٹاپ سے رہتے تھے۔ یہ تو بعد کو علی گڑھ پہنچ کر راز کھلا کہ انگریزی کا پروفیسر بہ حلیۂ اردو بھی پایا جاتا ہے۔

ڈھاکہ پہنچ کر اب میرے داخلے کی فکر ہوئی۔ میں نے جامعہ سے آٹھواں درجہ پاس کیا تھا، اردو ذریعۂ تعلیم سے۔ ڈھاکے میں ہر جگہ انگریزی میڈیم تھا۔ تلاشِ بسیار کے بعد مجھے آرمنی ٹولہ گورنمنٹ ہائی اسکول کی نویں کلاس میں داخلہ مل گیا۔ یہ اسکول ایک ٹریننگ کالج سے ملحق تھا اس لیے دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر، مسٹر بسواس، ایک بنگالی عیسائی تھے۔ اسکول کے دیگر تمام اساتذہ بھی بنگالی ہندو تھے۔ صرف اردو فارسی کے استاد عندلیب شادانی صاحب کے ایک مسلمان شاگرد تھے۔ وہ بھی بنگالی نژاد تھے اور اسی لہجہ میں اردو بولتے تھے۔ اردو پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد صرف تین تھی۔ ایک 'میں'، ایک نورالدین اور ایک ڈھاکہ میں بسے ہوئے ایرانی خاندان کے فرد، جن کا نام یاد نہیں رہا۔ نورالدین کے والد کا تعلق بہار سے تھا۔ اس لیے ان کے گھرانے میں ایک اردو نما زبان بولی جاتی تھی۔ یوں تو ڈھاکہ سر تا سر بنگالی

کا علاقہ ہے لیکن ڈھاکے کے نوابین کے خاندانوں اور اسلام پورہ جیسے کچھ محلّوں میں بنگالی لہجہ میں اردو کا رواج تھا۔ یہاں کے لوگوں کو دونوں زبانوں کی واقفیت تھی لیکن وہ اپنی مادری زبان اردو کو ہی سمجھتے تھے۔

نوابینِ ڈھاکہ کے ارد گرد اہلِ اردو کا جو طبقہ تھا اس میں سربھی تھے۔ طبیب بھی تھے اور اہلِ علم بھی۔ ڈھاکہ ہی میں بیٹھ کر مرزا آغاجان طپش دہلوی نے وہاں کے شعراء کو اردو کے دہلوی محاورے سے متعارف کرانے کے لیے ۱۷۹۲ء میں "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان" تصنیف کی۔ میں جب وہاں تھا تو حکیم حبیب الرحمٰن نہ صرف ڈھاکے کے مشہور طبیب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، اہلِ علم اور شاعر بھی تھے۔ ان کے محمود میاں سے گہرے تعلقات تھے۔ مجھ پر بڑی شفقت رکھتے تھے۔ نواب خاندان کے کئی نوجوان مختلف اوقات میں میرے کلاس یا کالج فیلو بھی رہے۔ ان میں سر ناظم الدین کے بھتیجے، شہاب الدین صاحب کے دو فرزند اب تک حافظے کے نہاں خانے میں محفوظ ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کالج میں مجھ سے ایک سال سینئر نواب خاندان کے قیّم تھے، جو بہت اچھے طالب علم اور اسپورٹس مین تھے بعد میں ترقی کرکے وہ چین میں پاکستان کے سفیر ہو گئے تھے۔ یہ سب لوگ اردو والے تھے۔ البتہ مجھ سے بات کرتے وقت تھوڑی سی جھجک محسوس کرتے، دہلی اور لکھنؤ کے علاقے کی اردو کی یہاں اس قدر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ حضرات بنگالی بھی فرّاٹے کے ساتھ بولتے تھے لیکن اردو کو اپنی مادری زبان تسلیم کرتے تھے، اس لیے تعلیمی اداروں میں اُسے مادری زبان کی حیثیت سے پڑھتے اور گھروں میں اسی زبان میں بات چیت کرتے۔ بنگال میں مرشدآباد اور ڈھاکہ اُردو کے دو جزیرے تھے جو بنگالی کے بحرِ ذخّار میں، میرے زمانے تک اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے تھے۔

میرے اسکول کے ساتھیوں میں دو طالب علموں نے اپنے اپنے طور پر امتیاز حاصل کیا۔ ایک نورالدّین جو اپنے والد کی طرح بعد کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے رجسٹرار ہوئے۔ وہ بڑے شرمیلے انسان تھے۔ اس لیے مجھ سے کھُلنے میں انھیں خاصی دیر لگی۔ لیکن جب کھُل گئے تو میرے ساتھ گرمیوں کی تعطیل میں قائم گنج اور دہلی تک آئے اور پھر میری تحریک پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آکر بی اے میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ نے انھیں زیادہ دنوں تک انگیز نہیں کیا، اس لیے

بہت جلد چھوڑ کر واپس ڈھاکہ چلے گئے۔ دوسرے ساتھی نوَرانرائن چودھری کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ٹھیٹھ بنگالی تھے، لیکن "ہمارا باپ آیا، ہمارا ماں آیا، ہمارا بہن آیا، شب آیا" قسم کی ہندوستانی میں گفتگو کر لیتے تھے۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں مجسمہ سازی اور سنگ تراشی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ میں اکثر ان کے یہاں جاتا تھا۔ میری فرمائش پر اُنھوں نے مجھے اِس زمانے کے گرافون ریکارڈوں پر بنے ہوئے کتّے کی تصویر کا مجسمہ تراش کر تحفہ کے طور پر دیا تھا جو اب تک میری میز پر پیپر ویٹ کی شکل میں رکھا رہتا ہے۔ عرصہ کے بعد جب وہ شہرت یافتہ شنکو چودھری کے نام سے دہلی میں مقیم تھے اور ایک روز مجھ سے ملنے جامعہ ملیہ آئے تو میں نے اُن کا تراشا ہوا کتّا انھیں دکھایا۔ خیال تھا کہ وہ اسے اپنے ایّام جاہلیت کی یادگار سمجھ کر عزیز رکھیں گے، لیکن اُنھوں نے زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی، اِس لیے میری نیت 'جو تحفہ کے طور پر انھیں واپس دینے کی تھی'، بدل گئی۔ اور وہ میرے پاس ہی رہ گیا ہے۔ شنکو مجسمہ سازوں کے حلقوں میں آج ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ہائی اسکول کے بعد وہ برسوں شانتی نکیتن سے منسلک رہے اور وہیں انھوں نے پہلے نام کمایا۔ اب للت کلا اکیڈمی کے صدر ہیں۔

ڈھاکہ میرے لیے ایک اجنبی ماحول تھا۔ اردو بولنے کے بہت کم مواقع ملتے تھے۔ عمر ایسی نہ تھی کہ میں اپنے تکلّمی ذریعۂ ابلاغ کو میر صاحب کی طرح بند کر دوں۔ ایک طرح سے غالبؔ اور اقبالؔ کے ماحول سے نکل کر میں ٹیگورؔ اور نذرلؔ کے ماحول میں آ گیا تھا۔ اسکول میں انھیں کے گانے اور ترانے گائے جاتے، رابندر سنگیت کا ہر طرف چرچا تھا۔ میں اس وقت تک بنگالی سے اچھی طرح واقف نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب اس کے گیت سنتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ بغیر معنوں کے کوئی چیز میرے خون میں اُترتی جا رہی ہے۔ انھیں دنوں اردو کے شعر میری زبان سے پھوٹنے لگے۔ اب جو اس زمانے کی چند غزلوں کو دیکھتا ہوں تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ وارداتِ قلبیہ ہیں یا روایتِ شعری کے زائیدہ:

میں ہوں اقرار سراپا مجھے پھر کیا انکار
وہ ہیں انکار سراپا انھیں پھر کیا اقرار

جہاں میں کچھ بھی بنو تم مگر خیال رہے
مرے لیے تو وہی ہو جو مجھ کو یاد رہو

بیٹھنا وہ ناز سے اور دیکھنا سوئے شفق
چاہتے ہیں وہ بھلانا ہم کو اِس انداز سے

میرا خیال ہے کہ اگر میں عمر کے اس حصّے میں ڈھاکہ منتقل نہ ہو گیا ہوتا تو میری باقاعدہ شاعری کا آغاز بہت پہلے ہو جاتا۔ بعد کو اس کی تحریک علی گڑھ پہنچ کر ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔

میٹرک کا امتحان مَیں توقع سے زیادہ امتیازات سے پاس ہوا۔ اردو اور فارسی میں پچھتّر فیصد سے زائد نمبر پائے اور ڈھاکہ بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے وظیفہ مِلا اور ڈھاکے کے ممتاز گورنمنٹ اِنٹر کالج میں داخلہ لیا۔ اس کی عمارت رَمنہ کے علاقے میں رَیس کورس کے سبزہ زار سے ملحق تھی۔ یہ دراصل تقسیم بنگال کے بعد مشرقی بنگال کے گورنر کی رہائش کے لیے تعمیر ہوئی تھی۔ مشہور تھا کہ اس میں آکر لڑکوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں اس کے پرنسپل فخرالدین صاحب تھے جن کا تعلق بہار سے تھا اور جو انگریزی لہجے میں اردو بولتے تھے حالانکہ وہ سر راس مسعود کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی رہ چکے تھے اور انھیں کی حمایت میں سر راس نے وائس چانسلری سے استعفےٰ دیا تھا۔ اساتذہ سب کے سب بنگالی تھے۔ اردو فارسی کے استاد، ہمارے اسکول کے استاد سے بھی گئے گذرے تھے، عبارت اور لہجہ دونوں اعتبار سے۔ البتہ انگریزی کے ایک استاد کا نقش اب تک حافظے میں محفوظ ہے۔ وہ شیکسپیئر کا ڈرامہ Tempest پڑھاتے تھے اور اس کے کردار Prospero کی مانند لہراتی ہوئی داڑھی کے ساتھ ڈرامائی منظر کشی کر دیتے تھے۔ ساری کلاس اُنھیں Prospero کہتی تھی۔ انگریزی فارسی کے علاوہ میرے پاس معاشیات اور تاریخ کے مضامین تھے۔ میں معاشی انسان کبھی نہیں رہا۔ البتہ ادب اور تاریخ سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ بالآخر بی۔ اے۔ میں جا کر یہی میرے دو مضمون رہ گئے۔

انٹرمیڈیٹ میں میرا عزم فرسٹ پوزیشن پانے کا تھا۔ اب میری انگریزی بھی اچھی ہو گئی تھی۔ تعلیمی سال کے شروع سے میں نے نہایت منظّم اور مرتّب طور پر پڑھائی شروع کر دی۔ دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ میری قلعہ بندی پر بعض اوقات محمود میاں ناراض تک ہو جاتے۔ بالآخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال میں امتحان کے قریب میں شدید قسم کے خلل اعصاب کا شکار ہو گیا۔ ریڑھ کی ہڈی سے سر دلہر اٹھتی ہوئی حرام مغز تک جاتی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے دل بند ہونے جا رہا ہے۔ طبّی مشورہ کیا تو ضعفِ اعصاب کا مرض (Neurasthenia) تجویز ہوا۔ بے شمار ٹانک پیے لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ محمود میاں کی رائے ہوئی کہ امتحان میں نہ بیٹھوں۔ میرا اصرار تھا کہ مجھے بیٹھنا ہے۔ بالآخر بیٹھا، بیمار کی طرح لیٹ کر امتحان دیا، فرسٹ ڈویژن تو پایا لیکن پوزیشن نہ مل سکی۔ میں اب ڈھاکے سے سخت دل برداشتہ تھا۔ چاہتا تھا کہ فوراً چھوڑ دوں۔ محمود میاں نے بہت روکا لیکن مَیں جوں ہی سفر کے قابل ہوا، دہلی کے لیے روانہ ہو گیا، اور وہاں سے ایک ملازم کے ساتھ مسوری چلا گیا جس کا خرچہ مجھے میرے چھوٹے چچا نے دیا تھا۔ اب میں اُبلا شبلا کھاتا، پابندی سے صبح و شام ٹہلتا اور دواؤں کا پٹارا میرے ساتھ رہتا۔ رفتہ رفتہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر میں نے اپنے مرض پر قابو پا لیا اور اپنا تعلیمی سال نہیں ضائع ہونے دیا۔ میرے اس کمال کا ذکر بعد کو ذاکر میاں اکثر لوگوں سے کیا کرتے تھے۔ طبیعت کی بحالی کے باوجود ضعفِ اعصاب کے دورے عرصے تک پڑتے رہے۔ اُس وقت میرا دل بیٹھنے لگتا اور موت کا اندیشہ رگِ جاں کے قریب ہوتا۔ یہ سلسلہ بی اے کی تعلیم کے دوران تک چلتا رہا۔

اِس بیماری کے علاج کے سلسلے میں میرا سابقہ ڈھاکہ اور دہلی میں بہت سے ڈاکٹروں سے پڑا۔ ذاکر میاں کے مشورے سے میں نے یونانی علاج بھی کیا۔ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم، جن کی شفقت کا ایک زمانہ معترف تھا، مجھے شریف منزل (بلیماران) حکیم محمد احمد خاں کے مطب لے گئے۔ حکیم صاحب، حکیم اجمل خاں مرحوم کے بھتیجے تھے اور اُن کے بعد، اُن کی حذاقت کا دہلی میں عام شہرہ تھا۔ پہنچ کر دیکھا کہ حکیم صاحب گاؤ تکیہ لگائے مسند پر تشریف فرما ہیں۔ سامنے فرش پر مریض ایک حلقے کی شکل میں بلائے جانے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ حکیم صاحب

کے بائیں بازو پر ایک بڑا سا اُگالدان رکھا ہوا ہے جس میں وہ ہر دو چار منٹ کے بعد پان کی پیک 'پڑچ' سے تھوک دیتے ہیں۔ منہ' پان سے اس قدر بھرا ہوا ہے کہ اردو' فارسی بن کر نکلتی ہے۔ دائیں جانب پر ایک چابکدست نسخہ نویس 'یک زانو' ان کے 'فرمودات' کا منتظر بیٹھا ہے۔ میرا نمبر آیا ہے تو انھوں نے دو انگلیاں میری نبض پر رکھیں اور حال پوچھے بغیر' دو بار' پڑچ پڑچ' کرکے نسخہ نویس سے کچھ بُدبُدائے۔ لیجئے' نسخہ تیار تھا۔ شفیق صاحب نے لپک کر نسخہ لے لیا اور باہر نکل کر دوا خریدنے کے لیۓ سامنے 'ہندوستانی دواخانہ' پہنچے۔ ایک شربت تھا' ایک معجون تھی' مغلّظ جواہر دالی اور آخر میں ایک اور دوا' جس کے بارے میں شفیق صاحب کا اصرار تھا کہ یہ رہنے دی جائے۔ میں جس قدر اس کے بارے میں دریافت کرتا وہ ٹالنے کی کوشش کرتے۔ میں نے بحث بھی کی کہ آدھے نسخے سے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ کچھ شرماتے جاتے مگر خریدنے پر تیار نہ ہوئے۔ بعد کو میں نے معلوم ہی کر لیا' یہ عضوِ خاص کے لیۓ 'طلا' تھا۔ گویا حکیم صاحب نے میرا مرض 'جلق' تجویز کیا تھا۔ اس کے بعد سے طبِ یونانی سے میرا اعتقاد بالکل اُٹھ گیا۔

ڈھاکے میں پڑھنے سے جب تھک جاتا تو دھان کے لہلاتے کھیتوں میں گھومنے نکل جاتا۔ ڈوبتے ہوئے سورج اور اس کی کرنوں سے رنگی ہوئی بدلیوں کو گھنٹوں بیٹھا دیکھتا رہتا۔ میری عمر اُس وقت سترہ برس کی تھی وہ عمر جس میں کسی شے کی ہر شے میں تلاش ہوتی ہے

ع یعنی ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

بنگال کے حسنِ ملیح یا زلفِ سیاہ پر کہیں نظر پڑ جاتی تو اسی سے لطف اندوز ہوتا' تسکین کی عدم دستیابی میں ذوقِ نظر اور بڑھ جاتا۔ میرا ردیف 'روپ بنگال' جو میں نے اس کے دس برس بعد لکھا' ہرگز نہ لکھا جاتا اگر اس کی مادی بنیادوں کا میں نے اس دور میں مشاہدہ نہ کیا ہوتا۔ اس کے اقتباسات یہاں دینا اس لئے ضروری ہیں کہ انھیں پڑھتے وقت میں عمر کے فاصلے طے کر کے ایک بار پھر 'بنگلہ دیس' پہنچ جاتا ہوں۔

بنگلہ دیس

کس جادوگر کا یہ گھر ہے،
بنگلہ دیس اک رنگ بھون!
گھنے گھنے بانسوں کے جنگل
ہرے بھرے سب کھیت اور بَن
کرشن برن سے بھی کچھ گہری
جس کی دھرتی اور گگن

روپ اَنیلا نیلا نیلا
اور ندیوں کی روپہلی باہیں
اُجلی اُجلی پھیلی راہیں
ڈالی ڈالی میں آ رنگن
سوتی لتاؤں میں ہوتی کاناپھوسی سی
پھول بنوں میں یہ چھنکی چھنکی سی پھبن

دیس بھی نیلا، بھیس بھی نیلا
پھولوں کی خوشبو سے بوجھل
مند ہوا کا آنچل
دھان، دھنک اور ساگر جل تھل

پَوَن کے جھونکے ہانپتے پھرتے
وہ ٹوٹا سا چاند کا درپن!

سارے دیس پہ اک دھانی آنچل سا پھیلا
ایک اُداسی، ایک اُداہٹ
اک سپنا سا، ایک نشہ سا
کھُلے کھُلے سارے بندھن!

اُودی اودی نیلی گھٹائیں
دھان کی ہر بالی دُسونی بالی سے
کان میں کچھ چپکے سے کہتی،
کھیتوں کی کوروں سے لگ کر
دور پہ وہ اک ندّی بہتی
دھیرے دھیرے،
اک سپنا سا بہہ نکلا ہو
رادھا کی آنکھوں سے جیسے!

اِک سویا سا دیس!
نیند کی ماتی جس کی ندیاں
چُپ چُپ روتیں، غم کو سہتیں، بہتی جاتیں
درد بھری سی، دھیرے دھیرے چلتیں مَری سی
نَینن میں دکھ کو گھولے
جی میں لاکھوں پھَپھولے
ملن کی آس لیے چلتی ہیں، ہَولے ہَولے

- - - - - - - - - - - - - - -

یہاں کی ہر ڈالی پچکیلی

پھول بھی جیسے نیند کے ماتے
چاند بھی چپ، تارے بھی چپ چپ
کرم سے سب انجان
پریم سے سب بے جان

اِس بھٹکے آکاش کو دیکھو،
دیکھو! تاروں کی وہ آنکھیں،
اپنی کرنوں کی پلکوں سے
دھیرے دھیرے، اَن تھک، اَن تھک،
نت بُنتیں سپنوں کے جال!
ہے دُکھ سے بھرپور یہ دیس!
دُکھ بھری آہیں ہر جھاڑی میں
کمل کُمھلائے، بادل چھائے
پریم کی پیر سے ڈھیلا انگ ہے
سوئی سوئی من کی ترنگ ہے
کرم کا پریم سے کیا سنجوگ
پریم تو بنگلہ دیس کا روگ!

بنگلہ دیس تو پریم کی بھومی، راگ کی بھومی، رنگ کی بھومی ہے۔ بنگلہ دیس کی یہ سرزمین یادوں کے ان سینکڑوں رنگین ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہے جو میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے تھے۔ کچھ یہی حال 'روپ' کا ہے جو بے شمار روپوں کا بہروپ ہے:

روپ

مَنجُل وہ بنگال کی بالا
جس کے روپ اَنوپ کے کارن

بنگلہ دیس ہے کرشن برن !
وہ تھی نیلے دیس کی سندری
اُس کا جوبن —
کالے کیس، کلس اور کاجل
جامنی ہونٹ رسیلے،
نین ہٹیلے،
ڈھیلا انگ — بدن کی رنگ ترنگ آبی ساری ... چھپ رہی تھی'
مہک وہ کیسر تن کی! ہوش اڑا دے
آنکھیں! رنگ کی اک پچکاری
جیسے دن سے آنکھ مچولی!
کھیلتی ہو اندھیاری!

بنگلہ دیس کی سندر بالا
اس کے گلے میں
کومل کملوں کی اک مالا
انگ انگ میں چہکار
آنکھوں میں اک اُلجھی بولی
مکھ میں بھری ہوئی جھنکار
ڈھلا ڈھلایا روپ
جیسے چاند کی دھوپ
یا جیسے سنگیت
کوئی مسعود کا گیت !
کالے کیس، جھکی جھکی ساون کی گھٹائیں

تُلی تُلی مُسکان ، بنی ہوئی انجان

پون سی ڈولتی پھرتی اِدھر اُدھر

وہ —

شام کی پلکوں میں سوتی تھی

شبنم سے مُنہ کو دھوتی تھی

لہروں سے نت کھیل تھا اُس

چڑیوں سے کچھ میل تھا اُس کا

خوشبو پیتی، ہنس ہنس جیتی،

لے کر من میں پریم کی اُلجھن

پلکوں کی جھالر سے کچھ موتی برساتی

متوالی ، نیلم پیالی سے مد چھلکاتی

ایک کلی جو ——

بادلوں کے سایوں میں پل کر

نکھر اُٹھتی ہو

راگ کی آگ تھی جس کے من میں

دُھلی دُھلی نتھری سی آنکھیں

تیکھے چتون — جن میں تھا اک نرم لگاؤ

چاہت ، چاہ ، چہل اور چاؤ

اُچپل ، چنچل ، ایک سبھاؤ

ٹھٹھک ٹھٹھک اٹھکیلیاں کرتی

چال میں نرت کے بھاؤ !

کھیلتی تھی کانن کانن میں
پھولوں کے کچھ سُندر کھیل
کیول کلیوں سے تھا میل۔
آنکھ نشیلی، بات رسیلی
آنکھیں! جن میں لاکھوں سپنے
ساگر، لہریں، جھیلیں — اُودی گھٹائیں
رادھا کرشن کی آنکھ مچولی!

دھانوں کے کھیتوں کی روح، مہک رہی تھی
بانسوں کے جنگل کی بالا، چہک رہی تھی
پریم کا اَمرت پی پی کر وہ پلی بڑھی
اس کے دل میں بند کلی کا راز!
بول سُریلے، پریم اتھاہ!!

اِس روپک میں اقبال اور ٹیگور کے فلسفے کی آمیزش بعد کی چیز ہے، لیکن 'دیس' اور 'روپ'، کا تمام تر پس منظر میرے قیام ڈھاکہ کی کمائی ہے۔

میرے شعری تجربے کا یہ پس منظر 'دیس'، اور 'روپ'، تک محدود نہیں۔ اس روپک کے دوسرے 'کینٹو'، 'ایک شام'، 'بانسوں کے جنگل میں'، اور 'آموں کے کنج میں' بھی دیکھا جا سکتا ہے، جہاں بنگالن لڑکی 'مُنجل'، 'افغانی' کو لے کر گھومتی ہے اور دونوں اپنے مکالموں کے ذریعے زندگی کے دو مختلف فلسفوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ 'مُنجل'، ٹیگور کی ویدانتی فکر 'وحدت وجود' کی نمائندہ ہے اور 'افغانی'، اقبال کے فلسفۂ 'خودی' کا۔ میرے لیے 'مُنجل' کی تجسیم دشوار ہے لیکن 'افغانی' میں غیر شعوری طور پر 'مَیں' کی کارفرمائی ہو سکتی ہے۔ یہ 'روپک' میں نے اس زمانے میں لکھا گیا جب تقسیم کا آرا اسردوں پر چل رہا تھا۔ اپنے مجموعۂ کلام 'دو نیم' کے پہلے ایڈیشن میں (۱۹۵۶ء) میں نے روپک کو بغیر کسی تشریحی نوٹ کے شائع کیا تھا۔ شوامز عادل

نے شاہراہ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ ہمارے شاعر کو کم ازکم اس وقت تو پریم کے گیت نہیں گانا چاہیئے تھا۔ چنانچہ دوسرے ایڈیشن (۱۹۸۲ء) کو شائع کرتے وقت روپ بنگال' کے لیئے مجھے یہ تشریحی نوٹ لکھنا پڑا:

"روپ بنگال" (۱۹۷۰ء) ایک ایسے عالم کرب و ضرب کی یادگار ہے جب ہر شے "دو نیم" نظر آرہی تھی۔ ایک تاریخ ـــــــ اور ایک تہذیب کے دو ٹکڑے ہو رہے تھے۔ سیاست کی موجِ خوں سے بہت دور روشنی کے صرف دو مینار سہارا بنے ہوئے تھے۔ ایک ٹیگور کا بے خودی کا ویدانتی تصور اور دوسرا اقبال کا اثباتِ ذات کا فلسفۂ خودی۔ اس روپک میں 'افغانی' جو حیات و حرکت کا پیکر ہے، اقبال کی فکر کا ترجمان ہے۔ بنگالی لڑکی "منجل" ٹیگور کی ویدانتی فکر کی نمائندہ ہے۔ بنگال کے مختلف مناظر میں یہ ساتھ ساتھ گھومتے ہیں اور معروفِ گفتگو نظر آتے ہیں۔ 'افغانی' 'وجود' کا سبق پڑھاتا ہے۔ منجل' وحدتِ وجود کا۔ دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔ شاعر نے اپنی ترجیح کے مطابق اس کا حل آخری 'کینٹو' آموں کے کنج' میں پیش کیا ہے۔ مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ 'دو نیم' کے پہلے ایڈیشن پر تبصرہ کرنے والے ناقد اس 'روپک' کی تہ تک نہ پہنچ سکے ؎

آشکارم دید و پنہانم ندید

بہرحال یہ 'روپک'، جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے اسکول کے طلبہ نے ۱۹۷۵ء کے درمیان کئی بار ڈاکٹر ترنگ کی ہدایت کاری میں اسٹیج کیا۔ مبصرین کا خیال تھا کہ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھتا ہے، البتہ اسے ایک اختتامیہ کی ضرورت تھی جو اب فراہم کر دیا گیا ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے ڈھاکہ کے چار سالہ قیام میں 'معاشرتی حقیقت' کی طرف سے میری آنکھیں زیادہ تر بند رہیں۔ سیاسی اعتبار سے میں بنگالیوں کی دہشت پسندی سے بہ تقاضائے عمر متاثر تھا لیکن سوائے چند انقلاب پسند دوستوں سے گفتگو کرنے کے، اور کسی چیز کا مرتکب نہ ہو سکا۔ البتہ اس بات کا شدید احساس تھا کہ بنگالی مسلمان

وہاں کے ہندوؤں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے پس ماندہ ہے۔ اسلام پورہ کے کچھ "مار پچھلے دیوں دمار کے پھینک دوں گا" قسم کے دادا لوگوں کے علاوہ جسمانی اعتبار سے بھی وہ ہیٹے تھے۔ تعلیم میں تو وہ بہت پیچھے تھے ہی، صنعت وتجارت میں بھی ہاتھ کی دستکاری اور چھوٹی دوکانداری کے علاوہ کچھ نہیں کرتے تھے۔ صرف نوابانِ ڈھاکہ کا خاندان تھا جو اُن کی سیاسی زندگی کا محور تھا' لیکن خود اُن کا وجود تاجِ برطانیہ کا مرہونِ منت تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب اسلام کے نام پر پاکستان وجود میں آیا تو چند سال کے لئے ایسا معلوم ہوا کہ نئی قومیت ایک مذہبی اساس پر تعمیر کی جا سکتی ہے۔ میں ذہن کے تعمیری دور میں ڈھاکہ میں رہ چکا تھا۔ اس لئے میں نے اس نئی قومیت کو ہمیشہ مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ بنگالی مسلمان اور پنجابی مسلمان میں سوائے مذہب کے اور کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی۔ قومیت کے دوسرے عناصر ترکیبی، مشترک جغرافیائی حدود، مشترک تہذیب، مشترک معیشت اور مشترک زبان بالکل مفقود تھے۔ مفکرِ اسلام لاکھ کہا کریں ع

تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بے کراں ہو جا

بنگالی مسلمان دیندار ہوتے ہوئے دین کے نام پر اپنی انفرادیت کو پاکستان میں مکمل طور پر ضم کر دینے کو تیار نہیں تھا۔ اردو کے مقابلے میں اسے اپنی بنگالی عزیز تھی۔ ٹیگور اور نذرل کے نغموں کا جو بچپن سے دلدادہ رہا ہو وہ اقبال اور جوش کی شاعری کی داد کس طرح دے سکتا تھا۔ آخر آخر میں 'حروف القرآن' کے حوالے سے بنگالی کے لئے اردو رسم خط اختیار کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق سمجھانے گئے۔ "اسلام کی جوئے شیر کے کوہ کن" سید سلیمان ندوی آیاتِ قرآنی پڑھتے ہوئے پہنچے لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ قائدِاعظم کے عین اعلان کے وقت کہ "اردو اور صرف اردو نئی مملکت کی قومی زبان ہوگی" شیخ مجیب کی قیادت میں بنگال کے طلبہ نے "بنگالی زندہ باد" کے نعرے لگائے۔

میں نے اسی احساس کے پیشِ نظر یکم ستمبر ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں آخری صفحے کے تحت 'کفارہ' کے نام سے یہ الفاظ لکھے تھے:

"مشرقی ومغربی پاکستان کا موجودہ المیہ سیاسی ومعاشی ہی نہیں،

ایک سانحہ، واقعہ ہائلہ بھی ہے۔ میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس المیے کے ستم گر اردو زبان سے منسوب ہیں"۔

رشید احمد صدیقی صاحب کے یہاں اس مضمون کا ردِ عمل یوں ہوا:

"اردو والے جس طور پر اردو کو ایک غیر رضا مند طبقے یا خطّے پر تھوپنا چاہتے (اور) بنگالی کو بے حیثیت کرنا چاہتے تھے اس کو میں کب پسند کرتا ہوں۔ ایسوں کی مخالفت میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اپنی جگہ پر بالکل درست ہے لیکن آج کل جن حالات کا سامنا ہے اس میں نہ کہتے تو بہتر تھا"۔

خواجہ غلام السیّدین صاحب کا اس مضمون کو پڑھ کر جو اچانک مراسلہ ملا، اس کا لہجہ اس سے بالکل مختلف تھا۔

عزیزی تسلیم

"میں نے یکم ستمبر "ہماری زبان" میں آپ کا مضمون "کفارہ" پڑھا۔ مجھے مضمون اور اس کا طرزِ بیان دونوں بہت پسند آئے۔ بات کہنے کی تھی اور خوشی ہے کہ اس کو آپ نے مضبوطی اور سلیقے سے کہا"۔

مخلص، غلام السیّدین

بنگالی زبان کی محبت نے مشرقی پاکستانیوں کو حیاتِ نو بخشی۔ ڈھاکہ کے "شہید مینار" کی قیمت دے کر انھوں نے بنگالی کے مساوی حق کو منوایا اور جب بات یوں بھی نہ بنی تو آزاد بنگلہ دیش کی تحریک کا آغاز ہوا۔

میری بنگلہ دیش کی تفہیم اپنے نوجوانی کے تجربات کی بنا پر کچھ اسی انداز کی تھی۔ بنگالی مسلمان اپنی زبان کے سلسلے میں ظرافت تک برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ اس کا مجھے اندازہ برسوں پہلے اس وقت ہوا تھا جب میں نے پیامِ تعلیم میں "بنگالی بابو" کے عنوان سے یہ مزاحیہ نظم بچوں کیلیے شائع کی تھی۔

بُونگالی بابو

ہام ہے اِک بُونگالی بابو
ٹوٹی پھوٹی زانتا اُردو
پھر بھی تم سے ہم بولے گا
بنگلہ بولی ہم کھولے گا
اُردو کیا اِک بولی ٹھولی
بنگلہ اِک رشُ گُلّا بولی
کیا ہے گولیب کیا ہے اکبُل
دیکھو ٹھاکر دیکھو نجرُل
بنگلہ دیش کی بات ہی آر ہے
شُندر لوگ ہے شُندر گھار ہے

مزاح کی یہ کوشش سروں پر سے گزر کر میرے ہی سر آ پڑی، اور کلکتہ کے کئی اخباروں میں اس کے خلاف خوب خوب خامہ فرسائی ہوئی۔

ڈھاکہ دوسری بار میں مَیں ۱۹۷۶ء میں ایک سرکاری ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے گیا تھا۔ بنگلور انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے ڈاکٹر راؤ میرے رفیقِ سفر تھے۔ ہم لوگ رَمْ کے علاقے میں ایک بڑے ہوٹل میں مقیم تھے۔ ڈھاکہ کو بالکل بدلا ہوا پایا۔ خیر یہ تبدیلی تو ہر بڑے شہر کا مقدر ہو گئی ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی بنگالی مسلمان کی نفسیات میں پائی۔ خود اعتمادی کے ساتھ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کا شدید جذبہ ملا۔ ہر اردو بولنے والا اب بھی وہاں بہاری کہلاتا ہے۔ ان کے مسئلے کے باوجود اردو سے عناد ختم ہو گیا ہے۔ بنگلہ دیش اب اپنے وجود پر تیج و تاؤ کھا رہا تھا۔ وہ کس قدر اسلامی رہے

اور کس قدر بنگالی۔ مغربی بنگال سے شناخت کے لیے وہ اسلام کا سہارا لے رہا تھا۔ ٹیگور اسے عزیز تھا لیکن ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں مغربی بنگال کے بنگالیوں کو۔ ٹیگور کی فکر کا بہت بڑا حصّہ عام مسلمان بنگالی کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔ میں نے بنگلہ دیش کے بہت سے دانشوروں سے اِس بارے میں گفتگو کی، کسی کا بھی ذہن صاف نہیں پایا۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔

طویل عرصے کے بعد ہمدمِ دیرینہ، ہائی اسکول کے ہم جماعت، نورُالدّین سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب ڈھاکہ یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔

چوتھا باب

مرحوم دہلی کالج

مسوری سے واپس آکر دو سال تک میرا قیام بڑے چچا (ڈاکٹر ذاکر حسین) کے ساتھ قرول باغ میں رہا جہاں وہ جامعہ کے قریب کرائے کے ایک مکان میں مقیم تھے۔ میں نے اب اینگلو عربک کالج (مرحوم دہلی کالج) کے بی۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہ کالج اپنی پرانی عمارت غازی الدین حیدر کے مدرسے میں اجمیری گیٹ کے پاس واقع ہے ۱۹۴۷ء کی غارت گری کے بعد اس کا احیاء دہلی کالج کے پرانے نام سے کیا گیا۔ چند سال قبل اس کا نام پھر بدل کر ذاکر حسین کالج کر دیا گیا۔ میں جامعہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے اس وقت کالج کی سوسائٹی کا صدر تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ خورشید عالم خاں صاحب کے اِشارے پر جب اس کا نام بدلنے کی تجویز پیش کی گئی تو مفتی عتیق الرحمٰن نے جو مجلس کے رکن تھے، یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی تھی کہ ذاکر صاحب کے نام پر تو اور بڑی عمارتوں اور سڑکوں کے نام رکھے جا رہے ہیں، دہلی کالج کے نام سے اہلِ دہلی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں اس لیے اُسے اسی طرح رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔ میرا خیال تھا کہ مفتی صاحب کی رائے نہایت صائب تھی لیکن صدرِ مجلس کی حیثیت سے میرا خاموش رہنا ہی اَولیٰ تھا۔ بہرحال خورشید عالم صاحب کی اس درپردہ دھمکی کی وجہ سے کہ شاید اندرا گاندھی کالج کا نیا ٹرسٹ، نام کی تبدیلی کے بغیر بنانے پر آمادہ نہ ہوں، کالج کا نام بدل کر ذاکر حسین کالج کر دیا گیا۔ اِس طرح دہلی کالج دو بار مرحوم ہوا۔ اس کے اینگلو عربک کالج نام سے تو میری طبیعت بھی مُنغّض رہا کرتی تھی۔ بہرحال بی۔ اے میں میں اسی

کا طالب علم رہا۔ بی۔ اے۔ میں میں نے تاریخ اور فارسی اختیاری مضامین کے طور پر لیے تھے۔ انگریزی، اُردو لازمی تھے۔ انگریزی' کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر واکر اور ایک اسکاچ مسٹر نوری مُر پڑھاتے تھے۔ نوری مر کا پڑھایا ہوا تو وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے، لیکن واکر صاحب بہت اچھے مُنتظم اور اُستاد تھے۔ شام کو کالج کے طالب علموں کے ساتھ ٹینس کھیلتے اور انگریزی تحفظاتِ ذہنی کے باوجود کسی چرچ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے طلبہ سے ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ جوہر شناس بھی تھے۔ میرا ٹیوٹوریل کلاس اُن کے پاس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کے لیے ایسے مضامین لکھے جائیں جن میں طالب علم کو بطور خود سوچنا پڑے۔ میں ان کے اس معیار پر پورا اُترا تو ڈاکٹر ذاکر حسین سے ایک ملاقات میں ذکر کیا اور کہا "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ مسعود میں اپنے طور پر سوچنے کی صلاحیت ہے۔" میرے دوسرے اساتذہ میں قابلِ ذکر آفتاب صاحب تھے جو تاریخ پڑھاتے تھے۔ علی گڑھ سے ایم۔ اے کیا تھا۔ ہم لوگ نہ صرف ان کی شخصیت سے متاثر تھے بلکہ طریقہ تعلیم سے بھی اُن سے سینیئر چشتی صاحب تھے جو اُس وقت انگلستان گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر کچھ عرصے تک انھوں نے بھی ہماری کلاسیں لیں لیکن اُن پر انگلستان اور وہاں کی زندگی کی یادیں ایسی حاوی تھیں کہ اُن سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ البتہ ان کا انگریزی کا تلفظ بہت اچھا تھا، چہرہ مہرہ بھی سرخ سفید تھا۔ جب اس پر بحث ہوتی کہ کس کی کرامات' ہے تو میں با صرار کہتا کہ 'غازہ' کی تو بہرحال نہیں ہو سکتی۔ ذاکر کے بڑے عقیدت مندوں میں تھے اور جب جامعہ قرول باغ سے اوکھلا آگئی تو وہاں بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اکثر چھٹی کے دن آن دھمکتے اور قیام (بعدۂ طعام) کا سلسلہ شام تک رہتا۔ ذاکر میاں اُن کی اس بے تحاشا عقیدت سے عاجز تھے لیکن اپنی عادت کے مطابق کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ اتفاق سے ۱۹۴۷ء میں ایکدم پاکستان وجود میں آگیا اور چشتی صاحب ان لوگوں میں تھے جنھوں نے پر پرواز سب سے پہلے کھولے۔ بعد کو ایک دن ذاکر میاں کو یہ کہتے سُنا کہ بھئی پاکستان بننے سے ہمیں بھی ایک فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ چشتی صاحب سے نجات مل گئی۔

فارسی کے اُستاد منظور حسین موہوی تھے۔ فقرے باز، پانوں کے رسیا اور دبنگ، مجال کیا کہ کوئی کلاس میں دم مار سکے۔ ایک ہی فقرے میں چیت کر دیتے تھے لیکن وہ بھی عاجز

تھے ہمارے ایک رنگروٹ ساتھی (نام ؟) سے جن کی سمجھ میں شعر بالکل نہیں آتا تھا۔ چنانچہ جب عُرفی یا نظیری اپنے قصائد میں محبوب کا سراپا بیان کرتے (جس میں زلفوں کو مارِ سیاہ، دانتوں کو موتیوں کی لڑی، گردن کو صراحی، بھنووُں کو کمان، مژگاں کو تیر اور کمر کو معدوم بتاتے تو یہ حضرت مسلسل مسکراتے رہتے۔ موسوی صاحب کنکھیوں سے اُن کا مسکرانا دیکھتے رہتے اور اچانک بول اٹھتے۔ دیکھئے حضرت! اب یہ آپ میں سے کسی نہ کسی سے ضرور پوچھ بیٹھیں گے کہ تم ایسی مجبوبہ سے شادی کرنا پسند کروگے اور کلاس کے بعد واقعی ایسا ہی ہوتا!

موسوی صاحب کی مرزا محمود بیگ صاحب سے گہری دوستی تھی۔ مرزا صاحب خاص دِلّی والے تھے اور کالج میں فلسفے کے اُستاد تھے۔ عمر بھر تجرّد میں گذاری۔ اس لیئے وہ ہر فقرے پر سوچ میں ڈوب جاتے تھے۔ گفتگو کی اِس سُست روی کو وہ پھر ایک بے ساختہ قہقہے کے ذریعے تیز رفتار بناتے۔ میں اُن کا شاگرد نہیں رہا لیکن کالج سے نکلنے کے بعد مختلف حالات میں اُن سے قریب تر ہو گیا۔ وہ اپنے کالج کے شیدائیوں میں تھے جس کے بعد کو پرنسپل بھی ہو گئے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا اور تدفین کے لیے' جامعہ ملیہ کے قبرستان لائے گئے تو موسوی صاحب جنازہ کے ساتھ تھے۔ اس وقت تک وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ ایک عزیز دوست کی جدائی سے اور نڈھال نظر آئے۔ آکر پاس کی ایک پختہ قبر کے کنارے پر بیٹھ گئے، میں بھی ان کے پاس بیٹھ گیا اور غالب کی طرح محسوس کرنے لگا ع

اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں ؟

بی۔ اے۔ کے میرے دوستوں میں حبیب اللہ خاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے والد چودھری اللہ دیا ایک رانگھڑ راجپوت تھے جنھوں نے ٹھیکیداری میں خاصا کما لیا تھا اور ایک پختہ دو منزلہ قرولباغ میں بنوا لیا تھا۔ حبیب اللہ خاں میں ایک عجیب راجپوتی شان تھی۔ ہمیشہ سینہ سپَر رکھتے، یہاں تک کہ سائیکل پر بھی اُن کی یہی کوشش رہتی۔ والد نے طالب علمی کے زمانے میں شادی کر دی تھی جس سے وہ مطمئن و مسرور نظر آتے تھے جیسا کہ ان کے گھریلو تذکروں سے ظاہر ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے میں ابھی تک 'بیرونِ قلعہ' کی مخلوق تھا لیکن حبیب اللہ کی متاہلانہ زندگی کی آسودگی سے متاثر تھا اور زندگی کے کسی ہم سفر اور ساتھی کی

تلاش کی خواہش دل میں پیدا ہونے لگی تھی۔ ہم دونوں کبھی کبھی سینما بھی جاتے تھے۔ ان دنوں دیویکا رانی اور نسیم پردۂ سیمیں کی رانیاں تھیں۔ حبیب اللہ سے میں اکثر مشورہ کرتا کہ میں کس جیسی کا انتخاب کروں، اِس لیئے کہ خاندان میں دو لڑکیاں تھیں جوان دونوں کی شکلوں سے مشابہت رکھتی تھیں۔ حبیب اللہ کا مشورہ دیویکا رانی جیسی کا ہوتا۔ میں نے بالآخر نسیم جیسی کا انتخاب کیا۔

ایک اور ساتھی جن کے دماغ میں کچھ سنک تھی (اور اب بھی ہے) انعام الحق تھے ان کا شمار اچھے طالب علموں میں ہوتا تھا۔ دوستی کے لیئے میں انھیں زیادہ معتبر نہیں سمجھتا تھا۔ علی گڑھ سے انھوں نے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور اس کے بعد زمانے میں گم ہو گئے۔ دو برس پہلے جب میں ایک ثقافتی ڈیلیگیشن کے رکن کی حیثیت سے پاکستان گیا اور لاہور الحمرا میں منعقد کی گئی ایک تقریب کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ سے محوِ گفتگو تھا کہ اچانک ایک گورے اور دراز قد شخص نے میرا بازو پکڑا اور دور تک کھینچتا لے گیا، پھر آنکھوں میں اپنی نیلی آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ پہنچانا؟ مجھے انھیں پہچاننے میں مشکل سے ایک منٹ لگا ہوگا، البتہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے پاس سے یوں کھینچ کر چلے آنا مجھے کسی قدر ناگوار گزرا۔ میری اُن سے یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ میں نے کہا "ہاں پہچان لیا، تمھاری صورت سے نہیں تمھاری حرکت سے" معلوم ہوا کہ وہ اس وقت اقبال پبلک لائبریری، لاہور کے ڈائریکٹر ہیں۔ پکڑ کر لائبریری لے گئے، جو قریب تھی، پھر اصرار تھا کہ اس کا ہر گوشہ اُن کے ساتھ گھوموں۔ میں نے ایک شیلف پر رکھی ہوئی کچھ کتابیں دیکھیں۔ بعض سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ جب میں کئی گھنٹے گذارنے کے بعد وہاں سے رخصت ہوا تو میری پسندیدہ کتابوں کا ایک بنڈل میرے ساتھ تھا۔ میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "انعام الحق! اب تم سمجھدار ہو گئے ہو"۔

ایک اور ساتھی محمود علی تھے۔ وہ فلسفے کے طالب علم تھے۔ چنانچہ علی گڑھ پہنچ کر انھوں نے فلسفے میں ایم۔اے کیا۔ اس فلسفے دانی کا بُرا ہو کہ پہلے وہ وزارتِ تعلیم میں گھس گھس کرتے ڈپٹی سکریٹری ہو گئے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد سید حامد کی وائس چانسلری میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار کی حیثیت سے کچھ عرصے کام کیا لیکن زیادہ نہیں

ٹھہر سکے۔ اُن کے متانت، خلوص اور دیانت کے ہم سب قائل رہے۔

بی۔اے۔ کے دوران مجھے پہلی بار ذاکر میاں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل میں نے جامعہ میں چھ سال بورڈنگ ہاؤس میں گزارے تھے۔ اب اٹھتے بیٹھتے چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا۔ اس وقت وہ تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کا گھر صرف چچی صاحبہ (شاہ جہاں بیگم عرف پتلی بیگم) کی سلیقہ مندی کی بدولت چل رہا تھا۔ گھر کے سامنے شبّا بنیئے کی دوکان تھی جہاں سے اکثر سودا اُدھار آتا تھا۔ یہ شبّا اس وقت حیات تھا جب ذاکر میاں وائس پریسیڈنٹ ہو کر ۱۹۶۲ء میں ہمارے دہلی آئے، وہ اُن سے ایک بار آکر ملا بھی۔ دونوں کے درمیان کیا گذری یہ معلوم نہیں۔

اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے اُن کے یہاں ایسے حالات میں جا کر نہیں پڑ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن میرے اس فعل سے اُن کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ چچی صاحبہ جو پکاتیں وہ سب کھاتے۔ دونوں بچیوں — سعیدہ اور صفیہ — کے کھانے پہننے کے لیئے کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ انھوں نے بھی بچپن میں سادہ کھایا اور موٹا پہنا۔ چچی صاحبہ بڑی خوش دلی کے ساتھ کھانا پکاتیں۔ اُن کے اس سادہ کھانے میں۔ ایک گوشت کا سالن اور ایک دال، جو مزہ ملتا تھا وہ کہیں نہیں ملا۔ باورچی خانے میں بیٹھ جاتا۔ وہ گرم گرم روٹیاں پکاتی جاتیں اور میں کھاتا جاتا۔ ذاکر میاں بھی اسی غذا پر مطمئن تھے۔ البتہ جب جرمن خاتون مس فلپس بوڑن جو ساری جامعہ کی آپا جان تھیں، جامعہ آگئیں تو ان کے یہاں جا کر منہ کا مزہ بدل لیتے۔ ان کی زندگی بھی اس شعر کے مصداق تھی ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

کبھی کبھی وہ گھر آکر میرے توسط سے چچی صاحبہ سے گفتگو کا سلسلہ چھیڑتیں اور بتاتیں کہ ذاکر صاحب قوم کے لیئے بہت بڑا کام کر رہے ہیں، ہم سب کو ان کی مدد کرنا چاہیئے، تو چچی صاحبہ نہ معلوم کس جذبے کے تحت کہتیں "چل جھوٹی کہیں کی"، اسے میں انگریزی میں ترجمہ نہ کر پاتا۔

میں نے 'آپا جان' کو آخری بار بستر مرگ پر ڈاکٹر جوشی کے اسپتال میں ۱۹۴۳ء میں دیکھا۔ اس وقت جو میرے تاثرات تھے وہ اس گیت میں ڈھل کر نکلے۔

ھچکولے

وشن چندر ا

میں اِک گہرا ساگر!
جس کے سینے پر کچھ لہریں
(من کی ترنگیں)
بَن، بَن، ہَنس ہَنس کھیلیں
مٹ جانے کو!

چوم سکیں یہ چاند کو کیسے
اُچھل اُچھل کر
اُٹھیں پل پل
کیول
گر جانے کو

کایا سے جب چھو نہیں پاتا
دور رہو تم
لے کر چاہ — اتھاہ تمھاری
ہو جاتا اپنے میں گُم
میرے سینے میں پھر تُم!! (۱۹۴۳ء)

اِس زمانے میں مَیں نے ذاکر میاں کا جمال اور جلال دونوں دیکھے۔ جمال کی شہادتیں تو بہت سی مل جائیں گی، البتہ جلال کا ایک واقعہ سُناتا چلوں۔ گھر میں اوپر کے کام کے لیئے ایک چھوٹا سا لڑکا لطیف مُلازم تھا۔ وہ شرارت کی پڑیا تھا۔ کسی وقت نچلا نہیں بیٹھتا اور کوئی نہ کوئی حرکت کیئے جاتا۔ نہ تو اس پر چچی صاحبہ کی لاگ ڈانٹ اثر کرتی اور نہ میرا یا کسی اور کا بُرا بھلا کہنا۔ ایک دن اُس کی اس قسم کی حرکت کی شکایت ذاکر میاں کے کانوں تک پہنچی، عرصے سے اُس کی شرارتیں دیکھتے اور سُنتے آئے تھے۔ ایک دم جلال میں آگئے اور کہا لاؤ آج اِسے مَیں ٹھیک کروں گا۔ گھر میں ایک بڑا گہرا کھاری پانی کا کنواں تھا۔ اس پر ڈول رسی پڑے رہتے تھے۔ فوراً رسی کا ایک سِرا لیا اور اس سے لطیف کی کمر اور ہاتھ جکڑ دیئے۔ اس کے بعد ڈول کی مانند اسے کنوئیں کے اندر سَرکانا شروع کیا۔ لطیف کی سینکڑوں چیخیں تھیں۔ گھر میں ہل چل مچ گئی۔ چچی صاحبہ سہم گئیں کہ اگر کچھ ہو گیا تو۔۔ بہر حال بڑی بڑی مشکلوں سے ذاکر میاں کو رضامند کر لیا گیا کہ اس بار چھوڑ دیں۔ لطف یہ تھا کہ جو ہر وقت شکایتیں کرتے تھے اب گڑگڑا کر سفارشیں کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے لطیف کو کنوئیں سے باہر کھینچا گیا۔ کنوئیں سے وہ ایسے 'غسلِ اصلاح' کر کے نکلے کہ اس کے بعد پہچانے ہی نہیں جاتے تھے کہ وہی لطیف ہیں۔ پھر تو ہر ہر قدم پر 'جی حضور' اور 'جی ہاں' تھے۔

ذاکر میاں کا زیادہ وقت جامعہ کے دفتر اور اس کے مختلف کاموں میں گھرے باہر گزرتا۔ مکان پر جو خالی وقت ملتا وہ مکان کے سب سے چھوٹے کمرے میں لیٹ کر گزارتے اور کچھ پڑھتے رہتے۔ میں نے انھیں اکثر غالب، اقبالؔ یا کسی فارسی شاعر کے اشعار گنگناتے سُنا انھیں وہی اشعار پسند تھے جو خود ان کی زندگی کے ترجمان تھے۔ اس اعتبار سے اقبالؔ ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ وہ بنیادی طور پر جمالیات، اخلاقیات اور شعر کے آدمی تھے۔ معاشیات سے، جو اُن کی اعلیٰ تعلیم کا مضمون رہا تھا، دور ہو چکے تھے۔ ان کے ارد گرد بہت کم کتابیں دیکھنے میں آتیں اور جو تھیں ان کا معاشیات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ قرول باغ کے اِس مکان میں نہ تو گلاب تھے، نہ سبزہ و گل اور نہ گملے نہ تصاویر۔ البتہ خطاطی کے چند دل آویز نمونے ضرور آویزاں رہتے تھے۔

ذاکر میاں کی زندگی میں نظم وضبط کی بہت کمی تھی۔ اقبال کی طرح وہ بھی حرکت بہانی کی برکت کے قائل نہیں تھے۔ عین وقت پر کام کرتے۔ میرے خیال میں اُن کی نثر میں جو شاعرانہ زیروبم اور آب و رنگ ملتے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سخت دباؤ اور تحریک پر قلم اُٹھاتے تھے۔ جب لکھتے تو اپنی کوٹھری میں بند ہوجاتے۔ ملنے ملانے کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ کھانا وغیرہ وہیں بھیج دیا جاتا۔ اس کے بعد بھی گھر میں چین نہیں ملتا تو سلیم الزماں صدیقی صاحب، مجیب صاحب یا آپا جان (مس فلیپس بورٹن) کے یہاں خود کو مقید کر لیتے اور اس وقت تک برآمد نہیں ہوتے جب تک کوئی خطبہ، مضمون یا ریڈیو کی تقریر قلم بند نہیں ہوجاتی۔ ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ پہنچ کر اسی طرح کی کیفیت میں اُن پر قلب کا پہلا دورا پڑا تھا۔

ذاکر میاں میں جامعہ ملیہ کی پریشان کن مصروفیات کے باوجود ظرافت کا حس قائم رہا۔ میرے خیال میں اس طرح کا حس بنیادی طور پر غیر معمولی ذہانت کی دلیل ہوتا ہے اس لئے کہ بقول کارلائل ظرافت کا جوہر حساسیت ہے۔ جب کسی انسان میں یہ بصیرت پیدا ہو جائے کہ وہ اشیاء کی بوالعجبیوں کو ایک نظر میں بھانپ لے اور ان سے لطف اندوز ہو سکے تو یہ حس کارفرما ہوتی ہے۔ اُن کی یہ حس کبھی فقرے بازی کی شکل میں، کبھی لطیف طنز کے پیرائے میں کبھی ہلکے سے قہقہے کی صورت میں نمودار ہوتی تھی۔ اُن کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی آجاتا اُسے مہمان بنا لیتے اور پھر یہ خواہش ہوتی کہ اُس کی زیادہ سے زیادہ خاطر کی جائے۔ چچی صاحبہ اُن کی اس عادت سے پریشان رہتی تھیں، اور کیوں نہ ہوتیں، اِس بن بلائے مہمان کی سب سے زیادہ زد اُن پر پڑتی تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہی ہوا۔ ذاکر میاں باہر سے لپکتے ہوئے آئے، اور کہا دو آدمی کھانا کھائیں گے۔ چچی صاحبہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ شوربے کی مقدار پانی ڈال کر دو گنی کردی۔ جب کھانا نکل کر باہر آیا اور دیکھا کہ بس ڈھب ڈھب شوربا ہے جس میں چند بوٹیاں تیرتی پھر رہی ہیں۔ مہمانوں کے سامنے مسکرا کر بولے: "بھئی مسعود! لانا تو میرا لنگوٹ تا کہ اس میں غوطہ لگاؤں۔ اِس کنارے سے اُس کنارے اور اُس کنارے سے اِس کنارے۔" ہم سب اُن کے اس فقرے سے لطف اندوز ہوئے، سوائے چچی صاحبہ کے جو سن کر نہایت برافروختہ ہوئیں۔

میرا خیال ہے کہ ذاکر میاں کی حسِ ظرافت نے انھیں زندگی کے تنگنائے سے ہمیشہ

سہل گزارا۔ ظرافت کے ظرف میں وہ ہر قسم کی نامعقولیت کو اپنے لیۓ گوارا بنا لیتے۔ اسی لیۓ ان کی گفتگو میں نہ توڈنک ہوتا تھا اور نہ پھکڑ۔ اسے ہم صحیح معنوں میں "مزاح المومنین" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ البتہ جامعہ کی محدود برادری میں انھیں اپنی ذہنی برتری کا احساس ضرور تھا۔ اپنے بعض ساتھیوں سے چڑ کر کہا کرتے تھے "یہ لوگ چڑیا کا سا دماغ رکھتے ہیں"، لیکن ان لوگوں کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ جہاں بھی نیکی اور خوبی نظر آتی تھی اس کی قدر کرتے تھے۔ بدی اور بُرائی کے لیۓ لوگوں کو معاف کر دیتے تھے۔ ان کی یہ وسیع القلبی کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی تھی، اس لیۓ کہ پٹھان کی (اور وہ بھی قائم گنج کی) روایت تو بدلے کی رہی ہے۔

زندگی میں نظم و ضبط کی کمی کا ازالہ انھوں نے غیر معمولی "ضبطِ نفس" سے کیا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انھوں نے مجھے یا اپنی بچیوں کو کبھی بھی کسی بات پر جھڑکا یا ڈانٹا ہو۔ میں نے گھر کے اندر یا باہر انھیں کبھی غیظ کے عالم میں نہیں دیکھا، حالاں کہ ان کے دادا چھمن خاں کا غصّہ قائم گنج میں مشہور تھا۔ یوسف میاں نے اپنی خود نوشت "یادوں کی دنیا" میں ذاکر میاں کے "عدم تشدد" کے ماخذ کی تلاش کرتے ہوۓ اشارہ کیا ہے کہ بچپن میں وہ اپنے چھوٹے بھائی زاہد حسین خاں سے پٹ لیا کرتے تھے۔ اس لیۓ اہلِ خاندان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیۓ وہ "عدم تشدد" کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ بہر حال اُن کی آئندہ کی ایثار اور قربانی کی زندگی کے لیۓ یہ تربیت اچھی تھی، چاہے وہ چھوٹے بھائی سے ملی ہو۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں میں اپنے دوسرے دو چچاؤں ۔ ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر یوسف حسین ۔ کا بھی ذکر کرتا چلوں۔ محمود میاں چھوٹے چچا تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں میں ان کے ساتھ چار سال تک ڈھاکہ میں رہا تھا جہاں سے میں نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ وہ بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ ان کا قہقہہ مشہور تھا۔ وہ چھوٹے بڑے ہر شخص کو اپنی بزمِ بے تکلف میں شریک کر لیتے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ اور رفقاۓ شعبہ میں بہت مقبول تھے۔ وہاں ان کی بے تکلف دوستی عندلیب شادانی صاحب سے تھی۔ جن کی عبارت، اشارت ہر بات نستعلیق ہوتی تھی۔ بدقسمتی سے ان کے صدرِ شعبہ آسام کے ڈاکٹر بُورا تھے جو فارسی میں باہر سے ڈگری لے آۓ تھے لیکن جن کی اس زبان میں لیاقت محض واجبی تھی۔ شادانی صاحب، محمود میاں کے ناتے

سے مجھ سے بھی بے تکلفانہ محبت سے پیش آتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے مسعود میاں! تمہیں تو اردو فارسی کا بہت ذوق ہے، حافظ کے اس مصرع کا مطلب تو بتاؤ ع

خامُش مشو کہ کارِ تو از نالہ می رَوَد

میں سوچ ہی رہا تھا کہ بوڑھے بُوڑا صاحب نے تو کلاس میں اس کے معنی یہ بتائے ہیں۔ "(اے حافظ) خاموش مت رہ ہارن بجائے جا اس لئے کہ تیری کار نالے پر سے گزری ہے۔" وہ ڈھاکہ کی اردو کے بہت بڑے ناقد تھے اور اس کے سینکڑوں لطیفے انھیں ازبر تھے۔ محمود میاں انھیں بہت عزیز تھے۔ ڈھاکہ کے اجنبی لسانی ماحول میں واقعی ع

عندلیب شادانی! تیرا دم غنیمت ہے

میرے چچاؤں میں سب سے زیادہ غُصیلے محمود میاں ہی تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کا قہقہ کب قہر میں تبدیل ہو جائے گا۔ غالباً پردادا غلام حسین خاں کے غصّے کا بڑا حصّہ انھیں کو وراثت میں ملا تھا۔ لیکن دل کے بہت صاف تھے اس لیے ان کے آس پاس کے لوگ اسے انگیز کر لیتے تھے۔ چھوٹی چچی نہایت نیک بی بی تھیں جب کوئی ان کی نیکی کی تعریف کرتا تھا تو کہتے کہ "اتنی نیک ہونا بھی ٹھیک نہیں کہ بنچا (دھوبی کا نام) کے گدھے گھر میں ہانک لائے۔" میرے ان کے درمیان کشیدگی امتحانات کے قریب پیدا ہو جاتی تھی۔ میں کمرے میں قلعہ بند ہو جاتا تھا اور اُن کی خواہش ہوتی کہ شام کو باہر آ کر اُن کے ساتھ گپیں ماروں۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان کی یہ خواہش بجا تھی، اس لیے کہ ڈھاکہ میں 'ادھر' کا آدمی ہم نفس وہم زباں کے لیے ترس جاتا تھا۔

محمود میاں سے بڑے میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں تھے۔ طویل مدّت تک ان کے ساتھ رہنے کا مجھے موقع کبھی نہیں ملا۔ لیکن جب تک وہ حیدر آباد میں تھے میں ان کے یہاں جاتا رہتا تھا۔ اس کے بعد پرو وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ آ گئے تو تقریباً ہر روز ملنے کے لئے ان کی کوٹھی پر جاتا۔ میرے اُن کے درمیان شکل وصورت کی مشابہت کے ساتھ اور بھی کئی قسم کی مشترک ذہنی اقدار تھیں۔ ان کی بیگم (میری خالہ اور چچی دونوں) اب بھی بیٹھے بیٹھے کہہ اٹھتی ہیں۔ "اس وقت مسعود کی شکل مجھے بالکل 'اُن' کی سی لگ رہی ہے۔" وہ صحیح معنوں میں

اہلِ قلم تھے۔ پیشے کے لحاظ سے مؤرخ لیکن دلچسپیوں کے لحاظ سے ادیب۔ اُنھوں نے ابتدائے ملازمت ہی میں اقبال پر مبسوط تصنیف 'روحِ اقبال' لکھدی تھی جس کے کئی ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں اور جو اقبال کے فکر و فن پر تین چار بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ آخری عمر میں اُن کی دلچسپی غالب سے بڑھ گئی تھی تو اس پر تابڑ توڑ کئی تصانیف لکھ ڈالیں۔ "غالب اور آہنگِ غالب' 'غالب اور اقبال کی جمالیات'، یہ محسوس کرتے ہوئے کہ غالب کو ایک عالمی سطح پر روشناس کرایا جائے اس غرض سے اُنھوں نے غالب کے اردو دیوان کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا جس کی ہندوستان سے زیادہ باہر مانگ ہے۔

وہ ذاکر میاں اور محمود میاں کے علی الرّغم نہایت مرتب زندگی گزارنے کے عادی تھے وقت سے کھانا، وقت سے ٹہلنا اور وقت سے کام کرنا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری کے پُر آشوب زمانے میں بھی وہ اپنے علمی کاموں کے لیے چند گھنٹے ضرور نکال لیتے تھے۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے 'فرانسیسی ادب کی تاریخ'، 'حسرت موہانی کی شاعری' 'کاروانِ خیال'، جیسی فکر انگیز تصانیف لکھیں۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد شملہ کے انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز کے فیلو ہو کر تین سال کے لیے وہاں چلے گئے تو وقتِ معینہ پر انسٹی ٹیوٹ کے لیے Indo-Muslim Polity کے نام سے سلاطینِ دہلی کے نظامِ سیاست پر چھوٹی سی کتاب انگریزی میں لکھ ڈالی۔ ورنہ انسٹی ٹیوٹ کے فیلوؤں کی عام روایت یہ تھی کہ شملہ کی پُر فضا آب و ہوا میں دو سال تک صحت بنا کر وعدہ وعید کر کے خالی ہاتھ لوٹ آتے تھے۔ مجھ سے اس کے ڈائرکٹر نہار رنجن رے نے ایک بار بڑے تحسینی انداز میں کہا تھا کہ یہ عمر رسیدہ اچھے اچھے جوانوں سے زیادہ پابندیٔ اوقات سے کام کرتا ہے۔

یوسف میاں میں بھی محمود میاں کی طرح جمال پر جلال حاوی تھا۔ جب جلالی کیفیت میں آجاتے تو نفع و نقصان سے بالاتر ہو کر جو جی میں آتا کہہ جاتے اور کر جاتے۔ ان کا وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی سے اختلاف مزاج کی اسی افتاد کی بناء پر یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ زیدی صاحب نے اُن سے استعفا طلب کر لیا تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی مجلسِ منتظمہ کی اکثریت اِن کے ساتھ تھی۔ اس لئے آخر میں زیدی صاحب کو سمجھوتہ کرنا پڑا۔ ان کے سب سے بڑے حمایتی

عبدالمجید خواجہ صاحب تھے جنھوں نے نہایت بے تکلفی سے ایک بار مجھ سے کہا تھا "مسعود تمھارے دونوں چچاؤں میں ذاکر سیاسی آدمی ہیں اور یوسف پٹھان ہیں"۔ علی گڑھ میں بائیں بازو کے حلقۂ سیاست سے ان کی کشمکش بھی اسی مزاج کا شاخسانہ تھی۔ یوسف صاحب ایک تو مارکسی فکر کے ناقدین میں تھے۔ دوسرے اشتراکیت کے جو نمونے علی گڑھ میں اُن کے سامنے تھے اُنکو وہ کردار کے اعتبار سے نہایت گھٹیا سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے لیے مسلم یونیورسٹی جیسے ادارے میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ وہ ان سے اس وجہ سے بھی نالاں تھے کہ ان میں سے بعض صلاحیت رکھنے کے باوجود علمی کام دیانت کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ میں اس میں ان کا ہمخیال تھا۔ زیدی صاحب اس کے برخلاف خالص سیاسی انسان تھے۔ اسی لیے مارکسی نظریات کے نہ ہوتے ہوئے بھی اُن کے گھیرے میں آجاتے۔ یوسف میاں کے مزاج کی اس افتاد سے ذاکر میاں تک رنجیدہ مگر خاموش رہا کرتے۔ ایک طرف دوست اور دوسری طرف بھائی تھا اور بھائی بھی ایسا جس نے آڑے وقت میں ہمیشہ ان کی ناز برداری کی، لیکن زیدی صاحب کے احسانات کا بوجھ زیادہ تھا۔ خاص طور پر جب علی گڑھ آکر انھیں قلب کا دورہ پڑا تو زیدی صاحب اس وقت ریاست رام پور میں بڑے وزیر تھے، انھوں نے نواب رام پور کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ علی گڑھ سے ذاکر صاحب کو اپنی اسپیشل ٹرین میں بغرضِ علاج رام پور لے آئیں۔ میں اس وقت علی گڑھ اسٹیشن پر موجود تھا جب ذاکر صاحب کو گاڑی پر چڑھا دیا گیا تو اچانک نواب صاحب اُن کے ڈبے میں نمودار ہوئے اور کہا "ذاکر صاحب! اب آپ میری Juris-diction میں ہیں" (اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ اس وقت ہر والیِ ریاست کا حدِّ اختیار اس کی اسپیشل سے شروع ہو جاتا تھا) ذاکر میاں نے کہا "جی سرکار"۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا اس کے بعد ذاکر میاں رام پور سے علی گڑھ لوٹ آئے تب بھی نواب صاحب کی جانب سے دو نرسیں کئی مہینے تک۔ ان کی کوٹھی پر دیکھ بھال کے لیے تعینات رہیں۔

یوسف میاں کے جلال کا ایک اور مظاہرہ ان کے ریٹائرڈ ہونے اور دہلی میں بس جانے کے بعد نظر آیا۔ شملے سے واپس آنے کے بعد کچھ عرصے وہ ذاکر میاں کی کوٹھی کے ایک حصے میں مقیم رہے۔ اس وقت ذاکر میاں نائب صدرِ جمہوریہ تھے۔ جب مئی ۱۹۶۷ء میں وہ صدرِ جمہوریہ

ہو کر راشٹر پتی بھون میں منتقل ہو گئے تو یوسف میاں نظام الدین میں کرائے کے فلیٹ میں آ گئے۔

اب انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اگر انھیں دہلی میں ریٹائرڈ زندگی گذارنا ہے تو مختصر سے آشیانے کا ڈول ڈالنا چاہیئے۔ حیدر آباد میں بنجارہ ہلز پر اُن کا بڑا کشادہ بنگلہ تھا لیکن اب چونکہ دکن واپس جانے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیئے وہ اسے فروخت کرنے کی فکر میں تھے۔ اِس سے انھیں اس قدر رقم بآسانی مل جانے کی توقع تھی کہ وہ دہلی میں اپنی رہائش کے لیئے ایک آرام دہ فلیٹ بنا سکیں مسئلہ تعمیر کے لیئے زمین کا تھا۔ اس وقت انھیں یاد آیا کہ اوکھلے میں اُنھوں نے جامعہ بسنے کے ابتدائی زمانے میں ایک بڑا پلاٹ نہایت سستے داموں میں لے لیا تھا جس میں سے ایک تہائی انھوں نے ذاکر میاں کو اور ایک تہائی محمود میاں (وہ کچھ عرصے کے لیئے ڈھاکہ سے آل انڈیا ریڈیو کی سروس میں دہلی آ گئے تھے) تحفتہً دے دیا تھا۔ باقی ایک تہائی بھی ذاکر میاں کے بڑے داماد خورشید عالم خاں نے ان سے سستے داموں خرید لیا تھا۔ خورشید نے کچھ عرصے پہلے محمود میاں کا مکان (مع زمین) بھی اصل قیمت (تقریباً چودہ ہزار) ہی خرید لیا تھا۔ یوسف میاں کی خواہش تھی کہ اب اُن کی ضرورت کے موقع پر اس میں سے اس قدر زمین انھیں دے دی جائے کہ وہ ایک چھوٹا مکان تعمیر کر سکیں۔ کہتے ہیں کہ زمین پیر پکڑ لیتی ہے اور خاندانی جھگڑوں کی جڑ ہوتی ہے۔ اُن کی تجویز کو خورشید صاحب اور ان کی بیگم نے قبول کرنے میں ٹال مٹول کی۔ ذاکر میاں حسبِ معمول خاموش رہے۔ جب حاجت روائی کی کوئی شکل نہیں نکلی تو یوسف صاحب کو آخری بار جلال آیا اور انھوں نے اس بار براہِ راست ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، صدرِ جمہوریۂ ہند کو خط لکھا کہ اگر ان کے اس قدر احسانات کے باوجود انھیں زمین کے ایک قطعہ سے محروم رکھا گیا تو وہ راشٹر پتی بھون کے سامنے دھرنا دیں گے۔ ذاکر میاں نے صورتِ حال کو بھانپ لیا، وہ اپنے چھوٹے بھائی یوسف کے مزاج سے بخوبی واقف تھے انھوں نے اپنے داماد اور بیٹی سے کہا کہ یوسف کو سامنے کی ایک تہائی زمین سے ایک قطعہ دے دو۔ اور اگر تم لوگ ایسا نہیں کرو گے تو میں خرید کر دوں گا جس کی قیمت اب ہزاروں ہو گی۔ اس اخلاقی دباؤ کا اثر پڑا۔ یوسف میاں کو جامعہ نگر میں ایک قطعۂ زمین مل گیا جس پر بعد کو انھوں نے اپنا مکان تعمیر کر لیا اور دھرنا دھرا رہ گیا۔

یوسف و برادرِ یوسف کے اِس قضیئے کا ذکر جب کبھی خاندان میں ہوتا تو ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق رائے دیتا۔ میری رائے یہ تھی کہ قانونی اعتبار سے یوسف میاں کا اس زمین پر

کوئی حق نہیں ہے اس لیے کہ وہ کچھ عطیہ کے طور پر اور کچھ واجبی قیمت پر ان لوگوں کو دے چکے ہیں۔ ہاں اخلاقی حق ضرور پہنچتا ہے۔

اُس وقت ذاکر میاں کے یہاں میرے علاوہ ایک اور عزیز رحیم الدین خاں بھی مقیم تھے۔ وہ جامعہ ملیہ میں اسکول کے طالب علم تھے اور چوں کہ ان کا رجحان زیادہ تر کھیل کی جانب تھا اس لیے تعلیم سے خاطر خواہ بہرہ مند نہیں ہو پاتے تھے۔ چچی صاحبہ نے ان کو تعلیم یافتہ بنانے کی ذمہ داری میرے اوپر ڈال دی۔ چنانچہ میں ان کا خود ساختہ آتالیق بن گیا۔ وقت کی پابندی کے ساتھ زبردستی اُن کو پڑھانے کی کوشش کرتا۔ لیکن شاید اُن پر اپنا فوجی مستقبل روشن تھا، اس لیے دماغ میں کوئی چیز نہیں جمتی تھی۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ اسکول کے بچوں کے لیے کس قدر گھٹیا اُستاد ہوں۔ جہاں تحمّل کی سخت ضرورت ہوتی ہے وہاں میں ذرا ذرا سی خطا اور چوک پر آپے ہو جاتا تھا۔ شروع شروع میں سخت کلامی سے کام لیا۔ اس کے بعد سخت گیری پر اُتر آیا۔ حساب کے سوالات کی غلطیوں پر میں ان کی انگلیوں پر پیمانہ مارتا۔ اس سے بھی جی سیر نہ ہوتا تو طمانچے مار کر گال سُرخ کر دیتا۔ وہ بہت گورے رنگ کے تھے۔ اس لیے طمانچوں سے رنگ اور چوکھا ہو جاتا اور چہرہ تمتما اُٹھتا، آنکھوں میں آنسو آجاتے لیکن شاباش پٹھان بچے! کہ نہ کبھی اُف کی اور نہ کسی سے شکایت کی۔ ایک دن میرے بڑے بھائی امتیاز حسین خاں نے انھیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے علاحدہ لے جا کر سرزنش کی ۔ اس کے بعد اُن کا مجھ سے فیضیاب ہونے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ ابھی دو سال پہلے جب میں پاکستان ایک ثقافتی وفد کے رکن کی حیثیت سے گیا تھا تو اسلام آباد پہنچ کر میں نے اپنی چچا زاد بہن ثاقبہ کو (جو لفٹیننٹ جنرل رحیم الدین خاں کی بیوی ہیں) ٹیلیفون کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے دوسرے روز مجھے شام کے کھانے پر مدعو کیا تو لفٹیننٹ جنرل صاحب سے بھی ایک عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے اپنے اسکول کی عمر کے دو بچوں سے متعارف کرانے

ہوئے کہا کہ" مسعود بھائی میرے استاد بھی رہے ہیں۔ مگر سخت گیر استاد رہے ہیں۔ جب میں اپنی نالائقی کا ثبوت دیتا تھا تو میری انگلیوں پر کھٹ سے پیمانہ مارتے تھے"۔ میں نے کہا یہ صرف "نصف سچ" ہے، یہی نہیں میں ان کے گورے گورے گالوں کو گلنار بھی کر دیا کرتا تھا۔ رحیم الدین خاں اُس وقت پاکستانی فوج کے چیف آف اسٹاف تھے، اور جنرل ضیاء الحق کے سمدھی!

پانچواں باب

علی گڑھ (۱)

(۳۹ تا ۴۱ء)

۱۹۳۹ء کی جولائی میں اینگلو عربک کالج کی پوری ٹولی داخلے کے لیے علی گڑھ پہنچی۔ انعام الحق نے ایم۔ اے انگریزی میں داخلہ لیا۔ حبیب اللہ خاں نے فارسی کا انتخاب کیا (حالاں کہ میرے نزدیک اُن کی اردو بھی مشتبہ تھی) محمود علی نے ایم۔ اے فلسفے میں اور میں نے ایم۔ اے تاریخ میں۔ میرے داخلے کی کارروائی بہ نفسِ نفیس رشید احمد صدیقی صاحب نے اس طرح کی بغیر توجہ کیے میرے ہاتھ سے داخلہ کا فارم لے لیا اور "آئیے حضرت" کہہ کر میرے ساتھ اسٹریچی ہال میں جا نکلے، جہاں ان دنوں داخلہ کا بازار لگتا تھا۔ کلرکوں سے لے کر پرووسٹ اور دیگر اربابِ داخلہ تک بے شمار میزیں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں پر اندراج کرائیے یہاں ہال اور ہاسٹل کا انتخاب کیجیے، یہاں فیسِ داخلہ جمع کر کیجیے۔ ہر میز پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ پیروکار عام طور پر سینیر طلبہ یا رشید صاحب جیسے بعض اساتذہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ رشید صاحب کا جس میز کی طرف رُخ ہوتا ہے پرے کا پرا ہٹ جاتا ہے۔ کلرک ہو کہ اسسٹنٹ رجسٹرار ایک ہلکی سی اُٹھک بیٹھک لگاتا اور اُن کے فقرے کی تاب نہ لاکر جھٹ ان سے فراغت حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

اُس دن رشید صاحب کے وار بھرپور پڑ رہے تھے اور شاید ہی کوئی مردہ دل ہو جو اِس سودا اور اِن کے غمزہ سے پہلوتہی کرنے کی ہمت کرتا ہوں۔ لیجیے جو کام گھنٹوں میں ہوتا تھا منٹوں میں ہو گیا۔ اس دوران میں میری طرف سے مسلسل تجاہلِ عارفانہ رہا۔ ایک

دھیکا اور لگا۔ صاحب آخر میں مجھے داخلہ کا فارم تھماتے ہوئے کہا "لیجئے حضرت! باقی کام آپ کا ہے۔ فیس وغیرہ داخل کیجئے اور شعبۂ تاریخ کا رخ کیجئے۔"

ابھی میرے قدم شعبۂ تاریخ میں جمنے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک مورخ ہی کے ورغلانے پر میری مُراد پروفیسر مجیب سے ہے جو ان دنوں علی گڑھ آ نکلے تھے "اُکھڑ گئے" اور ہفتہ عشرہ کے اندر ہی تبدیلیٔ مضمون کی درخواست لیے سہما سہما شعبۂ اردو میں صورتِ سوال کھڑا تھا۔ رشید صاحب سے میں نے جب اپنی "اس نیت" کا تذکرہ کیا تو بولے: "خوب! یہ میں نے کب کہا تھا کہ آپ مجھ پر مسلط ہو جائیں" پھر ٹھونک بجا کر پوچھا "کیا بالکل طے کر لیا ہے؟" میں نے کہا جی ہاں ایک مورخ ہی کے کہنے پر۔ کہا "اچھا لائیے درخواست" اور شانِ بے نیازی سے اُس پر دستخط کر دیے۔

لیجئے اب میں شعبۂ اردو کا طالب علم بن گیا۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے مجھے آفتاب ہوسٹل میں جگہ بھی مل گئی جہاں سب کمرے "سنگل سیٹ" کے تھے اور جو "پڑھاکو" طالب علموں کا سب سے محبوب ہوسٹل تھا۔ شعبۂ اردو میں اس وقت کئی حضرات درس دیتے تھے لیکن ایم۔ اے۔ کو پڑھانے کی ذمہ داری رشید صاحب اور سرور صاحب تک محدود تھی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی لکچرر تھے لیکن ان سے مجھے شرفِ شاگردی کبھی حاصل نہیں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ خلوصِ جذبات یا حافظے کی فروگذاشت کی وجہ سے پاکستان میں جہاں بھی متعارف کرانے کا موقع ملتا ہے وہ مجھے فخریہ اپنا شاگرد بتاتے ہیں!

رشید صاحب کے نام نامی اور ان کی بعض تحریروں سے میں پہلے سے واقف تھا۔ میں اُن خصوصی تعلقات سے بھی واقف تھا جو اُن کے اور ذاکر میاں کے درمیان زمانۂ طالب علمی سے چلے آ رہے تھے۔ آل احمد سرور صاحب میرے لیے نئے تھے۔ وہ ابھی دو سال پہلے اردو میں پرائیویٹ ایم۔ اے کرنے کے بعد انگریزی سے منتقل ہو کر شعبۂ اردو میں آئے تھے۔ کہتے ہیں اُن کے اس فیصلے کو رشید صاحب اور ذاکر صاحب دونوں کی تائید حاصل تھی۔ بی۔ اے۔ تک وہ سائنس کے طالب علم رہے۔ یک لخت ایم۔ اے انگریزی کی جانب جھک پڑے اور

فرسٹ کلاس حاصل کیا۔ اس کے بعد اُردو میں بھی درجۂ اوّل میں کامیاب ہوئے۔ غرضکہ اردو ادب کے کامیاب استاد بننے کے لیئے پوری طرح مسلّح تھے۔ ان کا علم بھی مستحضر تھا۔ انگریزی اور اردو ادب کے تقابلی مطالعے سے اپنے لکچروں کو اور زیادہ پُر مغز بنا دیتے تھے۔ حافظہ اچھا پایا تھا اس لیئے جب اشعار نقل کرنے پر آجاتے تو دریا بہا دیتے۔ پڑھاتے بھی بہت لگن اور تیاری سے تھے۔ اس لیئے پوری کلاس اُن کی ہمہ دانی سے متاثر تھی۔

رشید صاحب کی ڈگر اس سے مختلف تھی۔ وہ انگریزی ادب سے بہت کم واقف تھے۔ البتہ فارسی شعر و ادب پر اچھی نظر تھی۔ پڑھانے میں ان کا جی بھی نہیں لگتا تھا اس کی تیاری بھی نہیں کرتے تھے۔ بنیادی طور پر وہ انشاء پرداز تھے۔ ان کا دائرۂ تدریس بھی محدود تھا یعنی غالبؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، جگرؔ، اصغرؔ اور چند مزاح نگار یا انشاء پرداز۔

سرور صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ’توازن‘ کا شکار ہیں، اس لیئے ادب میں کچھ بھی نہیں تول پاتے۔ ان کی تنقید پر یہ مصرع چسپاں کیا جاتا تھا ع

جنابِ شیخ کے نقشِ قدم یوں بھی ہیں اور یوں بھی

کبھی ترقی پسندوں کے ہم سفر ہے اور کبھی جدیدیوں کے رہبر ہے۔ ع

معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس برابر ست

رشید صاحب ترقی پسندی کو مسلسل مشتبہ نظروں سے دیکھتے رہے کسی جگہ لکھا ہے "ہر وہ ادبی تحریک جس کا مآخذ اور مصدر کعبہ و کاشی سے ماورا ہو میں اسے شبہ کی نظر سے دیکھتا ہوں" لیکن صلحِ کل کے مسلک رکھنے کی وجہ سے اگر ان کا کوئی فقرہ کسی کے لیئے ڈنک بن جاتا تھا تو فوراً معافی مانگ لیتے تھے۔

طالب علموں میں اکثر دونوں استادوں کا موازنہ کیا جاتا تھا۔ سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ رشید صاحب کی بات اپنی بات ہوتی ہے جب کہ سرور صاحب کی پرائی۔ دوسرے الفاظ میں سرور صاحب کا علم کتابی و اکتسابی تھا۔ رشید صاحب اس کے برعکس غالبؔ ہوں کہ اصغرؔ ان پر ذاتی تاثرات بیان کرتے۔ اس لیئے ان کا ایک ایک جملہ بصیرت کا نگینہ بن جاتا تھا۔ سرور صاحب کا علم قاموسی تھا۔ رشید صاحب

کا وجدانی۔ ہم لوگوں نے دونوں سے اپنے اپنے طور پر استفادہ کیا ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ دونوں استادوں میں آخر آخر میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ رشید صاحب کا خیال تھا کہ سرور صاحب کی وجہ سے انھیں ملازمت میں توسیع نہیں مل سکی۔ اس پر علی گڑھ کے حلقوں میں بہت دنوں تک چہ میگوئیاں بھی رہیں۔ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ جو اس قدر قریب رہے ہوں وہ اس قدر دور بھی جا سکتے ہیں۔ سرور صاحب نے ایک دو بار رشید صاحب کے دولت خانے پر حاضری دے کر معاملہ کو سلجھانا بھی چاہا لیکن رشید صاحب کے دل کی گرہ نہ کھلی۔

دونوں کے عقیدت مند اور محرمِ راز ہونے کی حیثیت سے میں یہ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آنے والی نسلوں کے لیے، واقعات جیسے کہ ہیں بیان کر دوں۔ رشید صاحب کی جانب سے لوگوں کی یہ شکایت کہ کرنل بشیر حسین زیدی سے قرب کی وجہ سے سرور صاحب نے رشید صاحب کی مدتِ ملازمت میں توسیع نہیں ہونے دی صحیح نہیں۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ رشید صاحب جب ۱۹۵۸ء میں حسنِ خدمت سے سبکدوش ہوئے، تو ان کی اصل عمر ۶۵ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ ملازمت میں توسیع دو سال کی ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب نے صرف پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر ہادی حسن کو خصوصی توسیع چار سال کی دی تھی۔ ظاہر ہے کوئی وائس چانسلر ۶۵ برس سے اوپر کے کسی استاد کو مزید توسیع نہیں دے سکتا۔ وجہ جواز صرف یہ پیدا کی جا سکتی ہے کہ رشید صاحب ہائی اسکول کے سارٹیفکٹ کے مطابق ۱۹۵۸ء میں صرف ۶۰ سال کے ہوئے تھے لیکن صحت اور کارکردگی کے اعتبار سے وہ اس سے کہیں زیادہ کے لگتے تھے۔ ان کی عدم کارکردگی کا اندازہ ان کے دوست اور مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین تک کو تھا جنھوں نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ "جب تک رشید صاحب شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں اس کی ترقی و توسیع ناممکن ہے۔"

رشید صاحب کی جانب سے اس معاملے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سرور صاحب کو اس معاملے میں خاموشی نہیں اختیار کر لینی چاہیے تھی، جیسی کہ انھوں نے کی۔ اس لیے کہ وہ عرصے تک رشید صاحب کی توجہ کا مرکز بنے رہے تھے۔ یہ ان کا اخلاقی فرض تھا کہ ان کی حمایت میں لب کشا ہوتے۔ رشید صاحب جیسے حساس انسان نے اسے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور پھر کبھی معاف نہیں کیا۔ اُن کی

دل شکستگی بار باران کے خطوط میں اُبھرآتی ہے۔

رشید صاحب اور سرور صاحب کی سیرتوں اور مزاجوں میں بھی بُعد المشرقین تھا۔ رشید صاحب کی شخصیت زیادہ کُھلی ہوئی تھی۔ صدیقی دونوں تھے لیکن رشید صاحب میں شیوخ کی آن بان بھی۔ ان کی پسند اور ناپسند بھی شدید تھی۔ ان کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی فیض رسانی اور کریم النفسی تھی۔ سرور صاحب نسبتاً دلِ تنگ رکھتے ہیں وہ ابتداء میں جس کو بڑھاتے ہیں آخر میں آخر میں اسی سے رشک کرنے لگتے۔ یہ میری نہیں اُن کے ایک اور عزیز شاگرد پروفیسر نور الحسن ہاشمی کی رائے ہے۔ معاشرتی سطح پر بھی طبائع کا تباین بہت زیادہ تھا۔ سرور صاحب کے یہاں تواضع کرنے سے زیادہ تواضع کروانے پر زور ملتا ہے۔ رشید صاحب کا اس اعتبار سے دسترخوان بہت کشادہ تھا۔ ان کے یہاں معقول نامعقول ہر قسم کے مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ خود سدا کے حاجتمند ہوتے ہوئے دوسروں کی حاجت روائی کرتے رہے۔ اسی لئے انسانی سطح پر ان کے رشتے ان کے دوستوں اور عقیدتمندوں سے زیادہ استوار رہے ہیں۔ وہ اچھا شاعر ہونے کے لیے اچھا انسان ہونا لازمی قرار دیتے تھے۔ اسی لیے اصغر اور جگر کے مقابلے میں انھوں نے جوش کو ہمیشہ نامعقول سمجھا۔ "کوئی نامعقول، معقول شاعر نہیں ہو سکتا" ان کا ایک قولِ محال تھا۔

سرور صاحب کے برعکس وہ بنیادی طور پر خلوت، خواص اور خانہ پسند تھے، ان کا گھر ان کا قلعہ تھا جو بقول خواجہ غلام السیدین انھیں کی طرح باہر سے ناہنجار اور اندر سے باغ و بہار تھا۔

سنہ ۱۹۴۱ء میں مَیں نے ایم۔اے اوّل درجہ میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اس میں میری صلاحیت سے زیادہ محنت کو دخل تھا۔ ورنہ بہتر ادبی ذوق رکھنے والے اور پختہ کار مسعود ذوقی مرحوم جیسے لوگ میرے ہم جماعت تھے۔ مولوی عبدالحق نے اردو زبان کے پرچے میں مجھے سو میں سے ۸۴ نمبر دیئے۔ سب سے کم نمبر سرور صاحب کے پرچے میں پائے یعنی کل ۷۰ نمبر۔ مجھے احساس ہے اس وقت تک میں انشاء پردازی کے لحاظ سے کمزور تھا۔ شاید یوں بھی تھا کہ اس کے بعد اُردو زبان میرا اوڑھنا بچھونا بننے والی تھی اور مولوی عبدالحق کے ہاتھوں اس میں ریکارڈ نمبر حاصل کرنے کے بعد میری خود اعتمادی بڑھ گئی اور میں نے بعد کو اسی کو اپنا موضوعِ تحقیق بنایا۔

علی گڑھ کے قیام میں میں نے صرف اپنے ادبی ذوق اور علمی افق ہی کو فراخ نہیں کیا بلکہ اس دور کی مسلم سیاست اور مسلمان کی امیدوں اور آرزوؤں کا بھی مجھے اندازہ ہوا۔ یہ زمانہ مسلم لیگ کے احیاء کا دور تھا۔ میرے ذہن کی تربیت جامعہ ملیہ کی قوم پرستی کی فضا میں ہوئی تھی۔ مذہب کی جانب میرا رویہ جامعہ ملیہ کے پنج وقتہ کے باوجود غالب کا سا بن چکا تھا۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس لیے میں نے اس دور کی مسلم لیگ کی سیاست کو محض ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھا۔ ہر دور میں علی گڑھ میں اشتراکی فکر رکھنے والوں کا ایک مختصر مگر منظم حلقہ رہا ہے۔ ادب میں یہی "ترقی پسند" کہلاتے تھے۔ میں بھی رشید صاحب کی طرح ان کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ دراصل مارکسزم میرے ذہن کو کبھی بھی زیر نہیں کر سکی۔ میرے ارد گرد جو نام نہاد ترقی پسندوں کے نمونے تھے وہ بھی متاثر کن نہیں تھے۔ شراب کا نشہ، سگریٹ کا دھواں، غیر اخلاقی اقدار یہ سب میری فطرت کے منافی تھیں۔ میں اچھی زندگی کو صحت مند مرتب زندگی سمجھتا تھا۔ مُلائیت کا نقاد تھا اور اشتراکیت میں مجھے ایک قسم کی مُلائیت کا ذہن کارفرما نظر آتا۔ وہی ہمہ کہ ہم صراطِ مستقیم پر ہیں۔ جو کھٹے کی فکر کو میرا ذہن کبھی قبول نہیں کرتا چاہے اس کا ماخذ کہیں سے ہو۔ میں اکثر دوستوں سے کہتا کہ دماغ بند ہی رکھنا ہے تو اسلام کیا بُرا ہے۔ فلسفیانہ سطح پر میں اس کا قائل بھی نہیں ہو سکا تھا کہ انسان معاشی حالات کا غلام ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کو فاعل مختار سمجھا اسی لیے شعر و ادب میں فرد کی انفرادیت کا قائل رہا۔ بہت بعد کو جب ۱۹۵۶ء میں میں نے اپنا مجموعۂ کلام "دو نیم" کا پہلا ایڈیشن شائع کیا (اب ۱۹۸۶ء میں دوسرا شائع ہو چکا ہے) تو تمہیدِ شعر کے طور پر یہ الفاظ لکھے تھے۔

"شاعرانہ شخصیت اپنے معاشرتی ماحول میں بے ہمہ اور باہمہ ہو کر اسی طرح سے گم رہتی ہے جیسے ہمارا معاشرتی دائرہ کائنات کے طبعی ماحول میں۔ لیکن جس طرح طبیعیات کے اصولوں کا سیدھا سادا اطلاق سماج کی گتھیوں

کو نہیں سُلجھاتا اُسی طرح معاشیات کے اصولوں کی ادب و شعر پر تطبیق بہت دور تک دست گیری نہیں کرتی۔ شعری عمل اُس وقت تک پُرکار نہیں بنتا جب تک اس میں کشاکشِ انفرادیت نہ ہو۔"

میں نے اسی خیال کا اعادہ اپنے اس دور کے ایک مضمون "سماج اور شعر" میں کیا تھا جو پہلی بار فکر و نظر (علی گڑھ) میں شائع ہوا تھا۔ جس پر قاضی عبدالودود سے داد اور کمیونسٹ پارٹی کے سرکاری آرگن کے ایک اداریے سے 'بیداد' ملی تھی۔ اس میں میں نے مارکس کا یہ اقتباس دیا تھا۔

"یہ امر واقعہ ہے 'فنونِ لطیفہ' کے اعلیٰ ترین ارتقاء کے بعض ادوار کا نہ تو اس عہد کے سماجی ارتقا سے بلاواسطہ رشتہ ہوتا ہے اور نہ اُس عہد کی مادّی بنیاد یا معاشرتی ڈھانچے سے۔"

اس کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"دراصل معاشی اور فنی اقدار کے اثرات دائرے کی شکل میں مرتب ہوتے ہیں اور یہ مختلف ادوار کی اپنی اپنی توانائی اور بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ کس درجہ خود کو حیاتِ معاشی کی بندشوں سے آزاد کر سکتے ہیں۔۔۔۔ مارکس اور اینگلز کی تحریروں میں ادب کو 'آلۂ کار' یا 'حربہ' کے طور پر استعمال کرنے کا تصور بھی نہیں ملتا۔ دراصل دونوں نشاۃ الثانیہ کے 'انسانِ کامل' کے تصور سے اس قدر متاثر تھے کہ انسان کی یک طرفہ معاشی زندگی کو سب کچھ سمجھنا اُن کے لیے ممکن نہیں تھا۔"

میرے لیے یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ میری مذہبی و سیاسی آزاد خیالی کی ماخذ کیا تھے۔ صرف قیاس کر سکتا ہوں کہ بچپن کا وہ آزاد خیال ماحول جس میں معتقدات کی کمی تھی یا شاید وہ نسلی امتیازات جو مجھے افغانی قبائلی زندگی سے وراثتاً ملے تھے جن میں شدید انفرادیت اور عقلیت شامل ہیں۔ میری بیوی نسوانی ضعیف العقیدگی کی بہت سی ذہنی باتیں بیان کرتی رہتی ہیں جس کا ردّعمل میں برسوں سے ان الفاظ میں پیش کرتا رہا ہوں "ابھی! یہ بات دماغ میں نہیں دھنستی"۔ یہ جملہ اب اُن کے لیے چڑ سی بن گیا ہے لیکن حقیقتِ حال یہی ہے،

جس بات کو ذہن قبول نہیں کرتا میرے لیے اس کو یقین کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے توہمات، مہمل روایات اور دیومالائی تصورات کو کبھی قبول نہیں کیا۔ اسی لیے قدیم ہندوستانی تہذیب کی تجدیدات کی جانب طبیعت نہیں جاتی۔ مجھے سنِ شعور سے جہاں مسلمانوں کی بہت سی خرافات سے چڑ رہی ہے، اشتراکیوں کے خود کو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر سمجھنے سے بھی اسی قدر بیزار رہا ہوں۔ میں اپنے دوستوں سے اکثر کہتا تھا کہ یہ بھی ایک طرح کے کٹ مُلّا ہیں جو سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جدلیاتی منطق سے حقیقت اور صداقت کو پا لیا ہے حالانکہ یہ دعویٰ مارکس نے بھی نہیں کیا ہے۔ پھر اپنے اردگرد ان کے چلتے پھرتے نمونے دیکھ کر اور ذاتی سطح پر خود کو ان سے بہتر پاکر اور زیادہ بیزار ہو جاتا۔ مزدوروں کا دم بھر کر آپ بورژوا طبقے کے عیش کے متلاشی رہیں، یہ کہاں کا کردار ہے! اسی لیے جس طرح میں ہمیشہ کٹ مُلّاؤں سے بحث و مباحثہ کرنے سے گریز کرتا تھا ان سُرخوں کو بھی دور رکھتا تھا اور بعد کو سلام مچھلی شہری کے اس مصرع سے خوب لُطف اندوز ہوتا رہا ع

مجھے بچاؤ کہ سُرخوں میں گھر گیا ہوں میں

ان لوگوں نے مجھے ہمیشہ صرفِ نظر کیا لیکن میں گھاٹے کے اس سودے پر رضامند رہا۔

علی گڑھ میں میرے دن بیشتر اپنے ساتھ گذرتے۔ صبح اٹھ کر ہلکی سی ورزش اس کے بعد کیوڑے سے دودھ میں گاجریں اور چھوارے ابال کر ان کا ناشتہ۔ ہاسٹل سے جو دو توس آدھی گولی مکھن اور چائے ملتی وہ میں اکثر بیرے کو دے دیتا۔ کالج سے واپس آنے کے بعد ہاسٹل سے جو کچھ ملتا اس پر اصلی گھی کا تڑکا لگا کر نوش کر جاتا۔ ہاسٹل کے سالن کے متعلق مشہور تھا کہ یہ سرسید کے نسخۂ کلاں کے بموجب پکایا جاتا ہے اس لیے اس کا نام چاہے قورمہ ہو یا دوپیازہ، مزہ یکساں ہوتا ہے۔ ترکاری کی پلیٹ میں موسم کی سب سے دستیاب اور سستی سبزی کو ترجیح دی جاتی۔ جولائی میں جب یونیورسٹی کھلتی تھی تو بھنڈی کا موسم ہوتا، بس تو پھر بھنڈی کا سلسلہ شروع ہو جاتا جس پر تار بہرحال وہی سُرخ رنگ کا ہوتا جو گوشت کے لیے علاحدہ سے تیار کیا جاتا۔ اور دال تو پتلی مشہور ہی ہے وہ کیوں کر اپنی شہرت پر بٹہ لگنے دیتی۔ گل جائے تو بہت سمجھیے۔ آفتاب ہاسٹل کی زندگی میں (میں پہلے سال کمرہ نمبر ۶۶ اور دوسرے سال کمرہ نمبر ۵۴ میں مقیم تھا) کھانا میرے لیے ہمیشہ مسئلہ بنا رہا۔ داخلہ لینے کے بعد انٹروڈکشن نائٹ کا سلسلہ آیا

روز رفع دفع ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ ایک سینیئر کی جانب سے اشارہ مل گیا تھا کہ آج کی رات بغیر
ریہرسل اشتہار ڈکشن ٹائٹ کی علی گڑھ میں تو وارد طلبہ پر جو بیت ہوتی ہے وہ وہی لوگ جانتے ہیں جو اس
سے گزر چکے ہیں۔ طرح طرح کے بیہودہ مذاق کیے جاتے ہیں۔ گانے کو کہا جاتا ہے وہ نہیں آتا تو بھی
ناچنے پر اصرار کرتے ہیں۔ غرض کہ چند گھنٹوں کے لیے نو واردوں کی عزت و ناموس ایک ہجوم کے ہاتھ میں
ہوتی ہے جو اپنے کو "سینیئر" کہتے ہیں۔ میں ایک سینیئر ہی کے اشارے پر ان سینیئروں کو ہاتھ دے گیا
یعنی شام کو دہلی کے لیے چمپت ہو گیا۔ چنانچہ رات کے سناٹے میں جب سینیئروں کی برات شور
مچاتی نکلی اور کمرے کمرے نو واردوں کی گرفتاری کا عمل شروع ہوا تو انھیں سخت مایوسی ہوئی
جب انھوں نے میرے کمرے میں بڑا سا تالا لگا دیکھا۔ آواز بلند ہوئی یہ تو بڑا استاد نکلا۔ ادھر
اُدھر نظر ڈالی تو انھیں میرے کمرے کے سامنے دیوار کے سہارے سے کھڑی ہوئی بانس اور
بانڈوں کی نئی کھاٹ نظر آئی جو میں دو روز قبل حسب روایت بھوسل گنج سے خرید کر یکے پر
لاد کر لایا تھا۔ نعرہ لگا اسی کو اٹھا لو۔ دوسرے روز جب میں دہلی سے واپس آیا اور ہاسٹل
کے سینیئروں کو میری واپسی کا علم ہوا تو دو طالب علم مجھے بلا کر ایک سینیئر کے کمرے میں لے گئے
جہاں پہلے سے کچھ طالب علم موجود تھے۔ کچھ طعن و تشنیع ہوئی۔ سزا کے طور پر کچھ گانے کو کہا گیا
مگر وہ ہجوم کی سی بات کہاں۔ سستا چھوٹا۔ چلتے وقت میں نے کہا میری کھاٹ تو واپس
کر دیجیے۔ کہا گیا وہ تو بحق سرکار ضبط کی جا چکی ہے۔

اس عرصے میں یونین طلبہ کی یونین کی سیاست سے بھی دور رہا۔ صرف ایک بار اپنے
ہم وطن اور دوست مختار آزاد کی خاطر یونین کا الیکشن لڑانے میں حصہ لیا تھا جس میں
شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ رات کو رسم کے مطابق شکست خوردہ امیدوار کا جنازہ نکلا۔
اس کے قاصد خاص کام کرنے والوں کی تلاش ہوئی۔ اس رات بھی میں کمرے کے بجائے میکڈانل
ہاسٹل کی دیوار کے سائے تلے آرام کر رہا تھا۔ لیکن جن کا نام مختار آزاد تھا وہ بڑی مٹی کھال
کے سیاست باز تھے۔ اس کے بعد بھی سکریٹری شپ اور نائب صدارت کے امیدوار بن کر میدان
مقابلہ میں اترتے رہے۔ بالآخر جو یندہ یابندہ ایک سال کامیاب ہوئے اور نائب صدر
منتخب کر دیے گئے۔ اس کے بعد میری اُن سے ملاقات دہلی میں ہوئی اور میں نے

علی گڑھ کا حال پوچھا تو ایک حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ بولے: "کیا پوچھتے ہو، بس اس سے اندازہ کرلو کہ علی گڑھ نے مجھے یونین کا نائب صدر منتخب کر لیا ہے!" میں اس خود شناسی و احتسابی پر ہکا بکا رہ گیا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر گئے، وہاں بھی نچلے نہیں بیٹھے۔ کراچی میں مزدور یونین کے سکریٹری بن گئے۔ چوں کہ ان کا خلوص اپنی ذات سے ہوتا تھا اس لیے اس کے لیے کچھ فوائد کارخانہ داروں سے حاصل کر لیے۔ مزدور بگڑ گئے اور پکڑ کر خوب مرمت کی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

علی گڑھ میں ایم۔اے (اردو) کے دو سال میری ذہنی ریاضت کا زمانہ تھا، اور ادبی تربیت کا بھی۔ شعبۂ اردو میں عرصۂ دراز سے دو ادبی انجمنیں کام کر رہی تھیں۔ اردوئے معلی اور حدیقۃ الشعرا۔ ان کے تحت ادبی نشستیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ علی گڑھ کے ابھرتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے لیے یہ پلیٹ فارم کا کام دیتی تھیں۔ ان میں اراکین شعبہ رشید احمد صدیقی آل احمد سرور، معین احسن جذبی، ڈاکٹر محمد عزیز، خورشید الاسلام کے علاوہ مولوی ضیاء احمد بدایونی اور دیگر اہل ذوق شرکت کرتے۔ رشید صاحب اپنے طالب علموں کا حوصلہ بڑھانے میں کمال رکھتے تھے۔ ستائش کے ایسے جملے کہہ جاتے کہ ممدوح تک شرما جاتا۔ ان کا مقولہ تھا کہ میرا اس میں کیا بگڑتا ہے آپ لوگوں کا بھلا ہو جاتا ہے۔ کاش چھوٹوں کا دل بڑھانے کا یہ جمع خرچ ہمارے دوسرے اساتذہ کو بھی آتا۔

ایم۔اے کے دوسرے سال میں سو نمبر کے ایک پرچے کے بجائے کسی موضوع پر مختصر سا مقالہ لیا جا سکتا تھا۔ میں نے "پریم چند کی افسانہ نگاری کے دور" اپنے لیے موضوع منتخب کیا اور توقع سے زیادہ اس میں کامیابی حاصل کی۔ اس وقت تک، یعنی ۱۹۴۰ء تک، پریم چند کی افسانہ نگاری کے بارے میں بہت زیادہ نہیں لکھا گیا تھا اسی لیے اس مقالے کے بعض ابواب مختلف رسائل اور کتابوں کے لیے نقل کر کے بھیجے جاتے رہے۔ اب پریم چند پر مستند اور غیر مستند خاصا تنقیدی مسالہ جمع ہو گیا۔

اردو ایم۔اے کی تعلیم ہی کے دوران میری ہندی دانی کی بنیاد پڑی۔ایم۔اے کے پہلے سال میں ایک مشترکہ پرچہ فارسی اور ہندی کا ہوتا تھا۔ ہندی پڑھانے کا انتظام یک نفری شعبۂ ہندی میں تھا جہاں پنڈت رام سروپ شاستری طلبہ کے انتظار میں اپنے شعبے میں گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ اس زمانے میں علی گڑھ میں طلبہ عام طور پر ہندی سیکھنے سے گریز کرتے تھے۔ میں شامت کا مارا ایک دن پنڈت جی کے شعبے کی جانب جا نکلا جو اس وقت شعبۂ انگریزی کے کونے پر ڈیڑھ کمرے اور نصف چپراسی پر مشتمل تھا۔ انھیں جب کوئی طالب علم مل جاتا تو اسے عبادت کے طور پر پڑھاتے۔ گھنٹہ بھر کے بجائے دو گھنٹے دیتے۔ اس خلوص کے باوجود طالب علم بہت جلد فارغ التحصیل، ہو کر بھاگ جاتے۔ چوں کہ میں اپنی درسی ذمہ داری کو نہایت سنجیدگی سے ادا کرنے کا عادی تھا، اس لیے پنڈت جی نے مجھے مکمل طور اپنے چنگل میں لے لیا۔ کسی روز اگر غائب ہو جاتا تو چپراسی بھیج کر مجھے آفتاب ہاسٹل سے (جو بالکل سامنے تھا) بلوا لیتے ابتدا میں تو مجھے یہ پکڑ دھکڑ اچھی نہیں معلوم ہوئی لیکن جب رفتہ رفتہ ہندی میں درک ہوتا گیا تو میرے ان کے درمیان 'گرو' اور 'چیلے' کا سا رابطہ قائم ہو گیا۔ کہتے تھے کہ "مجھے اب تک صرف دو پُرخلوص طالب علم ملے ہیں۔ سنسکرت میں اختر حسین رائے پوری اور ہندی میں مسعود حسین خاں"۔ آج یہ سوچتا ہوں کہ ہندی دانی میرے کہاں کہاں اور کس کس رنگ میں کام آ رہی ہے تو پنڈت جی کی یاد میں میرا سر احسان مندی سے جھک جاتا ہے۔ میری بعد کی گیت نگاری اور تاریخی لسانیات میں تحقیقی کام اسی ہندی دانی کی بدولت ممکن ہو سکا جو پنڈت جی کی دین ہے۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں ایم۔اے۔ کے امتحان سے فارغ ہوا تو ایک عجیب خلائے بافراغت کا احساس ہوا۔ امتحان کی تیاری اور فرسٹ کلاس پانے کی دُھن میں وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ اب فراغت تھی ایک خلاء کے احساس کے ساتھ۔ اب آنکھیں منزلِ مقصود سے ہٹ کر اندر کی جانب کھلنے لگیں۔ جب میں ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ آیا تھا تو مجموعی طور پر درجۂ اول کا طالب علم تھا لیکن اردو میں میری استعداد بہت اچھی نہیں تھی۔ اس کا سبب میں تیسرے باب میں بتا چکا ہوں، میرا چار سال کا قیام ڈھاکہ تھا۔ اس لیے علی گڑھ کے دو سالہ قیام میں

مجھے نہ صرف اردو ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا موقع ملا بلکہ رشید احمد صدیقی جیسے منجھے ہوئے انشاء پرداز کے 'فقروں' سے بھی ہمہ وقت سابقہ پڑا، جن پر علی گڑھ جان دیتا تھا۔ ایک بزرگ تو قبل از وقت موت تک کے لیئے تیار تھے، بشرطیکہ رشید صاحب انھیں 'اپنے گنجہائے گراں مایہ' میں جگہ دے دیں۔ رشید صاحب اس پر آمادہ نہیں ہوئے اس لیئے وہ ابھی تک بقیدِ حیات ہیں۔

رشید صاحب اور سرور صاحب کی عبارت اور اشارت ہی پہ کیا، اِس عہد کا اردو کا طالب علم علی گڑھ کے در و دیوار سے 'اردو تہذیب' کے آثار و اثرات کو جذب کرتا تھا۔ علی گڑھ نے دہلی و لکھنؤ کے ادبی اسکولوں کی حد بندیوں کو توڑ دیا تھا۔ لہجہ کے فرق کے باوجود تحریر و نگارش کی درجہ بندی ہو گئی تھی۔ جو مسلم یونیورسٹی کے اربابِ حلّ و عقد سے اپنی انگریز اور انگریزی پرستی کی وجہ سے نہ ہو سکا، وہ طالب علموں کی یونین، مختلف ہاسٹلوں اور شعبوں کی انجمنوں اور 'کافی د 'پھوس' جیسے ریستوران کی ادبی نشستوں اور مباحثوں نے کمی پوری کر دی۔ ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ ہر نئی کتاب پر 'رائے آرائیاں' ہوتیں، گرما گرم بحثیں جن کا انجام اکثر بخیر نہیں ہوتا تھا۔ 'اس' سے ذہن کو جِلا ملتی۔ میں مُقرّر سے زیادہ سامع کا رول ادا کرتا لیکن بہر حال 'انجذاب' کا عمل جاری رہتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر تقسیمِ ملک کا حادثہ پیش نہیں آتا تو علی گڑھ متحدہ ہندوستان میں اردو کا سب سے بڑا گڑھ بن جاتا۔ سنہ ۱۹۴۰ء کے علی گڑھ میں اس کے آثار موجود تھے۔ انگریزی کا طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ ہندی کا دور دور نہیں تھا۔ خود شعبۂ انگریزی کے اساتذہ اور طلباء میں اردو میں لکھنے اور کمال حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ خواجہ منظور حسین جیسے محترم اساتذہ اِن کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔ سرور صاحب جیسے 'دودھاری' شعبۂ انگریزی سے اردو میں منتقل ہو رہے تھے۔ رشید صاحب کا مکان باہر سے آنے والوں کے لیئے 'ادبی قیام گاہ' بنا ہوا تھا، جہاں سید سلیمان ندوی سے لے کر حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی تک کا اجتماعِ ضدّین ہوتا اور نونہالانِ علی گڑھ کو آدابِ نشست و برخاست سیکھنے کا موقع ملتا۔

میں اب اردو زبان کے رموز و نکات سے آشنا ہونے لگا تھا۔ الفاظ کے طلسمِ معنی کو سمجھنے اور ان میں احساس کی بھری ہوئی بجلیوں سے متاثر ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔

زبان کی قواعد کا بھی علم ہوا اور اس کی بے قاعدگیوں کا بھی۔ مجھے پہلی بار انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں زبان کا جو رول ہوتا ہے اس کا احساس ہوا۔ اور جس قدر یہ احساس گہرا ہوتا گیا میری اردو زبان سے محبت فزوں تر ہوتی گئی۔ اسی لئے میں نے اوپر اردو کو ایک تہذیب کہا ہے۔ اب میں مذہب سے ہٹ کر زبان کی اصطلاحوں میں سوچنے لگا۔ خاص طور پر اس کے انشاء پردازانہ اور شاعرانہ استعمال کے بارے میں اور اب مجھے اس قسم کے اشعار 'تعلّی' نہیں 'نکتہ راز' معلوم ہونے لگے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اس طرح میرا شغفِ شعر اور مطالعۂ شعر بڑھتا گیا۔ یہ سب ایک طرح سے ذہنی تیاری تھی اس 'نزولِ شعر' کے لئے جس کا آغاز سال بھر بعد ۴۲ء سے شروع ہو جاتا ہے۔

میری علی گڑھ میں تربیتِ شعر نہ ہوتی تو سخنوری تو کجا شاید سخن فہمی کی بھی نوبت نہ آتی۔ میں نے اس کا ایک عبرتناک منظر علی گڑھ ہی میں دیکھا تھا۔ جگر صاحب علی گڑھ تشریف لائے ہوئے تھے۔ حسبِ معمول رشید صاحب کے یہاں ان کا قیام تھا۔ رشید صاحب اپنے مہمان کی آمد پر تو مسرور ہوتے لیکن مہمان کے مہمانوں سے پریشان رہتے۔ خیر ایک سہ پہر جگر صاحب کے اعزاز میں مولوی ضیاء احمد بدایونی نے ایک مختصر سی نشست اپنے دولت کدے پر رکھی۔ میں بھی موجود تھا۔ جگر صاحب اس روز بہت موڈ میں تھے اور لہک لہک اپنا تازہ کلام سناتے رہے۔ چوں کہ مجمع مختصر اور سخن فہموں پر مشتمل تھا، خوب خوب داد مل رہی تھی۔ حاضرین میں فلسفے کی پروفیسر عمرالدین صاحب بھی تھے جنھیں ضیاء احمد صاحب نے برنبائے خلوص مدعو کر لیا تھا۔ چوں کہ سخن فہمی کی جانب سے معذور تھے اس لیے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے خاموشی کے ساتھ ہر شعر کے انجام پر غور کرتے رہے۔ اُن کی سمجھ میں مطلق نہیں آ رہا تھا کہ اہلِ مجلس اس قدر پھڑک کیوں جاتے ہیں۔ نشست کے خاتمے پر جب ہم لوگ اپنے اپنے جوتے پہننے میں مصروف تھے تو جگر صاحب نے مجھ سے آہستہ سے اشارہ کرکے پوچھا "مسعود صاحب! یہ کون بزرگ ہیں" میں نے کہا "آپ نہیں جانتے! یہ فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ کیوں کوئی خاص

بات؟" کہنے لگے "نہیں کوئی ایسی خاص بات نہیں البتہ کلام سناتے وقت میں دیکھ رہا تھا کہ میرے شعر مسلسل اُن سے ٹکرا کر واپس آجاتے تھے!"

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس زمانے میں سخن فہمی اور سخنوری کے لیے علی گڑھ سے بہتر کوئی محفل نہیں تھی۔ اختر انصاری، مجازؔ، سردار جعفری، جذبی، جاں نثار اختر، اختر الایمان، راز مراد آبادی شکیلؔ بدایونی، مسعود علی ذوقی بزم پہ چھائے ہوئے تھے۔ ان میں میرا ربط ضبط زیادہ تر اختر انصاری اور جذبی سے رہا۔ دونوں شعبۂ اردو میں میرے رفیق کار رہے۔ ایک 'نرگسیت' کا شکار تھا تو دوسرا 'خود رحمی' کا۔ لیکن دونوں نے اپنی ذہنی پیچیدگیوں کے اظہار کا وسیلہ شعر کو باکمال طریقے پر بنایا ہے۔ اختر الایمان کے بارے میں مجھے کبھی خیال نہیں آیا کہ وہ اس قدر کامیاب نظم نگار بنیں گے۔ جاں نثار اختر کی نزاکت خیال اور نازک احساسات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا تھا۔ سردارؔ بہت جلد علی گڑھ سے نکل (بلکہ نکال دیئے گئے) گئے تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات علی گڑھ آنے سے قبل اینگلو عربک کالج میں ہوئی تھی جہاں میں تھرڈ ایئر کا اور وہ فورتھ ایئر کے طالب علم تھے۔ رازؔ، شکیلؔ، اختر سعید خاں اور ایسے بے شمار شاعر مشاعروں کے مرد میدان تھے اور اپنے ترنم کی وجہ سے پہچانے جانے جاتے تھے۔ مشاعرے کالج میں بھی ہوتے تھے لیکن علی گڑھ کی نمائش کا مشاعرہ بڑی دھوم دھام سے آتا۔ باہر سے آئے ہوئے اساتذہ کے درمیان علی گڑھ کے تازہ واردانِ بساطِ شعر اپنے بال و پر کھولتے۔ صنفِ نازک سے داد مل جاتی تو پھولے نہ سماتے۔ شاعر ہونے کے لیے 'شاعر' لگنا بھی ضروری تھا۔ بڑے بڑے بال، سفید علی گڑھ کٹ پاجامے پر سیاہ سرج کی شیروانی (عصمت چغتائی کی زبان میں کوڑیالے) جس کے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے، ترکی ٹوپی تہ کی ہوئی احتیاط سے جیب میں رکھی ہوئی (تاکہ بوقت ضرورت کام آئے) ایک نگاہ غلط انداز کے ساتھ گھنٹوں یار دوستوں کے ساتھ، نمائش گاہ میں تیز برقی قمقموں کی روشنی میں چکر پہ چکر لگاتے۔ اپنی یا کسی دوست کی جیب میں پیسے ہوئے تو کباب پراٹھوں کی دوکانوں کی جانب جا نکلے اور خورجہ کے شلجم کے اچار کے ساتھ، گرما گرم بحث میں لقمۂ گرم نوش کیا۔ یہ معمول تقریباً دس بارہ روز تک رہتا۔ سیاہ برقعوں میں ملبوس (بقول شخصے کالی ناگنیں) جب سُرسراتی نمائش گاہ میں داخل ہوتیں تو دلوں کی دھڑکنیں بڑھ جاتیں۔ لیکن اسلامی سماج کی:

ہائے ری! مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں

ایک جاں نثار اختر "گرلس کالج کی لاری" پر ایک رومانی نظم لکھ مارتا اور ایک مجاز کو "نمایش" میں حسن کے یہ پیکر نظر آتے:

وہ کچھ دوشیزگانِ ناز پرور
کھڑی ہیں اک بساطی کی دکاں پر
وہ رخساروں پہ ہلکی ہلکی سرخی
لبوں میں پرفشاں روحِ گلِ تر
تبسم اور ہنسی کے نرم طوفاں
فضاؤں میں مسلسل بارشِ زر

اور جب شباب سے انقلاب کی جانب گریز ہوتا تو یہ مشورہ دیا جاتا ہے

تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا (مجاز)

تسکین اور ذوقِ نظر دونوں کی کمی اور حجاب و نقاب کی زیادتی سے ایک اختر انصاری کے رومان میں بھی ازمنہ وسطیٰ کی ایذا پرستی کی لذت پیدا ہو جاتی:

یہ شاعری نہیں ہے تمنا کی قبر پر
تعمیر ایک تاج محل کر رہا ہوں میں

اور کبھی ایک جذبی کے یہاں ملال کی یہ جلتی ہوئی کیفیت ملتی ہے

وہ جو خوددار ہیں، خوددار رہیں اے غمِ دل
اُن سے کہہ دو کہ تمہیں یوں تو نہ چاہے گا کوئی
ڈوبتے چاند کی سوگند نہ جاؤں گا وہاں
میری بے خواب نگاہوں کو نہ سمجھے گا کوئی

میں علی گڑھ کے اس ادبی ماحول کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن مارچ ۱۹۴۱ء میں ایم۔اے کا امتحان دینے کے بعد زندگی کی نئی جولاگاہوں کی تلاش میں نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ دو سال کے بعد رومانوں کے اس شہرِ طرب اور دیوانوں کے اس دشتِ جنوں کو مراجعت مقدر ہو چکی تھی البتہ اس عرصے میں پہلے غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی گزرگاہوں سے گزرنا لازم تھا۔

چھٹا باب

(کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں)

اردو ایم۔اے کے انہماک میں نہ تو حال کا احساس ہوتا تھا اور نہ مستقبل کی فکر لاحق تھی۔ ۲۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو جب امتحان کا آخری پرچہ کرکے ہاسٹل لوٹا تو ایسا معلوم ہوا جیسے مہینوں کی تھکن سوار ہو گئی ہو۔ بیکار ہو جانے کا احساس الگ تھا۔ علی گڑھ اب کاٹنے لگا، اِس لیے فوراً دہلی کے لیے روانہ ہو گیا، وہاں بھی جی نہ لگا تو وطنِ مالوف قائم گنج کی راہ لی۔ وہیں مجھے امتحان کے نتیجے سے آگاہی ہوئی۔ فرسٹ کلاس فرسٹ۔ فرسٹ کلاس تو یقینی تھا لیکن رؤف رونی جیسے 'پڑھو' اور مسعود علی ذوقی جیسے صاحبِ ذوق اور پختہ کار سے مقابلہ تھا۔ یہاں بھی وقت نہ کٹتا اگر آموں کی فصل نہ آجاتی! ان سے نبٹنا بھی ہم لوگوں کی زندگی کا ایک اہم مشغلہ تھا ننہال بھری پُری اور خوشحال تھی۔ خاندانی باغات تھے۔ ہر باغ سے 'جنس' مقرر ہوتی۔ اس لیے جب آموں کا موسم شروع ہوتا تو ان کی بھی آمد ہونے لگتی۔ آجکل کی طرح منافع کی خاطر قبل از وقت اُجاڑ نہیں کیا جاتا تھا اس لیے لذّتِ کام و دہن کی آزمائش کے لیے طویل مدت ملتی۔ ہر وقت قلمی اور دیسی آم لگن میں بھیگے رہتے اور نوجوانانِ خاندان ان پر ہاتھ مارتے رہتے۔ جب یہ شہد بھری صراحیاں ہاتھ آجاتیں تو گندم و گوشت کی کس کو پروا رہتی۔ ایک بار میرے تیسرے ماموں غلام ربّانی تاباں نے شرط بد کر ۴۲ دسہری آم ایک نشست میں کھائے تھے۔ چھوٹے ماموں خورشید عالم خاں۔ تو اس زمانے میں کھانا ترک کر دیتے، بس آم ثُمّ آم، یہاں تک کہ معدہ

ساتھ چھوڑ جاتا۔ آموں کے ساتھ دودھ بھی بہ کثرت استعمال میں آتا کہ ان کا بدرقہ کہا جاتا ہے۔ چوں کہ گھر کی بھینسیں تھیں اس لیے دودھ کی ہانڈی صبح سے شام تک چولھے پر چڑھی رہتی جہاں یہ نہایت خفیف درجۂ حرارت پر اُبلتا رہتا۔ چند گھنٹے میں اس پر ملائی (یہاں بالائی بہتر) کی اس قدر موٹی سُرخ تہ جم جاتی کہ دیکھ کر دل پھسل جاتا۔ گھر کی مالک یعنی نانی صاحبہ ("بی") کی قدغن تھی کہ خبردار ملائی کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ وہ اس کو بلو کر مکھن اور گھی نکالتی تھیں۔ اصلی گھی اور گھی، آج کے برعکس صحت کے لیے گوشت سے کم نہیں سمجھے جاتے تھے۔ قائم گنج میں اُڑد کی دال اور تورے کے لیے خالص گھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مجھے بچپن سے ملائی کا چسکا پڑا ہوا تھا۔ میں بھی کرشن بھگت کا دیہ کا "ماکھن چور" تھا۔ فرق اتنا تھا کہ میں خود نہیں چراتا تھا بلکہ اس کے لیے دوسروں کی خدمات حاصل کرتا تھا۔ گھر ماموں زاد بہنوں سے بھرا ہوا تھا۔ جن میں اختری اور نجمہ بڑی تھیں۔ عمر اس یوں ہی بارہ تیرہ سال کی ہوں گی۔ نجمہ کو زیادہ بھولا پایا کہ اُسے یقین دلایا کہ چوری کی ساری ذمہ داری چوری کرانے والے کی ہوتی ہے نہ کہ چوری کرنے والے کی۔ چنانچہ خاص طور پر مغرب کے اندھیرے میں وہ اپنا کام کر جاتی اور پرچ بھری سُرخ تہ دار ملائی میرے کام و دہن کے کام آتی۔ اس قدر احتیاط کی جاتی تھی کہ دودھ کی "ملیا" (ہانڈی) سے ساری کی ساری ملائی غائب نہ ہو جائے، صرف ایک حصّہ چمچے سے کاٹ کر نکال لیا جائے۔ لیکن اکثر اس پر کہرام مچ جاتا اور مجھے ع

میّا! میں ناہیں کھایو ماکھن روٹی

کی صفائی پیش کرنا ہوتی۔ نانی صاحبہ بہت چیخ و پکار کرتیں۔ مختلف ملازموں اور ملازماؤں پر شبہ کیا جاتا۔ لیکن کبھی یہ سُراغ مل جاتا کہ اس سے فیض یاب کون ہوا ہے تو مجھے نہایت فراخ دلی سے معاف کر دیتیں: یہ کہہ کر کہ وہ تو چھٹیوں بھر کا مہمان ہے۔ البتہ نجمہ کو سخت تنبیہہ کر دی جاتی۔

اِس ملائی چوری کے عمل میں اور جو ہوا سو ہوا مجھے نجمہ سے یک لخت دلچسپی کا احساس ہونے لگا۔ وہ مجھے زیادہ اچھی لگنے لگی، چھوٹا سا قد، نورجہانی خط و خال، "گدرایا سا جسم" ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب وہ بچپن کی سرحدیں پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ لیکن اس بات کا سرا بعد کو اٹھایا جائے گا۔

۱۹۴۱ء میں گرما کی تعطیلات گزارتے وقت میرے سامنے وہی مسئلہ تھا جو ہر نوجوان کے سامنے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ ملازمت کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ ہر چند اردو ایم۔ اے۔ اس وقت نیا نیا تھا اور اس کے فارغ التحصیل بھی زیادہ نہیں تھے، لیکن ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد لوگوں نے بھانپ لیا تھا کہ اس ڈگری کی زیادہ وقعت نہیں۔ ہر کوئی کہتا انگریزی میں ایم۔ اے کیوں نہیں کیا۔ تاریخ بھی بری نہیں تھی۔ چنانچہ ٹھالی بنیا کیا کرے اس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی میں، میں نے بھی ڈبل ایم۔ اے کی ٹھان لی۔ اس بار علی گڑھ کے بجائے دہلی کا رخ کیا۔ اور فلسفہ کو اپنا ہدف بنایا۔ زبان و ادب کا طالب علم ہونے کے باوجود فلسفے سے میری دلچسپی پُرانی تھی اور بھی طور پر اناپ شناپ اس کی کتابیں پڑھنا میرا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ چنانچہ اُپنے اس پُرانے شوق کو پورا کرنے کے لیئے میں نے اردو سے بھی زیادہ بے مصرف مضمون 'ایم۔ اے۔ فلسفہ میں دہلی جا کر داخلہ لے لیا۔ اب میں ہندو کالج کا طالب علم بن گیا جو اس وقت کشمیری گیٹ میں واقع تھا۔ کالج میں فلسفے کے تین استاد تھے۔ ڈاکٹر سکینہ، ڈاکٹر اندرسین اور پریم چند۔ ایم۔ اے کی کلاسوں کے درس کی ذمہ داری اوّل الذکر دو حضرات کے سپرد تھی۔ سکینہ صاحب رندِ شاہد باز تھے۔ جوش کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ ان کا ذکر جوش نے اپنی خود نوشت یادوں کی برات میں کیا ہے۔ ہر کالیستھ کی طرح طلاقتِ لسانی اور لطیفہ گوئی پر قدرت رکھتے تھے۔ اندرسین ان کے برعکس تھے۔ ایک منظم اور مرتب شخصیت کے مالک۔ جرمنی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ لائے تھے۔ علم حاضر تھا۔ بات رک رک کر اور سوچ سوچ کر ایک فلسفی کی طرح کرتے اور ہندو کالج کے ماحول کے نہیں معلوم ہوتے تھے چنانچہ ان کا حشر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ چند ہی سال کے بعد ملازمت چھوڑ کر پانڈیچری کے آشرم چلے گئے۔ ایم۔ اے کی کلاسوں میں صرف چار طالب علم تھے۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ لڑکیوں میں اس زمانے کے مشہور سرجن ڈاکٹر جوشی کی صاحبزادی بھی تھیں۔ لڑکوں میں دہلی کے کالیستھ گھرانے کے نگم تھے۔ وہ میرے ہمدم و ہم راز تھے۔ لیکن کالج سے نکلنے کے بعد زمانے میں ایسے گم ہوئے کہ عرصۂ دراز تک ان کا سراغ نہ مل سکا۔ ایک دن جب میں جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر تھا، تو اچانک نمودار ہوئے۔

میں نے پہلی نظر میں انھیں پہچان لیا۔ دیر تک بیٹھے باتیں ہوا کیں۔ وعدہ وعید ہوئے کہ ملتے رہیں گے لیکن پھر پتہ نہ چل سکا وہ کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔

اس زمانے میں ایک بار پھر میں اپنے بڑے چچا ذاکر میاں کے یہاں دنصف مہمان کے طور پر مقیم تھا۔ یعنی جگہ کی قلّت کی وجہ سے میں نے مکتبہ جامعہ سے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ البتہ کھانا چچا کے یہاں کھاتا تھا۔ اُن کی بڑی بچّی اب سیانی ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی خیال میں آتی تھی، لیکن میں ابھی برسرِ روزگار نہیں تھا اور تھوڑے ہی عرصے میں گھر والوں کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ہم دونوں کی طبائع ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

یاد نہیں پڑتا کیوں، لیکن ایم۔ اے فلسفہ کے پہلے سال کی کلاسوں میں شرکت کرنے کے بعد میں نے اچانک امتحان نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے سمجھایا بھی لیکن اب مجھے قائم گنج پھر بُلا رہا تھا۔

اپریل ۲ا۴ء، پھر وہی قائم گنج اور مَیں۔ وہی آم، وہی مَلائی وہی مردانے گھر کی طویل بیٹھکیں۔ صرف فرق یہ تھا کہ شاعری کی دیوی نے گُدگُدانا شروع کر دیا تھا۔ ہندی کے چھایا وادی گیت نگار اور ٹیگور کی گیتان جلی زیادہ تر زیرِ مطالعہ رہتے۔ اچانک معلوم ہوا کہ سینے میں دلِ گداختہ پیدا ہو چکا ہے۔ محبت اور پریم ایک لامحدود عمل کا تسلسل معلوم ہونے لگا۔ کس کا پریم، یہ نہیں بتا سکتا، بہرحال تھا؛ وہ یوں پہلا گیت بن کر پھوٹا!

یہ کیا کہتے ہو تم پریتم!
ختم ہوئی وہ بات
پھول کے کان میں جو بھونرے نے
گُن گُن کر کے گائی
منھ سے کہہ نہ سکی جو تم سے
آنکھوں نے بتلائی

ختم کہاں وہ بات
وہ چلتی دن رات
ہم دونوں کا جیون اِس کے
سامنے اِک پرچھائیں
وقت کی چپ چپ بہتی گھڑیاں
اِس کو ناپ نہ پائیں
کھائی مات پہ مات
ختم کہاں وہ بات (۶۴۲)

میری شاعری میری زندگی ہے۔ جو اِس 'خود نوشت' میں نہیں ملے گا وہ در پردہ اِس میں مِل جائے گا۔ اِسی لیے میں نے اِس کا جا بجا سہارا لیا ہے۔ میں اب بھونرے اور پھول کا ذکر کر رہا تھا، آنکھوں کی اُلجھی بولی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، ہم دونوں کا پہلی بار تذکرہ زبان پر آنے لگا تھا، اور اِس عزم کا اظہار کہ وقت ہمارے اپار پریم کو ناپ نہ پائے گا۔ شرحِ دل کے اِس سے زیادہ اشارے اور کیا فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ یقیناً میں نے کہیں مات کھائی تھی۔

شعر کی یہ تنہائیاں صرف آموں کے باغوں یا کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر میسّر ہوتیں۔ میرا زیادہ وقت مردانے گھر کی بیٹھک میں گزرتا جہاں بڑے ماموں "اڈّا میاں" کی مرکزی شخصیت کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم رہتا۔ سیاست پر گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ دوسری جنگِ عظیم کی خبروں پر تبصرہ ہوتا کسی شریکِ محفل کو ہدف بنا کر اس کا مذاق اڑایا جاتا۔ اصل مسئلہ وقت کاٹنے کا تھا۔

میرے ماموؤں کے پاس تمام زمینداروں کی طرح وقت کی بہتات تھی اس لیے ہر قسم کے لوگ اپنی اپنی سہولت کے مطابق آتے اور ان کے اوقات کے کچھ حصّے پر قابض ہو جاتے۔

جب ان نشستوں سے اکتا جاتا تو 'کوٹھی' کا رُخ کرتا۔ یہ ہمارے زنانے اور مردانے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر بوڑھے آبا (حاجی فضل امام خاں) کی بیٹھک تھی۔ یہیں سے وہ کپڑے کا کاروبار کرتے اور یہیں کاشتکاری کے آلات، بیل، بھینس اور گھوڑوں وغیرہ کے رہنے کا انتظام تھا۔ ان کے بعد سے اس کے کمرے اور ہال خالی پڑے رہتے تھے۔ چنانچہ

تعطیلات میں مَیں اپنا 'پھڑ'، وہیں جمالیتا۔ یہیں میں نے ہندی اور سنسکرت کا درس لیا، یہیں میری ورزش کا ساز و سامان مگدر وغیرہ رکھے رہتے اور یہیں میرا گوشۂ تنہائی تھا۔

۲۱م ۶ کا بیشتر حصّہ میں نے یہیں گزارا۔ یہیں سے صبح و شام ڈنڈا ہاتھ میں لے کر کھیتوں اور باغوں کی جانب ٹہلنے نکل جاتا۔ تھوڑے فاصلے پر ریل کی پٹری تھی ٹہلنے کے لیے یہ بہت اچھی جگہ تھی۔ میرے ساتھ اکثر منجھلے ماموں (جو بعد کو میرے خسر بنے) بھی ہوتے۔ ایک دن صبح کے وقت ہم لوگ ریل کی پٹری کے راستے پر ٹہلتے دور جا نکلے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا تھک گئے ہو!" میں نے کہا "آپ تھک گئے ہوں گے، میں تو نہیں تھکا ہوں" بس پھر کیا تھا ہم دونوں کی پٹھانی رگ چڑھ گئی۔ اب نہ وہ لوٹنے کا نام لیتے ہیں اور نہ مَیں۔ ایک دو تین چار، پانچ میل بس چلتے ہی چلے گئے "حتی کہ اگلے اسٹیشن 'ڈوائی' تک پہنچ گئے جو چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ اب دونوں کا بُرا حال تھا لیکن پٹھانی "ضد" "ضد" میں لوٹنے کا کوئی بھی نام نہیں لیتا تھا رفتہ رفتہ جسمانی تھکن کے پردے میں عقل آنا شروع ہوئی اور دونوں ایک مقام سے پیچھے کی طرف یک لخت لوٹ پڑے اس طرح کہ ع

نہ اُن کی جیت ہوئی اور نہ میری ہار ہوئی

قائم گنج کے ان دنوں کی یادوں کی سیر بین میں آج کئی کردار ابھرتے ہیں۔ ان میں نور عالم خاں (چچا نوری) کی شخصیت سب سے دلچسپ تھی۔ وہ ہماری ننہال کے قرابت داروں میں تھے، لیکن غریب تھے۔ انھیں شکایت تھی کہ حاجی فضل امام خاں نے اپنی ساری جائداد اپنے بھتیجے جان عالم خاں دے دی اور اپنے بھانجے نور عالم خاں کو کچھ نہیں دیا ورنہ ان کی حالت آج یہ نہ ہوتی۔ تاہم خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔ اس لیے رشتہ توڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنی ناداری اور احساسِ کمتری کو وہ ہیکڑی سے چھپاتے تھے۔ حلیہ کے اعتبار سے پنڈاری معلوم ہوتے تھے یعنی داڑھی ٹھوڑی پر دو حصّوں میں منقسم رکھتے۔ پڑھے لکھے بہت کم تھے لیکن علم مجلسی رکھتے تھے۔ آمدنی کا ذریعہ بڑھانے کے سلسلے میں انھیں کسی پیشے یا فن سے عار نہیں تھا جُوا بھی کھیل لیتے تھے اور ایک بار کا داؤں تو اتنا کامیاب رہا کہ دوسرے

کی لڑکی تک کو جیت لائے۔ ہارنے والا بھی بستی کا پٹھان تھا اور جب اُن سے مسلسل ہارتا گیا تو بات کی پچ کے لیے آخری داؤں پر اپنی نوجوان بیٹی کو لگادیا۔ نورعالم خاں یا تو قسمت کے دھنی تھے یا یہ اُن کے ہاتھ کی صفائی تھی یہ داؤں بھی جیت گئے۔ پٹھان کی بھوں پر میل تک نہیں آیا۔ لڑکی کو بُلایا اور اُن کے حوالے کیا۔ یہ جھٹ جاکر یکہ لائے، پردے کے لیے چادر باندھی اور سواری کو گھرلے آئے۔ فوراً ایک مُلّا کا انتظام کیا گیا اور نکاح پڑھایا گیا۔ یہ سب ان کی پہلی بیوی کے سامنے ہوا جس نے نہایت صبر سے اِس تماشے کو دیکھا۔ ساری رسمیں پوری ہونے کے بعد شام کو انھوں نے میکے جانے کی اجازت لی اور پھر کبھی نہیں لوٹیں۔

نورعالم خاں نہ صرف ہیکڑی باز تھے، پرلے درجے کے مختار بھی تھے۔ جانوروں کی شناخت کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ لوگ خوشامد کرکے انھیں میلوں اور ہاٹوں میں لے جاتے اور اُن کے مشورے سے جانور خریدتے۔ شام کو جب وہ ہمارے یہاں آکر بیٹھتے تو کہتے میں نے فلاں کو بھینس خرید وادی، فلاں کو گائے؛ اس انداز میں گویا قیمت انھوں نے جیبِ خاص سے ادا کی ہو۔

ان کے بھائی دیدارعالم خاں گوشت کھانے کے بہت شوقین تھے۔ چوں کہ عام طور پر بکری کا گوشت فروخت کرنے والے 'چک' ذات کے ہندو ہوتے، اس لیے انھیں کسی مسلمان کی خدمات کی ضرورت ہوتی کہ ذبیحہ فراہم کرسکیں۔ دیدارعالم خاں کی خدمات اس کے لیے موجود تھیں۔ صبح ہوئی اور ہاتھ میں لے کر چھری نکلے۔ اس خدمت کے لیے شیکسپئر کے یہودی کی طرح وہ پاؤ بھر گوشت کے حقدار بن جاتے۔ خاں صاحب کو پارچۂ گوشت مل جائے تو کیا بات اور وہ بھی مفت۔

سیاسی اعتبار سے یہ بڑی ہل چل کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کی سیاست شباب پر تھی ؎

مُسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

کا ترانہ ہر ایک کی زبان پر تھا۔ مجروحؔ سُلطان پوری قائم گنج آکر مہینوں ہمارے یہاں قیام کرتے اور نہایت خوش الحانی سے اپنی سیاسی غزلیں اہلِ قائم گنج کو سُناتے۔

سلمانو! نہ گھبراؤ خدا کی شان باقی ہے
ابھی اسلام زندہ ہے ابھی قرآن باقی ہے

مسلم لیگ کے مقامی شاعر حفیظ مجیبی صاحب تھے جو فرخ آباد سے ہفتہ وار مجیب نکالتے تھے۔ ان کا بڑے ماموں صاحب سے بڑا ربط ضبط تھا۔ پرانے خلافتی تھے، اب مسلم لیگ میں آ گئے تھے۔ ان کی بعض سیاسی نظمیں اور غزلیں محلّوں میں پٹھان بچّے گاتے پھرتے تھے۔ مسلم لیگ کا اس قدر دور دورہ تھا کہ اس کا اثر مسلمانوں کے کم پڑھے لکھے طبقات تک پھیل چکا تھا۔ جو لوگ اس منظر کو دیکھ چکے ہیں وہ پنڈت جواہر لال نہرو کے اس خیال سے کبھی متفق نہیں ہو سکتے کہ مسلم لیگ اس وقت صرف مسلم زمینداروں اور اعلیٰ طبقوں کا رچایا ہوا تماشا تھی۔ مسلمانوں میں ہر طرف بے اطمینانی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد یہ بے اطمینانی اور بڑھ گئی تھی۔ جاہل لوگ بھی ہندو مسلمان کی اصطلاحوں میں سوچنے لگے تھے۔ ہمارے محلّے میں مشرّف حسین خاں ٹیلر ماسٹر تھے جو اردو میں بس "شُد بُد" رکھتے تھے لیکن سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے اردو کے ایک روزنامے کا مطالعہ اُن کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ ہجّے کر کے رُک رُک کر پڑھتے تھے، مگر پڑھتے تھے۔ ایک دن اردو کا اخبار ہاتھ میں لیے، "کف در دہان" ہمارے یہاں آئے اور کہنے لگے، "ادّا میاں (سلطان عالم خاں کے لیے) آپ کے ہوتے ہوئے یہ کیا غضب ہے کہ روز "ہندو کو ڈبل" ہے اور مسلمان کو کچھ نہیں۔" دیکھا تو "ہندو کو ڈبل" کی سُرخی تھی جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا۔

اس زمانے میں یعنی قائم گنج کے طویل قیام میں مَیں نے دو کام اور کر ڈالے۔ ایک طرف تو صحت بنانے کا پروگرام بنا لیا۔ ڈنڈ اور بیٹھک اور مگدر کا شوق اور دوسری طرف بجمہ کی وساطت سے دودھ "ملائی" کا کثرت سے استعمال۔ مجھے وزن بڑھانے کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے کہ میں کثرتِ غذا کے باوجود مسلسل کم وزن رہتا تھا۔ دُبلا اس قدر تھا کہ پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ نرخرے کی ہڈّی اس قدر نمایاں تھی کہ شیروانی کا ہک لگانا مشکل ہو جاتا۔ آج اس کے برعکس ہے یعنی قلّتِ غذا کے باوجود زیادہ وزن رکھتا ہوں۔ کوئی تدبیر

نہ اُس وقت کارگر ہوتی تھی اور نہ اب ہوتی ہے۔ ہمارے خاندان میں تیس کے پیٹے میں جاکر خود بخود وزن بڑھنے لگتا ہے۔ جوانی بھری ہوئی نہیں ہوتی۔ ایک دوسرا کام یہ کیا کہ مقامی پاٹ شالہ کے ایک بنارسی پنڈت کو ہندی اور سنسکرت پڑھنے کے لیے بہت قلیل مشاہرے پر مقرر کر لیا۔ وہ اس کے لیے روز تین میل مسافت طے کر کے آتے اور اگر میں گھنٹہ بھر درس کا شغل رکھنا چاہتا تھا تو وہ جوشِ تعلّمی میں دو گھنٹے پڑھاتے۔ ساتھ ساتھ ہر بیماری کے لیے ویدک کے نسخے بھی بتاتے جاتے۔ تلسی کا پودا اُن کے نزدیک ہر مرض کی دوا تھا۔ میں نے اسے نزلہ کھانسی کے لیے آزمایا، اور اس کے بعد یہ گھر کے آنگن کی ہمیشہ زینت رہا۔

۱۹۴۲ء کا قیام قائم گنج جہاں میرے لیے اکتسابِ ہندی کے لیے یادگار رہا۔ اس زیادہ یادگار اس لیے بھی رہا کہ دودھ اور ملائی کے توسط سے میری رسائی رفتہ رفتہ اس شخصیت تک ہونے لگی جس کے مقدر میں میری رفیقۂ حیات بننا لکھا تھا۔ نجمہ میرے دوسرے ماموں، قدوس عالم خاں کی بڑی لڑکی تھی۔ اُن کی شادی، روایات کے برخلاف، آفریدی پٹھانوں سے باہر علی گڑھ کے شیروانی پٹھانوں میں ہوئی تھی۔ نجمہ کی والدہ رئیس دتاولی نواب یوسف خاں شیروانی کی صاحبزادی اور نواب فراہیم خاں صاحب (رئیسِ بڈھانسی) کی چھوٹی بہن تھیں۔ ان کی شادی میں قائم گنج کے پٹھانوں نے بڑے بڑے لطیفے کئے تھے۔ ایک صاحب فیرنی کی بیس پچیس طشتریاں کھا گئے۔ دوسرے صاحب ہاتھ ٹیک ٹیک کر گوشت کی قابیں دوسرے مہمانوں کے سامنے سے اٹھا لیتے تھے۔ شادی کے بعد شیروانیوں میں ان ناکندہ تراشوں کی بوالعجبیوں کا کافی دن تک چرچا رہا۔ بچاری دلہن نے جب قائم گنج کا ماحول دیکھا تو پہلے دن سے انھیں احساس ہوگیا کہ نبھانا پڑے گا۔ وہ ہم سب بچوں کو مسعود میاں، خورشید میاں کہہ کر مخاطب کرتیں جب کہ گھر والے مسعودا، خورشیدا، کے نام سے یاد کرتے (پشتو میں نام الف زائدہ کے ساتھ لیا جاتا ہے)، کھانے پینے کے طریقے، آداب، مذہب کی جانب رویّہ غرض کہ ہر چیز اُس ماحول سے مختلف تھی، جس میں اُن کی پرورش ہوئی تھی۔ لیکن شاباش ہے اس شیروانی بیٹی کو جس نے سب کچھ جھیلا اور اُف تک نہ کی اور اپنے شوہر اور بچوں کی جی جان

سے خدمت کرتی رہی۔ دوسری ممانیاں جب ساس (نانی صاحبہ) سے ٹکراتیں تو کم و بیش دل کی بھڑاس نکال لیتیں۔ یہ بے چاری خاموشی کے ساتھ اوپر چھت پر چلی جاتیں جہاں انھوں نے اپنے لیئے ایک کوٹھری اور سامنے کا برآمدہ مخصوص کر لیا تھا۔ نانی صاحبہ نے اسی لیئے انھیں 'چھینکے کی ہنڈیا' کا لقب دیا تھا۔ مجھے وہ دُھناپے سے پسند تھیں۔ اکثر ان کے گھونگھٹ میں اپنا منہ ڈال دیتا اور اُن کا مسعود میاں، مسعود میاں کہتے منہ سوکھتا تھا۔ جوں جوں ان کی بڑی بیٹی نجمہ سیانی ہوتی گئی اُن کا دھیان میری طرف ہوتا گیا۔ میرے خیال میں ہماری شادی کا منصوبہ ان کے ذہن میں خود ہمارے فیصلوں سے بہت پہلے بن چکا تھا۔ یہ شاید جلد معرضِ وجود میں آجاتا کہ اچانک وہ دق کے موذی مرض شکار ہو گئیں جس کا سلسلہ ، سال تک چلتا رہا۔

پہلے تذکرہ کر چکا ہوں کہ ۱۹۴۱ء کی تعطیلات گرما میں مجھے پہلی بار نجمہ سے قربت کا احساس ہوا کچھ تو اس کا الھڑپن اور کچھ اس کی لڑکوں جیسی شرارتیں، جس پر اس کی والدہ خوب دُھنتیں تھیں، بھانے لگیں۔ وہ اس وقت ۱۱، ۱۲ برس کی ہوگی۔ معلوم نہیں کیوں اُسے میری خدمت کرنے میں لطف آتا تھا۔ کھانا کھلانا، دودھ مہیا کرنا اور خاص طور پر چھپا کر میرے لیئے ملائی نکال لانا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پیچھے کچھ جنسی جذبے کی کارفرمائی تھی۔ وہ اب تک اس کا اقرار نہیں کرتیں۔ میں اس سے عمر میں بہت بڑا تھا، یعنی ایم۔اے کر چکا تھا۔ میرے خیال میں میری اس کی قربت صرف مشترکہ خاندان کی یکجا رہائش کا نتیجہ تھی۔ میں اس وقت اسے کسی جنسی نقطۂ نظر سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا، بس 'اچھی لگنا' سے تعبیر کر سکتا ہوں۔ دوسری بہنوں کو بھی (بڑے ماموں کی لڑکی اختری اس سے بڑی تھی)، یہ احساس ہونے لگا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں اور اسے میری خدمت میں لطف آتا ہے۔

ستمبر ۱۹۴۲ء کی ایک شام بہرحال جو مبہم تھا وہ واضح ہو گیا، جو سویا ہوا تھا وہ بیدار ہو گیا، جب نئے گھر کی چھت کے سائبان میں، میں لیٹا ہوا تھا اور وہ میرے سرہانے سلمیٰ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ سلمیٰ کے جانے کے بعد اچانک میں نے پوچھا "میرے ساتھ دہلی

چلوگی ؟" اور اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا " ہاں چلو گی"۔ میں نے اچانک اس کا سر جھکایا اور ایک بوسہ لے لیا۔ نجمہ آج تک اس بات پر مصر ہے کہ اس کے جواب کی تہ میں کوئی ایسا خیال نہیں تھا، اور میں بھی یہی سمجھتا ہوں، لیکن اپنی اِس حرکت پر میرے بدن میں کرنٹ سا دوڑ گیا اور مجھے صحیح معنوں میں پہلی بار احساس ہوا کہ میں نجمہ کے بہت قریب آگیا ہوں۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد مجھے آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے انٹرویو کارڈ ملا، جہاں میں نے پروگرام اسسٹنٹ کی جگہ کے لیے کئی مہینے پہلے درخواست دے رکھی تھی۔ انٹرویو کمیٹی کے صدر، ڈائریکٹر جنرل پطرس بخاری تھے اور اس کے ایک رکن ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے، جس کا علم مجھے پہلے سے نہیں تھا۔ اس بار میں نے اپنے دوست حبیب اللہ خاں کے یہاں قیام کیا، کچھ اس مصلحت سے کہ میں اب تک اچکن دھاری، تھا اور چاہتا تھا انٹرویو میں سوٹ پہن کر جاؤں۔ حبیب اللہ نے مجھے ایک اچھا سوٹ مستعار دیا اور جب پہن کر چلا تو کہنے لگے اس سوٹ میں تمہارا کون انتخاب نہیں کرے گا۔ انٹرویو آل انڈیا ریڈیو، دہلی کے دفتر میں تھا جو اس وقت علی پور روڈ پر تھا۔ جب میں انٹرویو کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو ذاکر میاں مجھے سوٹ میں ملبوس دیکھ کر مسکرائے۔ (انھوں نے مجھے اس حلیے میں کبھی نہیں دیکھا تھا) اور بخاری صاحب سے کہا "یہ میرے عزیز ہیں لیکن میں انھیں اس لباس میں نہیں پہچانتا!" اس کے بعد بیشتر سوالات بخاری صاحب ہی نے کیے۔ انھیں یہ جان کر تعجب ہوا کہ علی گڑھ کا تعلیم یافتہ اور بہت اچھی ہندی جانتا ہے۔ اس کے بعد تیسرے صاحب سے کہا کہ زرا ان کی ہندی کی خبر لیجئے۔ انھوں نے چند باتیں پوچھیں اور مطمئن ہو گئے۔ میں نے ہندی پنڈت رام سروپ شاستری اور بنارس کے ایک پنڈت سے پڑھی تھی، اس لیے وہ میرے "شدھ" تلفظ سے زیادہ متاثر ہوئے۔

دوسرے ہی روز، ذاکر میاں سے ملے بغیر میں قائم گنج واپس چلا گیا۔ مہینہ بھر کے اندر اطلاع ملی کہ میرا انتخاب بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ ہو گیا ہے اور میری ملازمت کا آغاز دہلی اسٹیشن سے ہوگا۔ میری خواہش بھی یہی تھی، تیار بیٹھا تھا، فوراً دہلی کے لیے روانہ ہو گیا اور وہاں کے اسٹیشن ڈائریکٹر اڈوانی صاحب کو اپنی آمد کی رپورٹ دی۔ مجھے ہندوستانی ٹاکس

سیکشن میں لگایا گیا جس کے پروگرام ایگزیکٹو ن۔م۔ راشد تھے۔ ان کی ماورا ایک سال قبل شائع ہو چکی تھی اور ادبی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا تھا۔ میں نے راشد کے ’ماورا‘ کا مطالعہ بالاستیعاب کیا تھا اور اس سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ جنسیت کے حاوی رجحان کے باوجود یہ اپنی ہیئت، اسلوب اور اظہار کے لحاظ سے مجھے کرشن چندر کے الفاظ میں "ایک نئے تجرباتی دور کی تمہید" معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں راشد کا نام سن کر بڑی عقیدت کے ساتھ اپنے پروگرام ایگزیکٹو کے کمرے میں داخل ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں اقبال کو روبرو دیکھ کر پہلا دھچکا لگا تھا۔ راشد کے غیر شاعرانہ حلیہ پر نظر پڑی تو دوسرا دھچکا لگا۔ میں یقین تک نہیں کر سکا کہ ’ماورا‘ کا خالق اس افسرانہ شان کا مالک ہو سکتا ہے۔ بات چیت کا انداز بھی غیر شاعرانہ تھا۔ چنانچہ میں راشد شاعر کو بالکل بھول گیا اور اب افسر راشد کے ساتھ دن کٹنے لگے۔

مجھے پہلی بار اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ یوپی اور دہلی کا آدمی اپنے پنجابی واقف کاروں سے کیوں تال میل نہیں رکھتا۔ اور وہ ہم لوگوں کو کیوں لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ راوی اور گنگا کا سنگم کیوں ناممکن ہے۔ میرے قیام کا انتظام اینگلو عربک کالج کے ہاسٹل کے ایک کمرے میں مرزا محمود بیگ صاحب کی عنایت سے ہو گیا۔ ~~میرے قیام کا انتظام اینگلو عربک کالج کے ہاسٹل کے ایک کمرے میں مرزا محمود بیگ صاحب کی عنایت سے ہو گیا~~ کمرہ کیا تھا غازی الدین حیدر کے مدرسے کا ایک حجرہ تھا۔ پاس کے حجرے میں میرے علی گڑھ کے دوست ڈاکٹر خورشید فاروق، استاد عربی رہتے تھے۔ قائم گنج سے میں گھر کی ملازمہ آشرا کی ماں کے چھوٹے بیٹے سیدا (صفدر علی)، کو ساتھ لے گیا۔ بڑا کاریگر آدمی تھا، مگر کھانا حسبِ منشاء پکاتا تھا۔ البتہ کھلانے سے زیادہ خود کھانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

چوں کہ علی پور کا ریڈیو اسٹیشن اجمیری دروازے سے خاصے فاصلے پر تھا، اس لیے میں قرب و جوار میں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں رہا۔ دہلی یونیورسٹی کے کوارٹرز میں اینگلو عربک کالج کے انگریزی کے ایک استاد عباسی صاحب تنہا رہتے تھے۔ انھوں نے جب میری حاجت کا تذکرہ سنا، فوراً حاجت روا بن کر اپنے ساتھ رہنے کی پیش کش کی۔ عام طور پر کوئی پیشکش بہت آسانی سے مل جائے تو میں اسے مشتبہ سمجھتا ہوں، لیکن اس وقت نہ سمجھ سکا کہ یہ بھی ان کے لکھنوی تکلفات کا ایک انداز تھا اور سادہ لوحی میں سیدا کے ساتھ اپنا مختصر سا

اسباب باندھ کر ایک اتوار کو اُن کے یہاں پہنچ گیا۔ اس وقت وہ اپنے اصلی رنگ میں نظر آئے۔ دروغ گوارا، بہانہ بسیار، کسی بھی طرح مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر تیار آمادہ نظر نہیں آئے، لیکن اتنا کیا کہ پڑوس کے ایک کوارٹر جس پر ایک سردار جی نے قبضہ کر رکھا تھا اور وہ بھی تنہا تھے، مجھے ان کے سر تھوپ دیا۔ سردار جی دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ کے طالب علم تھے۔ دن بھر غائب رہتے اور رات کو نمودار ہو جاتے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ہم کوارٹر کے صحن میں سوتے تھے۔ مجھے یہ بعد کو معلوم ہوا کہ سردار جی از روئے احتیاط رات کو تالا لگا دیتے تھے۔ میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی اس لیے کہ اپنے کمرے کے سامنے میری چارپائی ہوتی تھی۔ باہر کے برآمدے میں میرا ملازم سوتا تھا۔ دو تین راتیں خیریت سے گزریں۔ ایک صبح جب اٹھا تو دیکھا کمرے کا دروازہ کھلا پڑا ہے اندر گیا تو "صفّاً صفّا" یعنی میری تمام املاکِ منقولہ، سوٹ کیس، کپڑے، گھڑی، جوتے کوئی شب زندہ دار اٹھا کر لے گیا ہے۔ صرف سائیکل رہ گئی تھی، اسی پر سوار ریڈیو اسٹیشن کے دفتر بھاگا۔ ساتھیوں کی ہمدردی سے اور خفّت ہوتی تھی، اس لیے کہ زبانی خرچ تھا۔ البتہ ن۔م۔ راشد نے مجھے مالی امداد کی پیش کش کی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس آفیسر ٹائپ شاعر کے سینے میں دل بھی ہے۔ لیکن میں نے ان کی یہ پیش کش قبول نہیں کی اس لیے کہ میرے ملازم کے پاس اس قدر روپے تھے کہ میں قائم گنج پہنچ سکوں۔ صرف چند روز کی چھٹی کی درخواست کی، جو فوراً مل گئی۔ سیدھا قائم گنج پہنچا اور ارجنٹ آرڈر پر کپڑے سلوائے۔ چند روز جو وہاں گذرے وہ خفّت در خفّت گذرے۔ میری ذہانت کی ساکھ اس وقت بالکل ختم ہو گئی جب بچّہ نے بھی میری ہنسی اڑائی ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

وہاں سے واپس آکر میں نے پھر اینگلو عربک کالج کی جانب مراجعت کی جہاں میرا حجرہ ابھی تک خالی تھا۔

اسی زمانے میں ہم لوگوں کو حکم ملا کہ ریڈیو اسٹیشن علی پور روڈ سے نئی عمارت پارلیمنٹ اسٹریٹ (موجودہ سَن سَد روڈ) میں منتقل کیا جائے گا۔ اس طرح کہ براڈکاسٹ میں

کوئی خلل نہیں پڑے۔ اس میں کئی روز لگ گئے۔ بالآخر نئی عمارت میں آکر میں نے ہندوستانی ٹاکس انچارج کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ یعنی اُردو، ہندی دونوں زبانوں کی ٹاکس کا پروگرام بنانا اور پھر اُن کے لیے مناسب ٹاکرز کو بُک کرنا میری ذمہ داری ہوگئی۔ اسی زمانے میں میں نے نگیندر رنگاچی کو جو کامرس کالج میں ہندی کے لکچرر تھے ریڈیو سے متعارف کرایا۔ اُردو میں مرزا محمود بیگ نے تو اپنی پہلی تقریر میرے ہی کہنے پر نشر کی۔ بعد کو وہ دہلی اسٹیشن کے بہترین اردو میں نشر کرنے والے قرار پائے۔ سُنا ہے ان کی منتخب ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ حال میں شائع ہونے والا ہے۔ ان کے علاوہ علی گڑھ سے بہت سے حضرات کو کھینچ کر ریڈیو کی دُنیا میں لایا۔ اِس زمانے میں بخاری صاحب اس بات کے لیے کوشاں رہتے کہ پروگرام اسسٹنٹ کو میز ہی تک اپنی کارروائی محدود نہیں رکھنی چاہیئے بلکہ میدان میں جاکر نئے نئے خیالات اور نئے نئے براڈکاسٹ کرنے والوں کو تلاش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں میرا اکثر علی گڑھ اور آگرے جانا ہوتا تھا۔ میرے بعد اعجاز حسین بٹالوی چارہ اور چارہ گر کی تلاش میں اکثر علی گڑھ آتے اور میرے ساتھ امین ہاسٹل میں قیام کرتے۔ وہ بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ خالص لاہور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے اس لیے علی گڑھ کے نستعلیق اور دبریک بولی، بولنے والے حضرات ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اس کے بعد ان سے سابقہ لندن میں پڑا جس کی تفصیل "دیارِ فرنگ" اے باب میں آئے گی۔

ریڈیو اسٹیشن ہی پر میں نے پہلی بار میرا جی کو دیکھا۔ وہ اُس وقت ریڈیو آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ میلی سی پتلون کے اوپر شیروانی پہنے اور کتابوں یا مسودات کے بنڈل ہاتھ میں لیے پاس والے کمرے میں آکر بیٹھ جاتے۔ ان سے شیروانی کے اشتراک باوجود دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر رہتے۔ البتہ ایک صاحب نے مجھے اُن کی اس پیشین گوئی سے آگاہ ضرور کیا کہ "مسعود، بے چارہ شریف آدمی ہے، ریڈیو اسٹیشن کی گوں کا نہیں"۔ لیکن اسسٹنٹ ڈائریکٹر فرید میرے کام سے بہت مطمئن تھے۔ شام کو ہفتے میں دو بار پروگرام اسٹیشنوں کی ٹرانسمیشن پر بھی ڈیوٹی لگتی۔ ایسے میں اگر کسی مقتدر شخصیت کا براڈکاسٹ ہوتا تو پطرس بخاری بہ نفسِ نفیس اچانک نمودار ہو جاتے۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ انھوں نے بھی ایک جگہ میری

تعریف کرنے کے بعد یہ الفاظ کہے تھے کہ میں "ریڈیو ٹائپ" نہیں لگتا۔ ان کا یہ کہنا صحیح تھا، اس لیے کہ علی گڑھ کا تعلیم یافتہ پاجامہ اور شیروانی پہنے لاہور کے کالجوں کے سوٹ بوٹ پہننے والے سجیلے نوجوانوں سے بالکل مختلف ہوتا تھا، اور بخاری انھیں سجیلوں کو پسند کرتے تھے۔

ابھی میری ریڈیو کی ملازمت کو چھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ دوسروں کی طرح مجھے بھی محسوس ہونے لگا کہ غلط جگہ آ پھنسا ہوں۔ کچھ روز غلطاں و پیچاں رہا، نکلوں تو کہاں نکلوں۔ ایک روز اچانک استعفا لے کر اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مزید انگشت بدنداں تھے۔ ڈرامہ سیکشن کے انچارج ناصری (دہلوی) میرا جی کی پیشین گوئی کا ذکر کرتے ہوئے پائے گئے۔ گرجا کمار ماتھر، جو اس وقت محض ریڈیو آرٹسٹ تھے یہ سن کر میرے پاس آئے اور سمجھانے لگے کہ ایسی اچھی سرکاری ملازمتیں کہاں ملتی ہیں۔ وہ خود اس زمانے میں اس کے لیے کوشاں تھے۔ شام کو اپنے گھر لے گئے، بیوی سے ملایا اور کہا دیکھو دنیا میں ان جیسے مہاتما لوگ بھی موجود ہیں۔

لیکن میں اپنی کشتیاں جلا کر سوئے منزل رواں تھا۔

ساتواں باب

علی گڑھ (۲)

(۴۳ تا ۵۰ء)

ریڈیو کی ملازمت ترک کر کے سیدھا علی گڑھ پہنچا اور درِ پیرِ مغاں کو پھر کھٹکھٹایا۔ رشید صاحب کو میری اس ملازمت کو چھوڑنے پر سخت تعجب ہوا۔ کہنے لگے یہ آپ کو کیا سوجھی کہ اچھی بھلی سرکاری ملازمت یک لخت چھوڑ دی۔ یہاں علی گڑھ میں کیا رکھا ہے۔ ہو سکا تو بس یہی پچاس ساٹھ روپے کا ریسرچ کا وظیفہ۔ میں نے کہا رشید صاحب! بس اب تو یہی ٹھانی ہے۔ کہنے لگے اچھا تو آئیے یوں بھی زندگانی کر لیجئے۔ غالب کا شعر مکمل ہونے کے بعد میں پھر علی گڑھ آن دھمکا۔ اس بار آفتاب ہاسٹل کے بجائے عثمانیہ میں داخلہ لیا تا کہ شعبۂ اردو اور لٹن لائبریری سے زیادہ قریب رہ سکوں۔ تحقیق کا عمومی میدان "اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا" رہا۔ سرور صاحب میرے کام کے نگراں مقرر ہوئے۔ لیکن چوں کہ خود ان کے مطالعہ کا میدان یہ نہیں رہا تھا، اس لیے کام کو سرانجام دینے کی تمام تر ذمہ داری خود میرے سر آن پڑی۔

اسی سال یہ خوش آیند بات ہوئی کہ نومبر ۱۹۴۳ء میں جونیر لیکچرر کے طور پر میری عارضی تقرری شعبۂ اردو میں ہو گئی اور ساتھ ہی رشید صاحب کی سفارش پر مجھے نوساختہ "امین ہاسٹل" کا ریزیڈنٹ وارڈن بنا دیا گیا۔ اس طرح میری رہائش کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس ہاسٹل کو کلکتے کے ایک تاجر امین صاحب کے عطیے سے دورانِ جنگ

دار میکنیشین ہاسٹل کے طور پر ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے بہ عجلت تمام بنوایا تھا۔ اس وقت یہ یونیورسٹی کا سب سے گھٹیا ہاسٹل سمجھا جاتا تھا، جہاں کم مالی استطاعت رکھنے والے طلبا یا دیگر اقامت گاہوں کے 'سزا یافتہ' رہتے تھے۔ اس کے دروازے کچی شیشم کے تختوں سے بنائے گئے تھے جن میں اسکرو کنڈوں کے بجائے لوہے کی موٹی موٹی کنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ دروازے کچی لکڑی کے ہونے کی وجہ سے برسات کے موسم میں اکڑ جاتے اس طرح کہ ان کی کنڈیاں لگانا دشوار ہو جاتا۔ ہر دوسرے تیسرے روز میرے پاس شکایت آتی کہ آج فلاں کمرے کا دروازہ 'اکڑ' گیا۔ فوری کمک کی ضرورت ہے! چوں کہ جنگ کا زمانہ تھا، اس لیے اشیائے خوردنی اور کپڑا کنٹرول راشن سے ملتا تھا۔ اوپر سے حکم تھا کہ طلبہ کو ۲/۳ گیہوں میں ۱/۳ جو کا آٹا ملا کر روٹی دی جائے۔ اہلِ مطبخ کے تصرف سے دونوں کا تناسب بدل جاتا اور چپاتیاں کچی اور کالی آتیں۔ طلبہ میں اس صورتِ حال پر بے چینی پیدا ہو گئی۔ جب معاملہ قابو سے باہر ہونے لگا تو میں نے اوپر اطلاع بھیجی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے سکریٹری کا پیغام ملا کہ وائس چانسلر بنفسِ نفیس آئیں گے اور طلبہ سے خطاب کریں گے۔ سب لوگ ڈائننگ ہال میں جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ دورانِ گفتگو وہ مجھے مسلسل وار ڈیکنیشین وارڈن کہتے رہے۔ طالب علم مسکرا رہے تھے اور میں انگشت بدنداں تھا۔ میری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب انھوں نے طلبہ سے کہا کہ میں نے آپ لوگوں کو تو گیہوں کی روٹی دینے کا حکم دیا تھا، پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ طلبہ نے انھیں عقیدت اور مجھے غیض کی نظروں سے دیکھا۔ تالیاں بجیں اور میری نگاہیں جھک گئیں۔ خیر جیسے تیسے جلسہ ختم ہوا۔ میں وائس چانسلر صاحب کو ان کی موٹر تک چھوڑنے گیا۔ جب انھوں نے موٹر میں قدم رکھا تو میں نے ہمت کر کے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ نے لڑکوں سے جو گیہوں کی روٹی کا وعدہ کیا ہے تو پھر اس کا انتظام بھی کیجیے۔" کہنے لگے "میں نے طلبہ ہی سے تو کہا ہے آپ سے تو کچھ نہیں کہا' آپ حالات کے پیشِ نظر جو کر رہے ہیں کیے جائیے۔" واہ! واہ!! ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد زندہ باد۔ ع

مشکل کہیں جسے اُسے آساں بنا دیا

امین ہاسٹل کے دائیں بازو کے کونے والے تین کمروں میں اپنی 'بھڑ' جلانے

کے بعد مجھے اپنی ریسرچ کی جانب متوجہ ہونے کا موقع ملا۔ میرا ذاتی ملازم سبتما کوئلے کی انگیٹھی پر بہت اچھا کھانا پکا دیتا۔ رہائش اور خدمات کی دیگر تمام سہولتیں ہاسٹل کے وارڈن کی حیثیت سے حاصل تھیں۔ تکلیف تھی تو صرف بجلی کے نہ ہونے کی جس کا احساس گرمی کے موسم میں زیادہ شدید ہو جاتا۔ اس ہاسٹل میں دیگر اقامت گاہوں کی طرح الجھنیں بہت کم تھیں۔ چوں کہ پسماندہ قسم کے طلبہ سے سابقہ تھا وہ "وارڈن صاحب" کے سامنے آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسری قسم کے طلبہ وہ تھے جنھیں ہاسٹلوں سے کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں 'لازمی منتقلی' کے ذریعہ یہاں بھیجا گیا تھا۔ ان میں 'کالے پانی' کے قیدیوں کی طرح سنجیدگی اور قرار آجاتا تھا۔ خوب جانتے تھے کہ یہاں کے بعد کہیں اور جانے کا ٹھکانا نہیں۔ البتہ ایک واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا جو پروفیسر شبیر احمد خاں (سابق صدر شعبۂ معاشیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت وہ بی۔ اے۔ کے طالب علم تھے۔ ایک روز برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک گول مٹول قسم کے طالب علم نے علی گڑھ کی روایت کے مطابق زور سے السّلام علیکم کہہ کر میرے ہاتھ میں پرووسٹ کے دفتر سے نکلا ہوا حکم نامہ لا کر دیا۔ معلوم ہوا کہ موصوف کو ماریسن کورٹ سے اپنے روم فیلو سے مارپیٹ کرنے کی پاداش میں امین ہوسٹل کو دربدر کیا گیا ہے۔ میں نے پرچہ پڑھا اور زہرخند کے ساتھ کہا "شبیر خاں صاحب! اگر آپ سے یہاں بھی اس قسم کی حرکت سرزد ہوئی تو پھر کہاں جائیے گا۔" کہنے لگے "وارڈن صاحب! میں یقین دلاتا ہوں اب اس قسم کی حرکت پھر کبھی نہیں کروں گا، وہ تو غصّے میں کر بیٹھا تھا۔" میں نے انھیں ایک شاہ جہاں پور کے نجیب الطرفین پٹھان (شبیر خاں دیسی پٹھان تھے) کے ساتھ رکھ دیا۔ کچھ دن تو اچھے گذرے۔ اس کے بعد خبر ملی کہ یہاں بھی ان کا اپنے ہم کمرہ کے ساتھ اختلافِ رائے ہو گیا۔ بلائے گئے۔ ان کے لبوں پر شکایت تھی لیکن شرمندہ تھے۔ دراصل شبیر خاں صاحب فرسٹ کلاس طالب علم تھے، مؤدب بھی۔ لیکن مغلوب الغضب تھے۔ اس لیے غصّے میں بھوت بن جاتے۔ میرے سامنے پھر قول و قرار ہوا۔ اس کے بعد وہ ڈیڑھ دو سال امین ہاسٹل میں رہے لیکن مجھے کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔

یہ دور میری شدید ذہنی کاوش کا زمانہ تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔ میں نے اپنی

ریسرچ کے لیے "اردو زبان کی ابتدا اور ارتقاء" کا موضوع منتخب کیا تھا۔ میرے سامنے سُنیتی کمار چیٹر جی کی "بنگالی زبان کی ابتدا اور ارتقا" پروفیسر ژول بلاک کی 'مراٹھی زبان'، بابو رام سکسینہ کی 'اودھی کی ابتدا اور ارتقاء'، اور دھریندر ورما کی "ہندی بھاشا کا اُدگم اور وکاس" جیسے کئی نمونے موجود تھے۔ ایک طرح سے میرا میدان تاریخی لسانیات کا تھا۔ توضیحی لسانیات کا ہندوستان میں چلن بہت بعد کو ۱۹۵۵ء کے قریب ہوا ہے۔ یہاں میری ہندی دانی اور سنسکرت کی 'شُد بُد' کام آئی۔ گریرسن کی 'لنگوئسٹک سروے آف انڈیا' مسلسل زیر مطالعہ رہتی۔ اردو کے سلسلے میں مجھے سب سے زیادہ مخالفین کی یہ بات کھلتی تھی کہ وہ اُسے بدیسی زبان سمجھتے تھے۔ جس زمانے میں اس کی ابتدا اور ارتقاء پر تحقیق کر رہا تھا یعنی سنہ ۴۳، ۴۴ء میں، اس وقت مسلم لیگ کی تحریک شباب پر تھی۔ اور اسی کے ساتھ مسلمانوں اور اردو سے نفرت بھی۔ ایسے میں میں نے اُردو کی جڑوں کو دُور ہند آریائی میں مضبوط کیا۔ مسلمانوں کے داخلۂ دہلی سے قبل اس کی تاریخ کے سلسلے میں اس تمام مواد کو سمیٹا جو ہندی اور اس کا مشترک تھا۔ اِس طرح اس کی جڑیں ویدک زمانے تک چلی گئیں۔ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دوسری ہند آریائی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے اس لیے کہ اِس نے اپنا سروکار صرف 'پراکرت' سے رکھا ہے اور اسی نسبت سے سنسکرت سے اجتناب کیا ہے جس کی اہمیت ۱۷۷۶ء میں ولیم جونز کی دریافت کے بعد تاریخی لسانی حلقوں میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ میری تحقیقی تصنیف "مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو" کی پہلی اشاعتوں میں اس پہلو پر اس قدر زور دیا ہے کہ خود زبانِ اردو کے ارتقاء کے لیے بہت کم صفحات دیئے گئے۔ اِس کا ازالہ میں نے ۱۹۸۰ء کے ایڈیشن میں کیا ہے جس میں ہند آریائی کا حصّہ کم کر کے اردو کی تاریخ کے حصّے میں معتدبہ اضافہ کیا گیا ہے۔

میں دو برس تک اپنے مقالے کے سلسلے میں غلطاں و پیچاں اور سرگرداں رہا۔ خود ہی کوزہ و کوزہ گر۔ دن رات پڑھتا تھا، ضرورت سے زیادہ نوٹس لے لیتا تھا۔ نہ ریسرچ کے طریقۂ کار سے واقف تھا اور نہ مقالہ نویسی کے آداب سے۔ ان باتوں کی اس زمانے میں السنہ کے شعبوں میں کوئی تربیت نہیں دی جاتی تھی۔ میرے نگراں 'آل احمد سرور صاحب'، جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں اس میدان کے واقف کار نہیں تھے۔ البتہ انھوں نے یہ میری مدد ضرور کی کہ

جب ہندو یونیورسٹی اور ناگری پرچارنی سبھا کے دفاتر سے استفادہ کرنے کے لیے میں نے بنارس کا سفر کیا تو انھوں نے اپنے خسر صاحب کو تعارفی خط لکھ دیا۔ وہ اس زمانے میں وہاں سٹی مجسٹریٹ تھے انھوں نے مجھے بڑی محبت کے ساتھ اپنے یہاں قیام کی دعوت دی اور مذکورہ بالا دونوں اداروں تک پہنچنے میں میری مدد کی۔

شب و روز کی محنت سے میں نے دو سال کی مدت مقررہ میں اپنا مقالہ تیار کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ۱۹۴۵ء میں داخل کر دیا۔ اسی سال مجھے ڈگری بھی مل گئی۔ یہ مسلم یونیورسٹی کے ریکارڈ پر ہے کہ آج تک کسی طالب علم نے اس قدر مختصر مدت میں اپنے پی ایچ ڈی کے کام سے فراغت حاصل نہیں کی ہے۔ میرے مقالے کے ممتحن سید سلیمان ندوی صاحب اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور تھے۔ دونوں نے مقالے پر اس قدر اچھی رپورٹیں دیں کہ مسلم یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے مبارکباد کا ایک خصوصی ریزولیوشن پاس کیا۔ یہ شرف بھی غالباً میرے سوا آج تک کسی اور کو حاصل نہیں ہوا ہے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس 'کارے کردم' کے بعد بھی 'شادم' نہیں تھا۔ میری بے اطمینانی کی وجہ اس میں اردو کے ارتقاء کے سلسلے میں ناواجب اختصار تھا۔ ہر نئے ایڈیشن کے وقت میں اس کمی کو پورا کرنے کا ارادہ کرتا تھا اور اس کے بعد رہ جاتا تھا۔ یہ توفیق جا کر مجھے ۱۹۸۷ء میں ۲۸ سال کے بعد ہوئی۔ اس قدر طویل وقفہ ایک طرح سے اس کے لیے اچھا ہی رہا۔ اس لیے کہ اپنے حیدرآباد کے دوران قیام (۶۲ تا ۶۸) مجھے دکنی اردو کے ذخائر کو بالاستیعاب دیکھنے کا موقع ملا اور قدیم اردو کی وسعت اور عہد بعہد ارتقا کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ مجھے علمی شہرت زیادہ تر اسی تصنیف سے ملی ہے۔ یہ اب برصغیر ہند و پاکستان میں ایم اے کے نصاب اور حوالے کی ایک مستند کتاب بن چکی ہے۔ حال میں ایک کم سواد نے اس کی تنقیص کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہے لہٰ:

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدہر بماند

آپ سوچتے ہوں گے کہ اس علمی ریاضت کی شدت اور رفتار کو قابو میں رکھنے کے لیے میں نے کیا ذرائع اختیار کیے ہوں گے۔ سنیے۔ میز پر کام کرنے کی کسل مندی

کو میں شام کی طویل ٹہل سے دور کیا کرتا تھا اور ذہنی تھکن کو شعر و شاعری کے مشغلے سے میری شعرگوئی کا باقاعدہ آغاز اسی زمانے میں ہوا اور چوں کہ ہندی میں کتب بینی کافی کرنی پڑتی تھی، اس لیے، ہلکے پھلکے مطالعے کیلئے میں نے ٹیگور کی گیتا جلی کا پہلے ترجمے اور بعد کو اصل بنگالی میں مطالعہ کیا۔ ہندی کی چھایاوادی کویوں جے شنکر پرشاد، سمترانندن پنت، نرالا، مہادیوی ورما کے انتخابات بھی پیشِ نظر رہتے۔ اچانک ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میں شاعر بن گیا ہوں۔ شعر پہلے پہل گیت بن کر پھوٹے۔ شعر کے لیے جذباتی سوتے میرے یہاں پہلے سے موجود تھے، یعنی ۲۵، ۲۶ برس کی عمر اور تنہائی۔ علی گڑھ کی بہتر فضا میں نہ تسکین کا سامان اور نہ ذوقِ نظر کا۔ عصمت چغتائی نے اس مجبوری کو اپنی ناول 'ٹیڑھی لکیر' میں علی گڑھ کے طالب علموں کو یونیفارم — سیاہ شیروانی اور سفید پاجامہ — کے حوالے سے 'کوٹریالا' کہا ہے۔ یہاں کے طالب علموں کا لحاظ رکھیے کہ انھوں نے سیاہ برقعوں میں ملبوس طالبات کو کبھی بھی 'کالی ناگن' نہ سمجھا، نام دیا بلکہ اسے اپنے رومان کے لئے ہمیشہ ایک 'حجاب اکبر' کہا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اسی زمانے میں میں نے ایک سیاہ برقعہ والی کی پرچھائیں بن کر اس کا فاصلے سے کئی برس تعاقب کیا ہے۔ مجھے اس کی شکل کی رتی تک نہیں دکھائی، ایک متشرع خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بیشتر ہاتھ بھی زیرِ نقاب رہتے، اور مورنی کے حسن کا اندازہ اس کے پاؤں سے کس طرح کیا جا سکتا ہے!

وہ فلسفے کی طالب علم تھی، جس کی چوٹی پر چڑھنے میں ناکام رہا تھا۔ اس لیے اور پُراسرار معلوم ہوتی تھی۔ اس کی ذہانت اور فلسفہ دانی کا شعبۂ فلسفہ میں شہرہ تھا جو اس زمانہ میں شعبۂ اردو سے ملحق تھا۔ تابِ گویائی نہ پاکر میں نے نہایت 'باادب ہوشیار' قسم کے اسے چند رقعے لکھے اس نے وہ پرنسپل ویمنس کالج کو بڑھا دیے وہاں سے پراکٹوریل ڈپارٹمنٹ بھیج دیے گئے۔ وہ تو خدا بھلا کرے میرے ریزیڈنٹ وارڈن مرحوم مختار صاحب کا، جو اسسٹنٹ پراکٹر بھی تھے! انھوں نے نہایت نیک نیتی سے یہ دعویٰ کر کے رکھے مسعود جیسا شریف لڑکا دکاش انھیں محبت میں شرافت کی مجبوریوں کا علم ہوتا، لکھ ہی نہیں سکتا، تحقیق کی غرض سے اپنی تحویل میں لے لیے اور چوں کہ میرے ہی کمرے کے پاس میرے ہمراز آغا افتخار حسین کا کمرہ تھا جو فلسفے کے طالب علم تھے اور 'اس برقع پوش' کے کلاس فیلو، مجھے ہو نہ ہو یہ آغا کی شرارت ہے۔ آغا کو

طلب کیا گیا، مختار مرحوم اپنے ڈیل ڈول سے تھانے دار معلوم ہوتے تھے۔ ایک ڈپٹ جو انھوں نے لگائی آغا اقبال مجرم بن گئے۔ ان کو تنبیہ کردی گئی۔ مجھے ہمیشہ تعجب رہا کہ آغا نے میری تحریر کو اپنی تحریر کیوں کر مان لیا! مختار مرحوم ریٹائرڈ ہونے کے بعد جب بھی ملتے آغا کا ذکر کر کے انھیں بُرا بھلا کہتے اس طرح میری شرافت کا بھرم ان کے مرتے وقت تک قائم رہا۔ کاش آج وہ زندہ ہوتے اور میرا اقبالِ جرم کی یہ تحریر پڑھ سکتے۔

جب دال نہ گلی تو میں نے قدم روک لیے اور پھر گھر کے نہال کا خیال کرنے لگا۔ اور تحقیق کی رفتار تیز تر کردی۔

دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں میری شادی بنتِ عم نجمہ سے ہوگئی۔ میں انجینئرنگ کالج کوارٹر نمبر ۴ میں مقیم تھا کہ ایک روز ایک صوفی صورت خرقہ پوش نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں باہر نکلا وانھوں نے اپنا نام بتایا۔ نام سے فوراً پہچان گیا کہ اسی برقعہ پوش کے والد بزرگوار ہیں۔ ان کی صوفیانہ طرز زندگی کے قصے سُن چکا تھا۔ بہت شفقت سے ملے۔ اندر سے میرے بچّے کے رونے کی آواز آئی۔ کان کھڑے کیے اور پوچھا ماشاءاللہ آپ بال بچّوں والے ہوگئے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں پچھلے سال میری شادی ہوگئی ہے۔ کہنے لگے میری لڑکی جو کرامت حسین گرلز کالج میں لیکچرر ہے اس کو آپ کے نام کی رٹ ہوگئی ہے۔ کچھ بیمار سی رہنے لگی ہے اور جب دورہ پڑتا ہے تو چیختی ہے مسعود! مسعود! میں جواب دیتا ہوں مردود! مردود! لیکن اب کوئی چارۂ کار نہیں۔ میں نے ان کا جملہ دھرایا "جی ہاں اب کوئی چارۂ کار نہیں"! اشارہ کیا کہ شرع میں ایک سے زائد جائز ہیں۔ میں نے مودّبانہ کہا میری شرع میں نہیں۔ معاملہ یہیں پر ختم ہو گیا اس لیے کہ کچھ عرصے کے بعد پورا خاندان پاکستان ہجرت کر گیا۔

۱۹۷۷ء میں پاکستان سے اچانک ایک خط ملا۔ یہ برقعہ پوش کی چھوٹی بہن کا تھا جنھوں نے مجھ سے اپنے بھائی کا جامعہ ملیہ کے کیمپس میں جو مکان رہ گیا تھا اور جس پر اب اغیار کا قبضہ تھا، واگذاشت کرانے کے سلسلے میں مدد چاہی تھی۔ آخر میں لکھا تھا، والد کا انتقال ہو چکا ہے اور بڑی بہن کا بھی جو حیدرآباد میں لیکچرر کی حیثیت سے کام کر رہی تھیں میں کرسی پر

تھوڑی دیر کے لیے ساکت وصامت رہ گیا۔ خیال پینتیس سال قبل کی علی گڑھ کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ گھر لوٹا تو میں نے بجمہ کو سینے سے لگالیا اور سارے راز سربستہ بتادیے ان کا مجھ پر اعتماد اور بڑھ گیا۔ شاید اسی لیے میں اپنی مرحوم خیالی محبت کو، کچھ عرصے بعد یہ خراجِ عقیدت پیش کر سکا۔

پرچھائیں کی موت

وہ پرچھائیں تھی
سیاہ برقع میں ملبوس ایک پرچھائیں
میرا روشن وجود جس کا برسوں تعاقب کرتا رہا
میری دزدیدہ نظریں جس کی سیہ نقاب سے

برسوں کشاکش میں مبتلا رہیں
— تاکہ اس کے رُخِ روشن کو بے نقاب کر سکیں
— تاکہ اس کے خط وخال کو رنگوں کا غسل دے سکیں
لیکن سماج کو یہ منظور نہ تھا
میں جلتا رہا اور وہ کوئلہ بنتی رہی
اپنے انگاروں کو دباتی رہی
بغیر یہ خیال کیے کہ اس کی نزار ہڈیاں
ایک دن جل کر مُشتِ خاک بن جائیں گی
وقت فاصلے میں تبدیل ہوتا گیا
بالآخر ایک دن وہ بھڑک اٹھی
اور اُس کی زبان پر پہلی بار خدا کے بجائے میرا نام آگیا!
مسدود — گونج آئی — مردود!!
وہ میری یادوں کے طاق کا گلدستہ بنتی گئی

لیکن میں اس کے روشن وجود میں سایہ بن کر داخل ہوتا گیا
دونوں بے خبر۔ لیکن دور ہو کر قریب
یکا یک خبر کی بجلی ٹوٹی کہ چند سال پہلے وطن سے دور
وہ قبر کی تاریکیوں میں اتر گئی
"غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا"
میری زبان پر پہلی بار خدا کا نام آگیا! (۶۷۹)

بات کی رَو میں مَیں جس زمانے کا ذکر کر رہا تھا اس سے بہت آگے نکل گیا۔ ذکر تھا اس دور کی تحقیق اور تخلیق کا جن کی دوہری ڈگر پر ان دنوں رواں دواں تھا۔ تحقیق سے گریز تخلیق میں کرتا اور پھر اسی کی جانب لوٹتا میرے لیے یہ خیال، اور استدلال کے ہم دگر ہونے کا زمانہ تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ تحقیق و تخلیق ذہن کی متضاد صلاحیتوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ ہر وہ شخص جو تعقّل کی سطح پر کام کرتا ہے کسی نہ کسی قسم کے تخلیقی کام سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی کبھی اس عمل میں شرکت بھی کرتا ہے۔ میں دن میں اردو کی داستان لکھتا اور شام کے سایوں یا رات کی تاریکی میں گیت یا غزل کے ستارے تراشتا۔ چوں کہ میری شاعری اور میری زندگی میں گہرا ربط رہا ہے۔ اسی لیے اپنے مجموعۂ کلام کے پیش لفظ کا آغاز ان جملوں سے کیا۔

"شعر میرے لیے ذریعۂ نجات رہا ہے۔ اس نے کبھی بھی مشغلے یا مشق کی صورت اختیار نہیں کی۔ یہ ہمارا فن بھی نہیں ٹھہرا۔"

اس قدر ضرور ہے لسانیات میں میری تربیت ہی سبب ہے کہ شعر میرے لیے ہمہ وقت کا مشغلہ نہ بن سکا۔ شاعری کی دیوی کا جلاپا مشہور ہے۔ اس کا ہو کر آدمی پھر کسی کام کا نہیں رہتا۔ اور میں یہ قیمت دینے کو تیار نہیں تھا۔

یہ زمانہ میرے لیے تحقیق کے ساتھ آمد آمد شعر کا دور بھی تھا۔ میں عام طور پر حرکت

یا گنگناہٹ کے سہارے شعر کہتا تھا۔ کبھی کبھی بستر پر لیٹے ہوئے خاموشی میں بھی شعر ہو جاتے۔ بعض گیت اور غزلیں ایک دار میں ہو گئی ہیں۔ بعض تخلیقی نقش، ناتمام رہ گئے ہیں جن کی جانب بار بار مراجعت کرنا پڑی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ آمد اور آورد میں خطِ فاصل کھینچنا دشوار ہے۔ شعر کا محرک کوئی جذبہ اور خیال بھی ہو سکتا ہے جو عرصے سے ذہن میں بالیدہ ہو رہا ہو۔ کبھی کبھی ایک مصرع یا ترکیب ذہن میں آتے ہی تخلیق کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ نِرا آورد کا شعر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہنے والا جذبہ کی آنچ سے خالی ہو۔ اگر محسوسات کا دباؤ اپنی پوری شدّت کے ساتھ موجود ہے تو زبان کا سانچہ اور ہیولا خود بخود تیار ہونے لگتا ہے۔ لی رک میں روح کا بے تابانہ رقص تیز رفتاری اور شدت کے ساتھ عمل پیرا ہوتا ہے اسی لیئے اس کو دیر تک انگیز کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ طویل نظموں جسے ایڈگر ایلن پو نے "چند اچھی چھوٹی اور چند کمزور بڑی نظموں کا مجموعہ کہا ہے" اگر مناسب حصص یا ڈرامائی کرداروں میں تقسیم نہ ہوں تو سپاٹ ہو جاتی ہیں۔ میں نے 'خوابِ سنگ'، یا 'روپ بنگال' کے علاوہ کوئی طویل نظم نہیں کہی۔ ایک کو ہئیت اور دوسری کو ڈرامائی تاثر نے سنبھال لیا ہے۔ میں نے اپنے شعری تجربے کو ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

" شعر کیسے بنتا یا اترتا ہے؟ خارجی احول اس وقت پیشِ نظر نہیں، اُس کے اثرات مُسلّم، لیکن تخلیقی عمل کے سرے کو وہاں سے لینا ہوگا جہاں سے شاعر ذہنی تیاری میں مبتلا نظر آتا ہے۔ کوئی ایک خیال، ذرا سی واردات، کوئی ایک لفظ یا مصرع اور ذہنی تیاری کا عمل شروع ہو گیا۔ نفسیاتی اصطلاح میں یہ سمجھئے کہ روح میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ آئی۔ اے۔ رچرڈز کے الفاظ مستعار لیجئے تو یہ کہ نازک ترین دماغی اعصاب میں اہتزاز پیدا ہو گیا۔ جب یہ جاگ، یہ ارتعاش، یہ اہتزاز کسی لفظ کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے تو تنقیدی تجزیہ کافی دور تک دستگیری کرتا ہے لیکن جب یہ کیفیت جامۂ حرف میں نہیں بلکہ مجرد تصوّرات میں جذبات زدہ تخیل سے زینہ بہ زینہ قدم نیچے اتارتی ہے تو تشبیہات و استعارات کی ایک مبہم سی کائنات پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، جسے الفاظ کی چہار دیواری رفتہ رفتہ سمیٹتی چلی جاتی ہے۔ یہ چہار دیواری بار بار بنتی اور بگڑتی ہے۔ خیال اس طرح پھوٹتا ہے جیسے شگوفے سے شگوفہ تیز سے تیز اور اس کی

بھی ان لمحات کا تجزیہ کرنے سے معذور ہے۔ ایک گوئٹے کو معلوم ہوتا ہے کہ جامِ انسانی میں شرابِ روحانی انڈیلی جارہی ہے۔ ایک نیٹشے کو ہم کسی آسمانی طاقت کا آلۂ کار نظر آتے ہیں۔ میر کو "وہ" اور غالب کو "ایک شخص" پسِ پردہ نظر آتا ہے۔ غرض کہ شعور اور لاشعور کا کوئی امتیاز اس وقت ممکن نہیں۔ فنکارانہ عمل جذبہ و تخیل کی غیر معینہ کیفیات سے شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ مبہم واضح ہوتا ہے اور بے نام نام پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ زبان اور ہیئت کے سانچے ابھرنے لگتے ہیں۔"

میرے سلسلے میں دقّت یہ تھی کہ میرا ذہن بہ یک وقت شعر کی گرمی اور لسانیات کی سردی کو محسوس کرتا تھا۔ اگر چند گھنٹے میں زبان کے تجزیے پر صرف کرتا تو چند لمحے شعر کے بے تابانہ رقص کے ساتھ بسر کرتا تھا۔ ذہن کے دونوں رویّوں میں تصادم اس وجہ سے نہیں ہوتا تھا کہ تخلیقی عمل کے وقت تنقیدی شعور تہ نشین ہو جاتا تھا۔ میں اکثر غلط الفاظ اور غلط محاورات باندھ جاتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس وقت تک میرا کلاسیکی شاعری کا مطالعہ محدود تھا لہٰذا میں زبان کی نوک پلک سے کماحقہٗ واقف نہیں تھا۔ میں نے خاص طور پر لکھنوی شعرا کے مطالعے کی جانب سے اغماض کیا تھا، حالاں کہ زبانِ شعر کی منجائی جس طرح انھوں نے کی ہے اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔

اس زمانے میں آمدِ شعر خوب تھی۔ "وہ بات" (۴۲ء) میں لکھا۔ "ہچکولے"، "میں کیسے آنکھ اُٹھاؤں"، "موج کا گیت"، "آج تو شاید وہ آجائے"، "آج بھی انکار" یہ سب گیت ۴۲ء کے دوران لکھے۔ باقی گیت زیادہ تر ۴۴ء اور ۴۵ء کی یادگار ہیں۔ غزلوں کا دور ۴۵ء سے شروع ہو جاتا ہے اور نظموں کا ۴۶ء سے (تفصیل کے لیے دیکھیے دو نیم، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۶ء علی گڑھ)۔ اس شعری تجربے کے وقت میری عمر ۲۵، ۲۶ سال کی تھی۔ میں عمر کے خالص رومانی دور سے نکل کر مردانہ بلوغت کے دور میں قدم رکھ چکا تھا۔ جنس کا دریائے بے تابی جسم میں زوروں سے موج زن تھا۔ علی گڑھ کے برقعہ پوش ماحول میں ہر برقع نشین معشوق نظر آتا تھا (ایک خیالی معشوق کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں)۔ چوں کہ میں نظرباز نہیں تھا اس لیے "دید" کے مواقع صرف کلاس روم یا شعبے کے آس پاس سے آگے نہیں بڑھتے، لیکن بہرحال دل

کسی چیز کا متلاشی ضرور تھا۔ بے نام کی جستجو رہی۔ جب اظہار کا حتمی موقع نہیں ملتا تو پرداز تخیل کے ذریعے شعر کی دنیا میں غرق ہو جاتا۔

۱۹۴۴ء میں میری باقاعدہ نسبت نجمہ کے ساتھ ہو گئی۔ کہہ چکا ہوں کہ بھابی جان (منجھلی ممانی) نے نجمہ کے لیے میرا انتخاب تو بہت پہلے کر لیا تھا لیکن اب دق کے موذی مرض میں گرفتار ہونے کے بعد ان کی خواہش اصرار میں تبدیل ہو گئی کہ جلد نسبت ہو جائے۔ میرے بڑے بھائی بہن دونوں حیدرآباد میں تھے۔ خط لکھے گئے اور پھر دونوں کی تحریک پر ۱۹۴۴ء میں میری نسبت باقاعدہ طور پر کر دی گئی۔ میری نسبت اور بعد کو شادی دونوں میں گڈے گڑیا کے بیاہ کا انداز رہا۔ بھائی اور بہن دونوں حیدرآباد میں تھے۔ تحریک وہی کر سکتے تھے۔ لیکن انھیں کون لکھے۔ ننہال کا پورا خاندان لڑکی کا طرفدار تھا۔ جب بھابی جان (منجھلی ممانی صاحبہ) نے یہ صورت دیکھی تو گھر کے سب سے معتبر ملازم اجّو (آرزو حسن) کی خدمات حاصل کی گئیں۔

ایک دن حسب معمول میں کوٹھی (پرانا مردانہ مکان) میں لیٹا ہوا تھا کہ اجّو آیا اور مجھ سے کہنے لگا، "میاں آپ اپنے بھائی بہن کو خط کیوں نہیں لکھتے تاکہ نسبت پکّی ہو جائے"۔ میں ذہنی طور پر تو اس کے لیے تیار تھا لیکن قدیم خاندان کے لڑکوں میں شرم و لحاظ کا مادّہ ہوتا ہے، وہ ہمیشہ مانع رہا۔ سوچتا رہا کہ کیسے لکھوں اور پھر کس کو لکھوں، بڑے بھائی یا بڑی بہن کو۔ بالآخر بہن کے نام قرعۂ فال نکلا۔ میں نے لفافہ منگوایا اور دو سطروں میں اُن سے خواہش کی کہ وہ نانا جان کو (وہ ہی خاندان کے بزرگ تھے) اس نسبت کے بارے میں لکھیں۔ خط ملا تو انھوں نے بڑے بھائی امتیاز حسین خاں سے مشورہ کیا اور پھر ننّے میاں کو نسبت کے لیے خط لکھا۔ ادھر میں حیدرآباد کے خط کا روزانہ انتظار کرتا۔ بالآخر ایک سہ پہر کو نانا جان اپنے ہاتھ میں کھلا خط لیے زنانے گھر میں آئے اور بی، (نانی صاحبہ) سے بولے لو نجو کی نسبت کا یہ خط آگیا ہے۔ پھر کہا بھئی لڑکی کے ماں باپ کی مرضی بھی پوچھ لو۔ انھوں نے کہا بس طے ہے ان کی مرضی کیا پوچھنا۔ لیجیے قائم گنج کی زبان میں "لڑکی دِل گئی"۔ گڈّے گڑیا کی نسبت کا یہ سارا تماشا میرے سامنے ہوا۔ اب جو تعطیلات میں قائم گنج جاتا تو اجنبی احساس کے ساتھ جاتا۔ ہر ایک کی نظر میرے زنانے میں آمد و رفت پر رہتی۔ نجمہ میں بھی ایک قسم کی جھجک سی پیدا ہو گئی تھی۔ میرا

سب سے بڑا زیاں دودھ ملائی کا تھا جس کے لیے مجھے کسی دوسری بنتِ عم کا سہارا لینا پڑتا۔ مگر وہ بات کہاں۔۔۔۔

اسی زمانے میں مَیں نے علی گڑھ کے صحرا میں بیٹھ کر بجّہ کی یاد کے دیئے روشن کیے اور 'جمال' کے عنوان سے اسے یہ خراجِ محبت پیش کیا:

جمال

کہاں سے آ گئیں رنگینیاں تمنّا میں
کہ پھر خیال نے لالے کھلائے صحرا میں
تری نگاہ سے مری نظر میں مستی ہے
ترے جمال سے موجیں ہیں دل کے دریا میں
یہ ہو رہا ہے گماں تیرے جسمِ خوبی پر
بھٹک کے حور چلی آئی ہو نہ دُنیا میں
نظر میں کھُلتے ہوئے موتیوں کی جھکاریں
لبوں پہ رنگ جو ملتا ہے جام و مینا میں
وہ مسکرانے سے آنکھوں میں بے شمار کنول
وہ کسمساتی ادائیں تمام اعضا میں
تُلا تُلا سا تبسّم، جھکی ہوئی سی نظر
سنی سنی سی وہ پلکیں غبارِ شرما میں
وہ نرم نیمے سے کُندن بدن کی رنگ ترنگ
مِنی ہوئی سی وہ کرنیں لباسِ زیبا میں
جو گوشے گوشے میں پنہاں ہے اس کے راہ گزیدہ
خیال گُم ہوا جاتا ہے قدِّ رعنا میں

قدم قدم پہ رہی تمکنت کا ایک سوال
ہے کوئی دوسرا ہم سا سوادِ گنگا میں؟
بتا میں تجھ سے کہوں کیا بجز وہ شوق کی بات
کہ ڈال رکھا ہے جس کو جوازِ معنیٰ میں
جمالِ یار لطیف، آرزو ہے اُس سے لطیف
یہ آئی ہے، نہ وہ آئے گا، حرفِ سادہ میں (۶۴۶)

اس نسبت کے بعد ایسا لگا کہ ع عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔ زندگی میں ایک معنویت اور مرکزیت آگئی اور شاعری میں وسعت، یعنی اب موضوعاتِ سخن 'ذات' کے علاوہ 'کائنات' سے متعلق بھی ہونے لگے۔

۱۹۴۵ء کے ستمبر میں، ٹھیک دو سال کے بعد میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے اپنا مقالہ داخل کر دیا۔ اِدھر یونیورسٹی کی ملازمت میں بھی میرے قدم جم گئے تھے۔

۱۹۴۵ء میں سرور صاحب کے رضا انٹر کالج کی پرنسپل شپ پر چلے جانے کے بعد میرا تقرر بحیثیت لکچرر مستقل طور پر شعبۂ اردو میں ہو گیا۔ چند مہینے میں میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے سرفراز کر دیا گیا۔ زبانی امتحان لینے کے لیے سید سلیمان ندوی کو بلایا گیا جو میرے مقالے کے دو ممتحنوں میں سے ایک تھے۔ سید صاحب ان دنوں دوسرے عالم میں تھے، یعنی تصوف کا غلبہ تھا۔ حسبِ معمول رشید صاحب کے یہاں ان کا قیام تھا۔ زبانی امتحان سے فارغ ہونے کے بعد تعظیماً ان سے ملاقات کرنے گیا۔ مجھے تعجب ہوا جب انھوں نے مجھ سے بلا واسطہ سوال کیا کہ میں تحقیقی کام کے لیے یہ سب تگ و دو کیوں کر رہا ہوں۔ میں نے مختصر الفاظ میں جواب دیا۔ "نشاطِ کار کے لیے" بولے "ہوس ہے!"

اب ہم ۱۹۴۷ء کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ ملک کی فضا پر 'وصل' نہیں 'فصل' کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ میں اکثر غالب کے اس شعر میں پناہ لیتا تھا ؎

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

علی گڑھ مسلم لیگ کا گڑھ بن چکا تھا۔ قائدِ اعظم جناح اِس دانش کدے میں بار بار آتے اور اسے اپنے 'اسلحہ خانے' سے تعبیر کرتے۔ میرا قوم پرستی کا ذہن جامعہ ملیہ کے ماحول میں بن چکا تھا۔ ذاتی طور پر میں ہندی اور ہندوؤں کے بہت قریب رہ چکا تھا۔ ڈھاکہ کے چار سالہ قیام میں مجھے ہندو کلچر کے سب سے تربیت یافتہ نمونوں کو بنگالی زندگی میں دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ہندی زبان اور شاعری کے مطالعے نے ہندو ثقافت سے وہ اجنبیت بھی دور کر دی تھی جو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن میں بالعموم ہوتی تھی۔ میں عملی سیاست سے بہت دور رہتا لیکن بہر حال سیاسی حالات کا میری فکر و تصورات پر اثر انداز ہونا لازمی تھا۔

ہندو کلچر، تاریخ اور ادبیات کے بہت قریب رہنے کے باوجود میں ان کی معاشرتی زندگی اور دیو مالائی تصورات کا ہمیشہ نقاد رہا ہوں۔ میں اس ثقافت میں بہت سی ڈھائی ہزار سال پہلے کی خرافات دیکھتا ہوں۔ یہ نہیں کہ اسلامی تہذیب خرافات سے یکسر عاری ہے۔ لیکن چوں کہ اسلام نسبتاً جدید زمانے کی پیداوار ہے اِس لیے دیو مالائی مہملات سے خالی ضرور ہے۔ یوں میں عملی مسلمان کبھی نہیں رہا (سوائے جامعہ ملیہ کے اسکول کے زمانے کے) لیکن اسلام اور اسلامی اقتدار کو عزیز رکھتا ہوں۔ اس پس منظر کی وجہ سے اس زمانے میں مسلم لیگ کی سیاست سے متاثر ہو گیا۔ میرے ارد گرد یہی ماحول تھا، علی گڑھ ہو کہ قائم گنج۔ لیکن میرے خواب و خیال میں بھی یہ نہیں آیا تھا کہ ملک 'دو نیم' ہو سکتا ہے۔ مجھے اکثر یوپی کے مسلمانوں کی لیگ پرستی پر ہنسی آتی تھی جس کے لیے 'جائے رفتن، نہ ہو اسے تو جائے ماندن' کا بند و بست رکھنا ضروری ہے۔

لیکن جو ہونا تھا سو ہوا۔ میں نے ۱۹۴۷ء کا پورا منظر امین ہاسٹل سے دیکھا۔ روز افواہیں گرم ہوتیں کہ مسلم یونیورسٹی پر چڑھائی ہونے والی ہے۔ چوں کہ یہ ہاسٹل اس وقت یونیورسٹی کیمپس کے بالکل کنارے پر تھا، اس لیے ہمارے لیے شب و روز خطرہ رہتا۔ دن سو کر اور راتیں جاگ کر گذرتی تھیں۔ آزادی آئی مگر خون میں نہائی ہوئی؛

کوئی بھی رونقِ محفل کو دیکھ سکتا ہے
تمہیں بتاؤ جب آنکھوں میں اس قدر نم ہو

دیارِ ہند سے جاتے ہوئے بتانِ فرنگ
وہ داغ دیئے گئے جس کا نہ کوئی مرہم ہو
کنارِ گنگ و جمن آپ چھوڑ کر مسعودؔ
کہیں نہ جائیں نظر اُن کی لاکھ برہم ہو

عملی سیاست سے دُور ایک حسّاس دل انسان اپنے طور پر کوائفِ وطن کو اس طرح محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس قسم کے جذبات سے مملو شاعری کی داد دینے والے بہت کم رہ گئے تھے۔ مجھے ۱۹۴۷ء کے آس پاس کی ایک صحبت یاد رہ گئی ہے۔ عبدالمجید خواجہ صاحب نے اپنے یہاں کچھ حضرات کو کھانے پر مدعو کیا تھا جس میں علی گڑھ کے ضلع مجسٹریٹ بھی تھے۔ کھانے کے بعد حسبِ روایت، سخنوروں سے کلام سنانے کی فرمائش کی گئی۔ جب میں نے اپنی غزل کے مذکورہ بالا اشعار ترنّم کے ساتھ پڑھے تو عبدالمجید خواجہ صاحب کے سینے کا قوم پرست بلبلا اٹھا۔ وہ بار بار ضلع مجسٹریٹ کو مخاطب کر کے ان اشعار کو اٹھاتے تھے اس طرح کہ وہ بے چارا خود کو مدعا علیہ کے کٹہرے میں کھڑا محسوس کرنے لگا۔

جب ۱۹۴۷ء کی موجِ خوں سر سے گذر چکی اور منجھلی ممانی صاحبہ کی صحت روز بروز گرنے لگی تو اصرار ہوا کہ اب میری شادی ہو جانی چاہیئے۔ لیکن کون کرے۔ میرے بڑے بھائی بہن تو حیدر آباد میں تھے، جہاں کے سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اور چاروں جانب سے خاموشی تھی۔ تمام عزیزوں کا یکجا ہونا مشکل ہوتا تھا۔ اس لیئے طے پایا کہ رسم نہایت سادگی سے ادا کر دی جائے۔ دولھا بھی اس وقت ننہال کا تھا اور دلہن بھی ننہال کی۔ جیسے ایک گھروندے میں گڈّے گڑیا کا بیاہ ہو رہا ہو۔ چنانچہ میں ممانی صاحبہ کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے علی گڑھ سے ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو قائم گنج کے لیئے روانہ ہو گیا۔ وہاں گاڑی ساڑھے چار بجے کے قریب پہنچتی تھی۔ تقریباً چھ گھنٹے کا سفر تصوّرات کے عالم میں گزرا۔ قائم گنج جب پہنچا تو اسٹیشن پر اڑتی ہوئی خبر سُنی کہ گاندھی جی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ گھر پہنچا تو ایک سراسیمگی کا عالم پایا۔ سب کو یہ فکر تھی کہ کس نے قتل کیا ہے۔

اگر کسی مسلمان نے یہ حرکت کی ہے تو قیامت گزر جائے گی۔ لیکن تھوڑے ہی دیر میں ریڈیو نے قاتل کا نشان پتہ بتا دیا۔ شادی ۳۱ جنوری کو مقرر تھی۔ لیکن گاندھی جی کے سوئم تک ملتوی کرنا پڑی۔

بچپن سے میری عادت رہی ہے کہ موت پر بھی میرے آنسو نہیں نکلتے۔ لیکن ۳۰ جنوری کی رات کو میں دیر تک سسکیوں سے روتا رہا۔

نکاح کی رسم اب ۳ فروری کی سہ پہر کو مقرر ہوئی۔ نجمہ ۳۰ جنوری سے پہلے مائیوں بٹھا دی گئی تھیں، ہاتھوں میں مہندی لگ چکی تھی۔ اُن کے ساتھ سلمیٰ بھی۔ بھابی جان کی خواہش کے مطابق طے پایا تھا کہ ان کے بیٹے بدر عالم خاں کی بھی شادی اسی روز ہو جائے۔ چنانچہ ۳ فروری کی سہ پہر کو مُلّا چھمّی نے (جن کے بارے میں مشہور تھا کہ شوق کرتے ہیں) ہم دونوں کا نکاح چند چھواروں پر متعامی عزیزوں کے سامنے مردانے مکان کے چبوترے پر پڑھا دیا۔ نہ سہرا تھا نہ دھوم دھام۔ میرے خیال میں اس قدر سادہ شادی اسلام کے ابتدائی عہد میں ہوئی ہو تو ہوئی ہو، اور کہیں دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی بس دو گڈّوں اور دو گڑیوں کا بیاہ تھا جو کر دیا گیا۔ میرے بڑے بھائی کے خسر منظور عالم خاں نے شکایت کی کہ امتیاز تو کچھ اور ہی سوچ رہے تھے، یہاں کسی کو خبر کیے بغیر یہ سب کچھ کر دیا گیا۔ لیکن مرض الموت میں گرفتار ایک مریضہ کی خواہش کا احترام بھی ضروری تھا۔ میں بھی انتظار سے عاجز آ چکا تھا۔

شادی کے دو روز بعد میں علی گڑھ چلا آیا۔ یہاں میں نے پہلے سے یونیورسٹی کا ایک کوارٹر اپنے نام الاٹ کرا لیا تھا۔ چھ ہفتے بعد جا کر نجمہ کو بھی لے آیا۔ امین ہاسٹل کی سکونت ترک ہوئی اور انجینئرنگ کوارٹر نمبر ۴ میں متاہلانہ زندگی کی آسودگی کا آغاز ہوا۔

---

۴۸ تا ۶۲ء (درمیان میں ۲½ سال کے وقفے کے علاوہ جب میں بغرضِ تعلیم یورپ گیا ہوا تھا) میری نشست و برخاست کا محور پروفیسر عمر الدین کی قیام گاہ تھی، جہاں مجھ جیسے چند اور صاحبان روز جمع ہو جاتے تھے۔ عمر الدین صاحب فلسفہ کے استاد تھے۔ جوانی میں انھوں نے امام غزالی کی فکر پہ کام کیا تھا۔ اس کے بعد وہ دمّہ کے مریض ہو گئے، جس نے ان کا ساتھ مرتے دم تک نہ چھوڑا

پہلی شادی پنجاب کے کسی قصبے میں کی تھی۔ مسلم یونیورسٹی میں برسرِ روزگار ہونے کے بعد انھوں نے دوسری شادی خلیل مراد صاحب کی صاحبزادی سے کی جو فزکس میں لکچرر تھے اور میرس روڈ پر خلیل منزل کے مالک۔ ان کی دوسری بیگم علی گڑھ کی تعلیم یافتہ تھیں۔ ان سے دو بچے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئے، مگر دمہ کے عارضے کے بعد ان سے علیحدگی ہو گئی۔ وہ پہلے ایم۔ ایم ہاسٹل کے وارڈن کی حیثیت سے، اور پھر یونیورسٹی کے مکان میں یکّا و تنہا رہتے تھے۔ انھیں دُسرائت کی ضرورت تھی اور محلّے کے نوجوان اساتذہ کو ایک بیٹھک کی۔ چنانچہ ان کا مکان ایک مستقل نشست گاہ بن گیا تھا۔ جہاں سہ پہر تا نصف شب لوگ آتے جاتے رہتے۔ اِس نشست کے خاص رکن میرے علاوہ احسان رشید صاحب، ابرار مصطفیٰ صاحب، عمر علی صاحب، وحید قریشی اور ظفر احمد صدیقی صاحبان تھے۔ باقی موقتی تھے، یعنی آتے جاتے رہتے تھے۔ خاص نشست مغرب کے بعد شروع ہوتی۔ اُس وقت دربارِ عام والے اُٹھ جاتے یا اٹھا دیئے جاتے۔ عمالدین صاحب کا معمول تھا کہ اگر کوئی شخص خانقاہ کے آداب سے ناواقفیت کی بنا پر اپنی نشست کو مغرب کے بعد طول دینا چاہتا تو اسے یاد دلا دیا جاتا کہ اُسے اور بھی بہت سے کام ہوں گے جنھیں جا کر کرے۔

یہ مجلس خالص غیر سیاسی تھی۔ موضوعات فلسفے سے لے کر واقعات یونیورسٹی پر بنتِ مسلمانوں کے بارے میں ترددات سے ہوتی ہوئی وحید قریشی کی بذلہ سنجی پر ختم ہوتی۔ بیچ بیچ میں عمالدین صاحب کھانسی کی شدّت کو ختم کرنے کے لیے بھپارے سے کر نسوار اور شربت نزلہ تک استعمال کرتے جاتے۔ گرم گرم چائے کا مسلسل دور چلتا رہتا۔ جوں جوں رات بھیگتی ان کے دمہ کی شکایت بڑھتی جاتی اور اسی نسبت سے ان کی یہ خواہش کہ حاضرین ان کا شب کی تنہائی میں ساتھ دیں۔

وہ صحیح معنوں میں مردِ قلندر تھے جو زیرِ بابل کو کبھی کہنے نہ سکا قند پر عمل کرتے تھے۔ دل کے کھرے اور لہجے کے اکھڑ تھے۔ زبان ان کی لونڈی تھی جو فرمادیا وہی مستند ہو گیا۔ مثلاً کہتے تھے کہ "ہم نے علی گڑھ کے لیے بڑی بڑی سیکری فائی یاں' Sacrifices کر رکھی ہیں لیکن کوئی رِکگ نائی Recognize نہیں کرتا" پلیژر Pleasure کو 'پلیرژ' اور میژر Measure کو میٹر کہتے اپنی جوانی اور استادوں کے قصے مزے لے لے کر سناتے۔ وہ فلسفے کے مشہور استاد ڈاکٹر ظفر الحسن کے

شاگرد تھے۔ ڈاکٹر ظفر الحسن اُستاد ہی نہیں طالب علموں کے لیے پیر و مرشد بھی تھے۔ آخری عمر میں لہراتی داڑھی کے ساتھ چوغے میں ملبوس رہتے تھے۔ طالب علم ان کی علمیت سے مرعوب اور شخصیت سے خائف رہتے تھے۔ ادھیڑ عمر میں جب انھوں نے شادی کی تو اطبا نے حلوہ مغز کنجشک (گوریا) تجویز کیا جس کی فراہمی کے لیے عمر الدین صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ چنانچہ وہ

بنا کر چڑی مار نے ایک جال
لیا جال کو اپنے کاندھے پہ ڈال

کی شکل میں صبح سے شام تک مارے مارے پھرتے اور کہیں سے درجن ڈیڑھ درجن گوریا پکڑ کر لاتے، جن کو ذبح کر کے ان کا مغز نکالا جاتا پھر دیگر مبہی اجزا کے ساتھ اُن کا حلوہ اصلی گھی میں تیار کیا جاتا۔

ذاکر باغ میں رشید صاحب اور ان کا دروازہ آمنے سامنے تھا لیکن دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر رہتے تھے۔ دراصل دونوں دو مختلف کلچروں کے نمائندے تھے۔ یہ گنگا اور راوی کے پانی کا فرق تھا لیکن ۱۴ راگست ۶۴ء کو رشید صاحب نے عمر الدین صاحب کی وفات پر جو خط مجھے حیدر آباد لکھا تھا، اس سے اُن کی قربت کا علم ہوتا ہے۔

> "عمر الدین صاحب کی وفات کچھ دنوں سے غیر متوقع نہیں رہی تھی۔ کئی مہینے سے مری ہمت ان کو دیکھنے جانے کی نہ ہوئی باوجود اس کے کہ وہ طرح طرح سے بار بار یاد کرتے رہے اور احسان کا بھی اصرار رہا۔ جس کو زندہ، ہنستا، بولتا محبت کرتا ہوا دیکھتا چلا آیا، اس کو موت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔
>
> عمر الدین صاحب سے ان کی طالب علمی کے زمانے سے آشنا رہا۔ رفیق باصفا تھے۔ آپ اور احسان کو تو شاید وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ظاہر کتنا کھردرا اور ناقابلِ التفات، باطن مہر و وفا سے کیسا مُزیّن و مُعطّر!"

کسی محترم یا عزیز کی موت پر بھی میرے آنسو نہیں نکلے اُن کی تلافی میں شعر سے کرتا ہوں:

بیادِ دوست

اندھیری رات میں یُوں گُل ہوا چراغِ دوست
حیات اب نہ کبھی پائے گی سُراغِ دوست
بس ایک یاد! کہ روشن ہیں جس سے دیدۂ و دل
مژہ پہ ہے یہ ستارہ تو دل میں داغِ دوست

کہیں تو کس سے کہیں جا کے داستانِ دوست
یہ سانحہ ہے عجب، مرگِ ناگہانِ دوست
وہ جس کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں نظریں یوں شب و روز
کہ جب ملا کوئی انساں ہوا گمانِ دوست

یہ کھویا کھویا سا کیوں آج ہے دیارِ دوست
یہ کیوں ہے خاک بسر آج رہ گزارِ دوست
مگر یہ دل کہ گزرگاہِ ماہ و سال نہیں
رہے گا تا بہ ابد محوِ انتظارِ دوست

نہ کہیے کچھ کہ یہی ہے بس اب رضائے دوست
نہ کیجیے اُف کہ یہی ہے یہاں وفائے دوست
یہ پردہ داری و دوری، یہ فصل و مہجوری
برائے دوست ہوئی یہ بھی اک ادائے دوست

حیدر آباد میں جب میں شخصی مرثیہ لکھ رہا تھا تو مجھے اک لمحہ کے لیے محسوس

کہ میں اپنے شہر اور اپنے لوگوں سے دور ہوں۔ میری یادوں کے پردے پر ماضی کی تصویریں اُبھرنے لگیں۔ عمرالدین صاحب کا دَم دَمے کے ہاتھ میں ہونا لیکن پھر بھی جینے کی آرزو کا زندہ رکھنا۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی سے فرمائش ہوتی کہ آج پنچایتی کھانا ہوگا۔ میکر یہاں کی ڈش مقرر تھی، قیمے بھرے کریلے۔ ہم سب کو محسوس ہوتا کہ ہم سب ایک اہل خانہ ہیں۔ انھیں کی تحریک پر علی گڑھ سے رخصت ہوتے وقت احباب نے میری جتنی دعوتیں کیں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہوں۔ وہ میری علی گڑھ واپسی کے رشید صاحب ہی کی طرح منتظر تھے، لیکن میں وہاں چار سال کی تاخیر سے پہنچا۔

آٹھواں باب
دیارِ فرنگ

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں (اقبالؔ)

(۵۰ تا ۵۳ء)

یونیورسٹی کے انجینیرنگ کوارٹرز نمبر ۴ میں نجمہ کے ساتھ ڈھائی سال تک مقیم رہا۔ اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ میرے پہلے بچے جاوید حسین کی (جو اب انجینیرنگ کالج میں فزکس کا پروفیسر ہے) ۲ر جنوری ۱۹۵۰ء کو ولادت ہوتی۔ میرے اور نجمہ دونوں کے لیئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ہمارے آگے پیچھے خاندان کا کوئی بڑا نہ تھا جو اس سلسلے میں ہماری رہبری کرتا۔ عرصے کے بعد میرے اندر کا شاعر جاگ اٹھا، اس موقع پر 'ننھا شاہکار' کے عنوان سے ایک نظم کہی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

میرا ننھا سا شاہکار ہے تو
ماں کی آنکھوں میں نوبہار ہے تو
پھول کی پنکھڑی سے نازک تر
حرفِ نازک سے شرمسار ہے تو
شعر ہے، خون کا مجسم شعر
گنگناتا ہوا سا پیار ہے تو

ہیں غمِ زندگی کے ابرو خم
یار ہے اور حسین یار ہے تو
رقص کی اُس کے ایک جولانگہ
زندگی کو نیا دیار ہے تو
جو محبت کو پہلی بار آیا
بے قراری میں وہ قرار ہے تو (۶۵۰)

اِدھر میں اپنے بچّے کی ولادت پر مسرّت کی تمثیلات تراش رہا تھا کہ خبر ملی میرے ایک عزیز شاعر شاگرد اشعرؔ ملیح آبادی کی موت نہایت کس مپرسی کے عالم میں واقع ہوئی۔ ولادت اور موت کے دوراہے پر کھڑے ہو کر میں نے جانے والے کا ماتم ان الفاظ میں کیا:

اشعرؔ کی موت

اشعرؔ کی موت ایک گلِ تر کی موت ہے
چشمِ صدف میں یا کسی گوہر کی موت ہے
روحِ ادب سے کہہ دو جواں مَیر شاعرو!
قطرے کی موت ہے، تو سمندر کی موت ہے
کس سے کہوں کہ دامنِ عسرت کے سائے میں
شاعر کی موت ہے، کہ گداگر کی موت ہے
میں گاتا ایک گیت یہ ٹلتی کسی طرح
لیکن یہ سنگ دل ہے، یہ پتھر کی موت ہے (۶۵۰)

دونوں نظموں کو ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو نشاطیہ اور المیہ کا فرق محسوس ہوگا۔ ایک میں تخیل کی کشیدہ کاری ہے تو دوسرے میں الم کی سوزن کاری۔ مجھے اپنی یہ دونوں نظمیں پسند ہیں۔

اِدھر کچھ عرصے سے میں سفرِ یورپ کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں میں نے مسلم یونیورسٹی سے دو سال کی رُخصتِ تعلیمی لی اور ۷ ستمبر ۱۹۵۰ء کو بمبئی سے پانی کے جہاز سے روانہ ہو کر ۲۴ ستمبر کو لندن کی بندرگاہ تل بری پہنچ گیا۔ راستے میں جہاز عدن اور پورٹ سعید پر رُکا۔ معلوم ہوا ابھی ہم مشرق ہی میں ہیں۔ وہی افلاس، چخ چخ، چیخ پکار اور گندگی۔ ہندی ہو کہ یمنی یا مصری، زبانوں کے فرق کے ساتھ ہم ایک ہیں۔ البتہ جب کچھ روز کے بعد جہاز نے جنوبی فرانس کی بندرگاہ مارسیلز پر لنگر کیا اور چند گھنٹے کے لیئے ہم لوگ ساحل پر اُترے تو معلوم ہوا دنیا ہی بدلی ہوئی ہے۔ جا بجا میزوں پر فرانسیسی مئے ارغوانی کی بوتلیں چنی ہوئی تھیں اور ساقیانِ مہوش ساقی گری میں مصروف تھے۔ ہمارے جہاز کے بہت سے ساتھی بلا امتیاز مذہب و ملّت ان میزوں پر پروانہ وار گرے اور نوشا نوش کا کاروبار شروع کر دیا۔ بھیڑ کا ایک باعث وہ نوخیز کم سن فرانسیسی لڑکیاں بھی تھیں جو ہنس ہنس کر جام پیش کر رہی تھیں، بشرطیکہ دام آپ کی جیب میں ہوں۔ میں اِس منظر کا ایک حصّہ بنا کچھ فاصلے پر کھڑا سوچ رہا تھا ؎

میرا یہی خیال ہے گو میں نے پی نہیں
کوئی حسیں پلائے تو یہ شئے بُری نہیں (ریاضؔ)

انگریزی حُسن کے جو نمونے اب تک ہندوستان میں دیکھے تھے وہ بے نمک، بے رنگ اور سپاٹ تھے بحیرۂ روم کے سواحل کے، لاطینی خون سے سرشار حُسن کے نظارے پہلی بار دیکھنے کو ملے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ان کے بارے میں جو تاثرات میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے پچیس برس قبل تھے (دیکھئے یادوں کی دنیا) بالکل وہی میرے تھے۔ ہمارے ذہن میں مکمل نسوانی حُسن کا جو تصوّر تھا اسے ان لڑکیوں میں متشکل پایا۔ وہ بہت تیز فرانسیسی بولتی تھیں، بس کچھ ایسا احساس ہوتا تھا ؎

کیا زبانیں ہیں کترتی ہیں گُلِ نغمہ سدا
کیا دہن ہیں کہ نکل آتی ہے پھر بات میں بات
کیا نگاہیں ہیں کہ شبنم میں شعاعیں پیوست
کیا ادائیں ہیں کہ شاہوں نے یہاں کھائی مات

مارسیلز سے جہاز جبل الطارق ہوتا ہوا لندن کی بندرگاہ تل بری پہنچا۔ وہاں مجھے لینے کے لیے انور انصاری اور ان کی بیگم عزالہ انصاری موجود تھیں جو سال بھر پہلے لندن آچکے تھے۔ ان کی موجودگی کی وجہ سے مجھے وہ دقتیں نہیں اٹھانا پڑیں جو عام طور پر تازہ واردانِ انگلستان کو پیش آتی ہیں۔ میرے قیام کے لیے پہلے سے اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کی پشت پر Tavistock Square کے ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں انتظام تھا۔ میں اس بات سے خوش تھا کہ جہاں میرا داخلہ ہوا ہے یہ اس سے بہت قریب تھا لیکن چند روز رہنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس کی نوعیت تو سرائے کی سی ہے۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی پلنگ تھے وہ بھی اوپر نیچے ڈبل' یعنی ایک پلنگ پر میں اوپر کی منزل میں تھا اور ایک اور لڑکا نیچے کی منزل میں۔ ہر وقت آمد و رفت اور پلنگ کی چوں چوں سے تنگ آکر میں نے قیام گاہ کی تلاش شروع کردی۔ بالآخر Swiss Cottage کے علاقے میں ایک سوئس لینڈ لیڈی کے یہاں کمرہ مل گیا۔ وہ عرصے سے لندن میں بود و باش اختیار کیے ہوئے تھیں اور فی الحال پاس پاس کے دو مکانوں کی مالکہ تھیں۔ ان میں زیادہ تر وہ غیر یورپی طلباء کو قیام و طعام کے معاوضے پر رکھتیں۔ یعنی کمرے کا کرایہ لیتیں اور ناشتہ اور شام کا کھانا دیتیں۔ سارا کام خود کرتی تھیں۔ میرے لیے یہ علاقہ اس لیے بھی دلچسپی کا باعث تھا کہ پاس ہی کی سڑک Belsize Avenue پر دس بارہ سال قبل میرے بڑے بھائی امتیاز حسین خاں مقیم رہ چکے تھے۔ زیرِ زمین ریل Tube کا اسٹیشن سامنے تھا جہاں سے دس منٹ کے اندر یوسٹن پر ریل بدلنے کے بعد آدمی لندن یونیورسٹی کے علاقے میں پہنچ جاتا تھا، جہاں اسکول واقع تھا۔

سوئس کاٹیج میں چند ماہ سے زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکا۔ کچھ عرصے کے بعد مکھن کے معاملہ پر سوئس لینڈ لیڈی سے میرا اختلاف ہو گیا۔ جنگ عظیم دوم کو ختم ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہو چکا تھا لیکن انگلستان میں مکھن اور انڈے جیسی روزانہ کی اشیائے ضرورت راشن سے ملتی تھیں۔ لینڈ لیڈی ہمارے راشن کارڈ پر سارا راشن لے لیتی اور ہمیں اس قدر بھی نہیں دیتی کہ کسی وقت ہم اپنی پسند کی کوئی چیز پکا سکیں۔ اس کے کرایہ داروں میں میرے علاوہ پاکستان کے بھی تین نوجوان تھے۔ انھوں نے تحریک اٹھائی اور مجھے اگوا

بنادیا۔ میں نے کمرہ چھوڑ دینے کی دھمکی دی۔ یں دھمکی میں کام آگیا اور وہ اپنے مقام پر رہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک صاحب کی (جن کا اصل تعلق لکھنؤ سے تھا) میرے کمرے پر پر نظر تھی۔

وہاں سے میں نکلا تو Nottingham Place پہنچا۔ یہ مقام مادام چپّاد کے موموں کے مجموں کے میوزیم کے قریب تھا۔ لندن کا یہ میوزیم بھی عجیب وغریب جگہ ہے۔ ہر ملک وقوم کے مشاہیر کے موم میں ڈھلے ہوئے مجسمے یہاں نصب ہیں۔ ان میں بعض تو اس قدر حقیقی معلوم ہوتے ہیں کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ ناٹنگم پلیس کی قیام گاہ لندن یونیورسٹی سے زیادہ قریب تھی لیکن یہاں میرا قیام بہت مختصر رہا۔ گرما کی تعطیلات میں پیرس چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر وہاں دوبارہ جانے کے انتظامات میں لگا رہا۔ یہاں میرے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ بنگالی کے اُستاد عبدالحیٔ بھی کچھ عرصہ مقیم رہے۔ وہ بھی السنۂ مشرقیہ کے اسکول میں شعبۂ لسانیات کے طالب علم تھے۔ علم اور حُسن کے درمیان اپنے وقت کو تقسیم کرنے کا ہنر انھیں خوب آتا تھا۔ اسکول سے لسانیات میں ایم۔اے بھی کیا اور ہائڈ پارک کے حُسن رہ گزر سے لطف اندوز بھی ہوئے۔ ڈھاکہ واپس جاکر چالیس برس کی عمر میں اپنی ایک نوجوان طالبہ سے عشق کیا اور جب کامیابی نہیں ہوئی تو ریل سے کٹ کر جان دے دی۔ مجھے ان کی موت کا قلق مہینوں رہا۔

میں نے اسکول آف اورنٹیل اسٹیڈیز کے شعبۂ لسانیات میں داخلہ لیا۔ خیال تھا کہ توضیحی لسانیات کی تربیت حاصل کرنے کے بعد اردو کے کسی پہلو پر تحقیق کروں گا۔ لسانیات کے شعبہ کے سربراہ پروفیسر جان رؤپرٹ فرتھ تھے، جو عرصۂ دراز تک ہندوستان میں رہ چکے تھے۔ دراصل سارا اسکول ایسے اساتذہ سے بھرا ہوا تھا جو ہندوستان کے راندۂ درگاہ تھے اور جن کے ذہن میں ہندوستان کی یادیں تازہ تھیں۔ ۱۹۵۰ء کا انگریز پروفیسر اور آزاد ہندوستان کا طالب علم دونوں بہت سے تحفظاتِ ذہنی رکھتے تھے۔ پروفیسر فرتھ کی اپنے علم میں شہرت تھی اُن کے عام لسانیات کے لکچروں میں بعض اساتذہ تک شرکت کرتے تھے۔ ہندوستان میں طویل عرصہ تک قیام کرنے کے باوجود انھوں نے یہاں کی کسی زبان میں مہارت حاصل نہیں کی تھی، البتہ ہندوستانی اور پنجابی سے بعض اوقات مثالیں دے لیتے تھے۔

ان کا جونیر اسٹاف اس اعتبار سے اور گیا گزرا تھا۔ انھیں میں ۲۵ سالہ مس Evans تھیں (جو بہت بعد کو شادی کر کے Mrs. Whitley بن گئیں) وہ اردو/ہندی سے بالکل ناواقف تھیں۔ لیکن ہندوستانی طلبہ کی ٹیوٹر انچارج تھیں وہ پروفیسر فرتھ کے Prosodic Features کے نظریے کا اردو/ہندی پر بے دریغ اطلاق کرتی تھیں اور ان زبانوں کے اپنے تلفظ کو معیاری تلفظ سمجھ کر اس کی ڈرل کراتی تھیں۔ خاص طور پر اردو کی معکوسی (ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ وغیرہ) یا نفسی آوازوں (بھ۔ پھ۔ تھ۔ وغیرہ) کا جب وہ تلفظ کرتیں تو میرے لبوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی۔ میں ڈرل میں ان کے تلفظ کو قبول کرنے سے انکار کرتا اور خاموش بیٹھا رہتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری یہ حالت ہو کہ ع

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

اس کے برعکس دیگر ہندوستانی طالب علم طوطے کی طرح جو وہ کہلواتیں کہتے رہتے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے عبدالحئی اس میں اپنی بنگالی کا گول مول یا 'شش کاری' تلفظ ملا دیتے تھے جسے سن کر میرے منھ سے کبھی کبھی 'کھی کھی' کی آواز پیدا ہو جاتی۔ مثلاً وہ کہتیں 'چلتا' (دراصل 'چلٹا') کہتیں تو عبدالحئی 'چولتا' کہتے۔ وہ 'سندر' کہتیں تو عبدالحئی 'شُندر' کہتے۔ خود اپنا نام 'عوبدل حوئی' بتاتے اور مس ایونز کو 'مِش ایبون' کہتے۔ چوں کہ انگریزی کے /t/ اور /d/ نہ تو اردو کے /ت/ /د/ کے مساوی ہیں اور نہ /ٹ/ /ڈ/ کے بلکہ ایک درمیانی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے مس ایونز مسلسل انگریزی صوتیات کے مطابق ان کا تلفظ کرتیں اور میرے صحیح تلفظ کو غلط بتاتیں۔ یہاں سے اُن کی مجھ سے ناراضگی کا آغاز ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے پروفیسر فرتھ کے کان بھرنا شروع کیے۔ وہ بھی سوچنے لگے کہ تین سال پہلے کا غلام ہندوستانی اور اس قدر باغی! چنانچہ ان کا بھی رویّہ بدلنے لگا۔ یا تو انھیں میری خیریت دریافت کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ اگر کبھی پیشاب خانے میں مَیں فراغت کے لیے کھڑا ہوں اور وہ بھی مزدوتاً آگئے ہیں' تو عین عالمِ فراغت میں وہ مجھ سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے۔ انھیں کیا معلوم کہ ہندوستانی معاشرے میں یہ حرکت عجیب و غریب سمجھی جاتی ہے۔ وہ بلا تکلف ذات و کائنات کی باتیں کرتے رہتے اور میرا پیشاب خطا ہو جاتا۔

لندن کے قیام کی ایک شام مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں جب لندن پہنچا تو معلوم ہوا افقِ ہند کے سارے گم شدہ ستارے وہاں موجود تھے۔ ان ستاروں نے لاہوری روایت کے مطابق خود کو ایک 'حلقہ' (معروف بہ 'ہلکا') کی شکل میں منظّم کر لیا تھا۔ اس حلقہ کا جلسہ ہر مہینہ کے آخری سنیچر کو کسی نہ کسی رکن کی قیام گاہ پر منعقد ہوتا۔ اس حلقے کی زد سے کسی نووارد کا بچ نکلنا مشکل تھا۔ آپ شاعر ہوں یا متشاعر، ترقی پسند ہوں یا غیر ترقی پسند، وسیع لندن کے اس محدود حلقے میں آپ کسی نہ کسی وسیلے سے ضرور جا پہنچیں گے۔ بھیڑیئے تو وہاں کئی سلسلے تھے: فرنگی محل کے کمیونسٹ انور انصاری اور ان کی بیگم غزالہ انصاری، علی گڑھ کے پرانے گنہگار 'حلقہ، یاراں' کے سردار 'جگت چچا'، صدیق احمد صدیقی اور پھر حلقے کے میر شکار اعجاز حسین بٹالوی، جن سے میری واقفیت اس وقت سے تھی جب وہ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتے تھے۔

شاید جنوری ۵۰ء کا آخری سنیچر تھا۔ حلقہ کا جلسہ لندن کے پُر تکلف 'ویسٹ اینڈ' میں افسانہ نگار غلام عباس کے فلیٹ میں منعقد ہوا۔ صاحبِ خانہ خود اس روز ایک مہمان حلیف کی پذیرائی میں مصروف تھے۔ اس لیئے ان کا ایک قدم اپنے باورچی خانہ تھا تو دوسرا حلقے کی مجلس میں۔ ایک مسلسل دوڑ ادب اور حُسن کے درمیان تھی۔ مجلس کا نقشہ عباس صاحب کی بڑی گول میز کے ارد گرد جما ہوا تھا۔ کوئی کرسی پر تو کوئی فرش پر۔ اگر اتنے میں کوئی خاتون آجاتیں تو کسی نہ کسی کو کرسی خالی کرنی پڑتی۔ احتیاط پسند اسی لیے پہلے سے خاک نشین تھے۔

اس دن کے میرِ مجلس حفیظ جاوید تھے۔ اُن کے داہنے ہاتھ پر اعجاز بٹالوی، سکریٹری حلقہ، مسلسل گلُ افشانیٔ گفتار پر آمادہ نظر آرہے تھے۔ یہ آمادگی خواتین کی تعداد اور نسبت سے تپش آمادہ تر ہوجاتی جارہی تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے میں ایک حلقہ گیر جماہی کے ساتھ جنابِ صدر نے جلسہ شروع کرنے کا اعلان کیا۔ سکریٹری نے پچھلے جلسے کی رپورٹ سنائی اور کہا آج کی خاص چیزیں دو نظمیں ہیں جو منیب الرحمٰن اور مسعود حسین سنائیں گے۔ قرعہ میرے نام پڑا۔ نظم آزاد تھی، عنوان تھا 'انتظار'۔

یہاں پر حلقہ کی بعض روایات کا ذکر دینا بے محل نہیں ہوگا۔ حلقہ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسے 'انجمنِ ستائشِ باہمی' قسم کی چیز نہ بننے دیا جائے۔ اس میں ہر قسم اور دبستان

کی چیز پڑھنے کا مجاز تھا لیکن تنقید بےلاگ ہو گی۔ کتنے کو بےلاگی۔ فاصلہ، بے تعلقی اس کی تنقید کے محور تھے لیکن حقیقت یہ بھی کہ جس طرح سنگم پر کھڑے ہو کر آپ گنگا اور جمنا کے دھاروں کا رنگ فوراً پہچان لیتے ہیں اسی طرح حلقہ بھی دو دائروں میں تقسیم تھا۔ مارکسی اور غیر مارکسی۔ مارکسی نقادوں کی قیادت انور انصاری اور منیب الرحمن کر رہے تھے، ایک عقل سے دوسرا جذبات سے۔ ان کے ساتھ ایک کارواں تھا اور پھر گردِ کارواں۔ دوسرا ایمہ اعجاز بٹالوی اور غلام عباس کا تھا جن میں سے ایک غنیم کی کاٹ مسلسل گفتار سے کرتا اور دوسرا ڈھیٹ خاموشی سے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ایسے بھی تھے جو اِدھر بھی تھے اور اُدھر بھی۔ چچا صدیق تھے جن کے متعلق مارکسیوں کا اصرار تھا کہ وہ ہمارے ہیں لیکن ان کی شگفتہ مزاجی خندہ ہائے گل کو بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ کچھ رندِ حلقہ تھے کچھ صوفی اور بیشتر نقش و نگار اخود مارکسی ادیبوں کے مختلف گریڈ تھے، کچھ کیمونسٹ مُلّا، کچھ مجاہد، اور کچھ عارف، اعجاز کی زندہ دلی پر حلقہ کا توازن قائم تھا۔

خیر جلسے کا آغاز میری آزاد نظم "انتظار" سے ہوا:

تھکی تھکی سی یہ شاہیں سوادِ مغرب کی
میں دور ؛ ہوں —
کہ اِن کی سحر نہیں معلوم!
ہجوم لالہ و گل
(داغ ہائے دل کہ نہ پوچھ!)
لبوں پہ چھیڑ کا ہوا ہر طرف یہ خونِ گلاب
شباب، آتشِ لب، چشمِ نیلگوں کا فسوں
یہ بوسہ ہائے دراز!
وہ حسنِ رفتہ کو سو سو جتن سے رنگِ قیام
یہ بے قرار نگاہیں، یہ جاگتے سائے
وفا بھی شرما جائے

نظم کا پہلا بند ختم ہوا تو میں نے حاضرین پر نگاہ ڈالی۔ منیب الرحمن کی نظریں کھوئی ہوئی سی پائیں۔ معلوم نہیں لبوں کی محرابوں کے پار کیا دیکھ رہے تھے۔ انور انصاری سماجی شعور کی قید و بند کی 'خونِ گلاب' کی ترکیب سے آسان گزر کر 'آتشِ لب' میں کھوئے ہوئے تھے۔ اعجاز بٹالوی 'ہجومِ لالہ و گل میں بو سہائے دراز' کی جانب سے داخل ہونے کی کوشش میں معروف تھے۔ چچا صدیق وجد میں تھے اور علام عباس کے ہونٹوں پر وہی خاموش تبسّم۔

نظم آگے بڑھی:

اِنھیں غرض ترے مشرق کی سرزمینوں میں
وہ سر پہ برسوں سے آنچل کو اپنے ڈالے ہوئے
ہے انتظار میں کس کے؟ — کوئی نہیں آتا
وہ انتظار، جو مغرب کے فن نے پیدا کیا
کبھی کبھی بُتِ سنگین میں یا لکیروں میں!
وہ انتظار، جو آنکھوں، لبوں نے، باہوں نے
کیا تھا، آئیں گے — لیکن کوئی نہیں آتا
وہ انتظار، جو بیگانۂ وفا نہ ہوا

کھلی ہوئی ہیں وہ آنکھیں —
کہ تھک چکی ہے نظر
مگر وہ شام و سحر مشعلیں جلائے ہوئے
تکا کریں یوں ہی محرابِ روز و شب کے پار
کہ وقت شرما جائے!

نظم کے خاتمے پر میری نظر نے پھر اہلِ حلقہ کا جائزہ لیا۔ آنکھوں میں تنقید کی الجھی ہوئی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، لیکن حملہ آور ہونا ضروری تھا۔ دفعتہً انور انصاری نے محسوس کیا ہے کہ شاعر 'انحراف' کر گیا ہے۔ اعجاز بٹالوی کا تخیل انتظار اور وفا کے

دائروں میں گھومتا ہوا محرابِ ابرو ولب کے پار جھانکنے لگا۔ وہ داد پر مصر تھے۔

تنقید کی ابہامی فضا کو صدرِ جلسہ نے ایک جماہی کے ساتھ یہ کہہ کر توڑا "اب مسعود صاحب کی نظم کے بارے میں کوئی صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہیں ...... ہر طرف خاموشی دیکھ کر ....

"اچھا تو میں خود تنقید شروع کرتا ہوں"۔

لیجئے صاحب تنقید شروع ہو گئی۔

میری اور حلقہ دونوں کی شومئی قسمت حفیظ جاوید اس روز پرائے بس میں تھے۔ آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ ایسے میں وہ تنقید کی آڑ میں کیا کچھ نہ کہہ گئے ہوں گے۔ میں کچھ دیر اُلجھا۔ ان کے فنی اعتراضات کا جواب میر و غالب کے حوالے سے دینا چاہا۔ لیکن جب میر و غالب پر بھی برسنے لگے تو خاموش ہو گیا۔ میں پوچھتا رہا کہ حضرات! میری نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟ جواب ملا اس میں سماجی اقدار معدوم ہیں۔ زبان کے استعمال میں جدلیاتی حقیقت پسندی کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے وہ تو معاملہ زلفِ دراز کا سا طول پکڑتا کہ میں نے خواتین کے قیمتی وقت اور ان کی دیگر مشغولیت کا حوالہ دیا تب کہیں جا کر گلو خلاصی ہوئی۔

اس کے بعد افسانے بھی ہوئے اور نظمیں بھی۔ داد بھی ملی اور بیداد بھی ہوئی۔ مگر میں مسلسل سوچتا رہا کہ اہلِ سخن کے بجائے کبھی کبھی سخن فہموں کی بھی آزمائش ہونی چاہیئے جسے دیکھئے نقد و بصر کا کانٹا لیئے پھرتا ہے۔ مانگے تانگے کے کچھ باٹ ہیں، دھرے اور تول دیا۔

انھیں خیالات میں غلطاں و پیچاں بارہ بجے رات کو اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹا۔

اگلے مہینے کے آخری سنیچر کی شام کو حلقہ کا پھر جلسہ ہوا۔ وہی غلام عباس کا فلیٹ، کم و بیش وہی حاضرین۔ جلسہ شروع ہونے ہی والا تھا کہ میں نے انور انصاری سے کان میں چپکے سے کہا "آپ کو معلوم ہے آج کل میں برٹش میوزیم میں کام کر رہا ہوں، وہاں غالب کی ایک غیر مطبوعہ نادر غزل ہاتھ لگی ہے اگر صدر صاحب اجازت دیں تو اسے بھی آج کے پروگرام میں شامل کر لیا جائے"۔ انور انصاری نے بڑھ کر بات اعجاز بٹالوی کے کانوں تک پہنچائی وہ منکرِ غالب، کیوں کر ہو سکتے تھے، خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور میری اس دریافت کا اعلان کیا۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے مانگ تھی "غالب کی غزل، بھئی غالب کی غزل پہلے ہونی چاہیئے"۔ منیب الرحمن

کے عادتاً مضمحل چہرے پر اس وقت ایسی مسرت کی لہر تھی گویا نایاب دفینہ مل گیا ہو۔ میں نے جیب سے کاغذ نکالا، ناک پر عینک درست کی اور کہا "حضرت غالب کی اس غیر مطبوعہ غزل کا تعلق میرے خیال میں اُن کے ابتدائی دور کی شاعری سے ہے جب "خامۂ بیدل" اُن کا رہبر تھا۔ آپ سب سخن فہم ہیں، بیچئے اسداللہ خاں کے تیور دیکھئے۔ اس کے بعد ترنم سے یہ اشعار پڑھے:

تیری افسردہ دلی بادۂ خوش رنگِ خمار
میری افسردہ دلی داغِ سویدائے بہار

جنسِ بازارِ محبت کہ ہے وصلِ زنگار
عرضِ خمیازۂ ایجاز کہ نقشِ دیوار

زندگی گرسنہ و کوہکن و تیشہ بدوش
صحن صحرا چمنِ شوق کو احرامِ بہار

جادۂ غم نگۂ کم ہے کہ جز بیش نہیں
قیمتِ شورشِ پیہم بھی نہیں زخمۂ تار

کتنا اندوہ رُبا ہے یہ ربابِ ہستی
کس قدر عربدہ جو ہے نگہِ موجِ غبار

طلبِ ناز کہ ہے مستیٔ بیدار سے دنگ
رنگِ ہستی طلبِ شوق سے کتنا بیزار

کفِ گردوں میں اگر جامِ زمرّد نہ ہوا
حسرتِ دل میں بھی ممکن نہیں عالم کا فشار

ہم محبت کو ترا نقشِ قدم عرضِ نیاز
ہم حقیقت کو تری بندشِ غم زخمۂ تار

دیدہ و دل غمِ ہستی سے اسد بے معنی
فیضِ معنی سے محبت ہوئی حرفِ اغیار

مطلع پر مکمل سکوت تھا۔ یہ کسی معمولی شاعر کا نہیں غالب کا کلام تھا۔ دوسرے شعر پر گردنیں ہلیں۔ بھلا غالب بغیر داد کے کیوں کر بچتے۔ سب سے پہلے حسبِ عادت، اعجاز بٹالوی نے لب کشائی کی، "سبحان اللہ!" اور جب میں دوسرے شعر پر تھا تو چیخ کر کہا واہ! واہ! "داغِ سویدائے بہار" ان کی آوازِ تحسین ابھی گونج ہی رہی تھی کہ انور انصاری نے پھڑک کر یہ مصرع اٹھایا ؎

زندگی گرسنہ دکوہ کن و تیشہ بدوش!

اور پھر یہ نہ سوچا کر ؎

صحن صحرا چمن شوق کو احرامِ بہار!

صدر مجلس حفیظ جاوید بھی جو آج اپنے لَس میں تھے، ہر شعر پر پھڑک کر داد دے رہے تھے۔ تنقیدی تخیل بغیر آسمان کے پرواز کر رہا تھا، طلبِ ناز، "مستیٔ بیدار، اور "کفِ گردوں" بن اور بگڑ رہے تھے۔ گرسنہ زندگی کی تیشہ بدوشی تنقید کی جدلیاتی راہوں کو کھول رہی تھی۔ تنقید کا بحران اس وقت آیا جب چچا صدیق نے نہایت نے تول کر تحسینی انداز میں کہا "وہی نقش فریادی والا رنگ ہے" ابھی تنقید داد اور بیداد کی فضا میں سانس ہی لے رہی تھی کہ میں مقطع کی سخن گسترانہ بات تک پہنچا اور بے تحاشا ہنس پڑا۔

چچا صدیق فوراً بھانپ گئے کہنے لگے میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ "نقش فریادی" والا رنگ ہے۔ لیکن ان کا یہ جملہ تحسین کا نہیں اعتراف کا تھا۔ ایک صاحب جو پچھلے ماہ کے جلسے میں موجود نہیں تھے یہ کہتے ہوئے سُنے گئے "مسعود صاحب! آخر ہم لوگوں نے کیا قصور کیا ہے"؟ لیکن اعجاز بٹالوی مُصر تھے کہ یہ غزل غالب کی ہو نہ ہو اس کے بعض اشعار میں "گنجینۂ معنی کا طلسم" موجود ہے۔ "واللہ مسعود صاحب! اسے اپنی بیاض میں ضرور رکھیئے گا"

میں نے کہا: "میں اپنی بیاض میں رکھوں یا نہ رکھوں آپ اسے حلقے کی روداد میں ضرور رکھیے گا۔"

۵۲ء میں یورپ سے واپس آکر میں نے اس واقعہ پر "لندن کی ایک شام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو علی گڑھ میگزین کے طنز و ظرافت نمبر (۵۳ء) میں شائع ہوا۔

اعجاز بٹالوی نے بھی اس مہملات کو حلقہ کی رپورٹ میں محفوظ کر لیا اور لندن سے واپسی پر معاصر (لاہور) میں لندن کے حلقۂ ارباب ذوق کا ذکر کرتے ہوئے اس کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

مس ایونز کی شکایات آخر کار رنگ لائیں۔ پروفیسر فرتھ نے ایک دن بلا کر مجھ سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے، مس ایونز آپ کے رویّے سے مطمئن نہیں ہیں۔ میں نے کہا میں ان کے طریقۂ تعلیم سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں خود یونیورسٹی میں اردو کا استاد ہوں، تاریخی رجحانات پر تحقیق کر چکا ہوں اس لیے میں بے معنی صوتی مشقوں میں (جو میرے نزدیک مشتبہ بھی ہیں) اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں یہاں مزید تحقیق کے لیے آیا ہوں، صوتیاتی ڈرل کے لیے نہیں۔ فوراً فرتھ کے اندر کا سویا ہوا انگریز جاگ اٹھا۔ نہایت بے رخی کے ساتھ بولے۔ "آپ ہندوستان میں کچھ بھی ہوں، یہاں داخلہ لیا ہے تو ہمارے طریق کار کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ آخر کار عبدالحئی بھی تو ڈھاکہ یونیورسٹی میں بنگالی کے استاد ہیں وہ کیوں نہایت خوش دلی کے ساتھ حصّہ لیتے ہیں۔" میں نے کہا "ان کی مادری زبان بنگالی ہے ممکن ہے ہندوستانی زبان کی ڈرل سے کچھ فائدہ اٹھالیں، میرے لیے تو یہ تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں"!

مجھے اسی روز اندازہ ہو گیا کہ اب یہاں دال نہیں گلے گی۔ لسانیات کے شعبے میں ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں صرف فرتھ تحقیق کرا سکتے تھے اور وہ صدر شعبہ کی حیثیت سے انتظامی کاموں میں بہت مصروف رہتے۔ اس سے جو وقت بچتا تو اپنے صوتیاتی نظریے کی قطع و برید میں مصروف رہتے جس سے انھیں علمی حلقوں میں شہرت ملی تھی۔ میری خواہش دراصل یہی تھی کہ اس نظریے کا اردو کے بعض صوتیاتی پہلوؤں پر اطلاق کروں اس پر میں نے انھیں طویل مضمون لکھ کر دکھایا تھا جس سے وہ بہت مطمئن تھے۔ کہنے لگے اس سے قبل صرف ڈاکٹر دشوناتھ پرساد نے بھوجپوری پر میرے نظریے کو آزمایا ہے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ لیکن میری ساری ریاضت دھری رہ گئی اور "مس خام" بازی لے گئیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب یہاں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔

گرما کی تعطیلات میں چند ساتھیوں کے ساتھ پیرس گھومنے گیا۔ گھومنے کیا ٹٹولنے گیا کہ وہاں لسانیاتی تحقیق کے سلسلے میں کیا سہولتیں مل سکتی ہیں۔ وہاں کالج دُ فرانس میں مشہور مستشرق اور میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے استاد لوئی ماسیوں Louis Massignon درس دیتے تھے۔ پاس میں صوتیات کا ادارہ Institute de Phonetique واقع تھا جس کے ڈائرکٹر پروفیسر پیئر فواشے تھے۔ میں نے دونوں حضرات سے رابطہ قائم کیا اور ان کی جانب سے ہمت افزائی پاکر پیرس منتقل ہوجانے کا منصوبہ بنالیا۔ چنانچہ داخلے کے فارم اسی وقت بھر دیئے اور فرانسیسی سیکھنے کے لیے Alliance Francaise میں نام درج کرالیا۔ اس طرح تعطیلات کو بامقصد بنالیا۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں مَیں باقاعدہ طور پر پیرس منتقل ہوگیا جہاں میری خوش قسمتی سے سیٹے یونیورسیتیر Cité Universitaire (شہر جامعہ) کے مرکزی ہوسٹل Maison Internationale (بین الاقوامی دارالاقامہ) میں مجھے سنگل سیٹ کا کمرہ مل گیا۔

پیرس میں میرے سامنے اب دو محاذ تھے ایک تحقیقی اور دوسرا فرانسیسی زبان میں مہارت حاصل کرنے کا۔ دن بھر سوربون، لانگ زوٗ (السنہ مشرقیہ کا اسکول) اور ببلوتیک نیسو نال (نیشنل لائبریری) میں گذرتا اور شام میں ایل یانس فرانسیز Alliance Francaise میں جہاں دو گھنٹوں میں فرانسیسی زبان کی پڑھائی ہوتی تھی مجھے فرانسیسی کا پڑھنا اور لسانیات پر فرانسیسی میں لکھی ہوئی کتابوں سے استفادہ کرنا بہت جلد آگیا۔ اس لیے کہ انگریزی اور فرانسیسی کی علمی اور اصطلاحی زبان میں حد درجہ یکسانی پائی جاتی ہے لیکن ابھی دوسری سطحات تحریری اور تکلمی پر بہت کام کرنے کی ضرورت تھی۔ لانگ زوٗ میں میری ملاقات دو فرانسیسی طالب علموں سے ہوئی، موسیو اُردُواں اور مادام ببلیان نَدرو۔ ایک ہندی سیکھ رہا تھا اور دوسری اردو دونوں سے باہم دگر تبادلہ کا پروگرام بن گیا۔ اس طرح میری فرانسیسی بولنے کی مہارت تیزی سے بڑھنے لگی۔ فرانسیسی زبان کے املا اور تلفظ میں زمین آسمان کا فرق ہے اس کے لیے قدم قدم پر اہل زبان کی رہبری کی ضرورت بڑی ہے لکھا جاتا ہے 'پیرس' پڑھا جاتا ہے 'پاری'، لکھتے ہیں 'ورسیلز' بولتے ہیں 'ورسائی'۔ میں ان دونوں کا ممنون ہوں کہ ان سے لین دین میں فائدہ میرا زیادہ ہوا۔ مادام ببلیان نَدرو جو بہت اچھی انگریزی بھی جانتی تھیں اور ان کے شوہر نَدرو، جن کا تعلق ماریشس سے تھا

اور جو مسلمان تھے، صحافی تھے، وہ بھی فرانسیسی اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ان دونوں کی مدد سے میرے مقالے کی زبان کی نوک پلک درست کرنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ میں نے انھیں اس کا معاوضہ بھی دیا لیکن اس سلسلے میں ان لوگوں نے جو محنت کی وہ معاوضے سے کہیں زیادہ تھی۔ خود مجھ سے مادام نذرو نے اردو کے سلسلے میں استفادہ کیا کہ موسیو نذرو کے انتقال کے بعد وہ ایک وظیفہ پر کراچی یونیورسٹی آئیں اور گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیاتِ ہندی و ہندستانی کا اردو میں ترجمہ کر کے اور اس پر حواشی لکھ کر وہاں سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کام کے لیے ان کے نگراں پروفیسر ابو اللیث صدیقی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری تھے۔ اتفاق سے یہ مقالہ جانچنے کے لیے علی گڑھ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو بھیجا گیا، جو گارساں دتاسی کے خطبات کے مترجم تھے۔ چوں کہ وہ اس زمانے میں پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی کے انتظامی امور میں بہت مصروف رہتے تھے، اس لیے انھوں نے مقالے کو میرے سپرد کیا۔ میں نے اس ذمہ داری کو بہ خوشی قبول کیا۔ شاید مادام نذرو کو (جنھوں نے اب کناڈا کے ایک فرانسیسی سے شادی کر لی ہے) یہ معلوم بھی نہ ہو کہ ان کا پیرس کا علمی قرض میں نے اس طرح ادا کر دیا۔ لیکن اس میں کوئی طرفداری کا پہلو نہیں رہا۔ وہ مقالہ واقعی اس قابل ہے کہ شائع کیا جائے۔ دو سال قبل جب میں کراچی گیا تھا تو فرمان فتح پوری سے اس کا تذکرہ آیا۔ معلوم ہوا کہ اس وقت مادام نذرو اپنے فرانسیسی شوہر (؟) کے ساتھ جنوبی کوریا کے شہر سیول میں مقیم ہیں، جہاں ان کے شوہر کناڈا کے سفارت خانے میں کام کر رہے ہیں۔

موسیو اَردواں بھی فرانس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد واردِ ہند ہوئے۔ پہلے کیرالہ میں قیام کیا۔ وہاں انھوں نے ایک ملیالی لڑکی سے شادی کی۔ بعد کو فرانسیسی کے اُستاد کی حیثیت سے اُن کا دہلی یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا، جہاں کچھ عرصے پہلے وہ اپنی بیوی اور بچّی کے ساتھ مقیم تھے۔ ایک بار علی گڑھ آ کر میرے یہاں چند روز قیام بھی کیا۔ انھوں نے ہندی میں وہ کمال حاصل نہیں کیا جو مادام نذرو نے اردو میں کیا۔

کئی سال کی محنتِ شاقّہ کے بعد مجھے بالآخر فروری ۱۹۵۳ء، جو Doctorat d' Université سے (جسے عام طور پر اردو میں ڈی لٹ لکھا جاتا ہے) نوازا گیا اور میرا مجموعی نتیجہ

(Très Honorable) (نہایت معزز) رہا۔ پروفیسر لوئی ماسیوں، پروفیسر فوشے اور پروفیسر سوریو نے میرا زبانی امتحان لیا۔ فرانس میں زبانی امتحان کے لیۓ صلائے عام ہوتی ہے۔ سوریو جمالیات کے پروفیسر تھے اور ان کے ساتھ میں نے ایک ضمنی پرچہ Question Suppiemantaire تیار کیا تھا، جس کا عنوان تھا "شعر کے تخلیقی عمل میں قوتِ ارادی کا حصّہ"۔ یہ جمالیات سے متعلق ہے۔ پیرس یونیورسٹی میں تحقیق کے خاص موضوع کے علاوہ متجانس علوم میں دو مختصر رسالے بھی تیار کرائے جاتے ہیں تاکہ طالب علم کی نظر میں وسعت رہے۔ اسے 'ضمیمہ کا سوال' کہا جاتا ہے۔

میرا پیرس کا قیام کئی اعتبار سے سود مند رہا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ فرانس کی روایتی آزاد فضا میں آزاد ہندوستان کے طالب علم کو وہ گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی جس کا احساس اِس زمانے میں انگلستان کی یونیورسٹیوں میں قدم قدم پر ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آقا اور غلام کے نئے رشتے استوار ہونے کے لیۓ کم ازکم ایک نسل کی مدت چاہیئے اور میں انگلستان آزادی ملنے کے تیسرے سال چلا گیا تھا۔ ممکن ہے اس میں میرے ذہن کی بھی کوتاہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کے علاوہ اگر میں آکسفورڈ یا کیمبرج میں ہوتا تو یہ صورت پیش نہیں آتی۔ لیکن اسکول ایسے راندۂ درگاہ انگریزوں سے بھرا پڑا تھا، جو حاکم بن کر ہندوستان میں رہے، کوئی زبان نہیں سیکھی اور انگلستان جاکر السنۂ مشرقیہ کے ماہر بن بیٹھے۔ میرے جذبات کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک بار کسی کام سے میں پاکستانی سفارت خانے گیا۔ وہاں دیکھا کہ لفٹ کو اوپر لے جانے پر ایک سفید چمڑی والا مامور ہے۔ اپنا کام ختم کرکے جب لوٹا تو اس وقت بھی وہ موجود تھا۔ مجھے نیچے لے جاکر اس نے لفٹ کا چارج دوسرے شخص کو دے دیا۔ اب اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی۔ سفارت خانے سے ہم دونوں نکل کر زمین دوز ریل (ٹیوب) کے اسٹیشن کی جانب چلے۔ راستے میں وہ ہم کلام ہوا تو میں نے بھی دریافت کیا، حضرت آپ یہاں کیسے؟ وہ خاصی روانی کے ساتھ انگریزی لہجے میں اردو بول لیتا تھا۔ کہنے لگا کیا کرے جب سے ہندوستان سے آیا ہے سب مزہ بھول گیا، ہم یہ کرتا ہے اور ہمارا بیوی بڑا اوگ کے فلیٹ کا فرش رگڑتا ہے"۔ اس کے بعد اس نے اپنی بیگم کی محنتِ شاقہ

کا ذکر کرتے ہوئے ایک ایسا محاورہ استعمال کیا جو نا گفتنی ہے اور میں کہتا ہوا ٹوب میں چڑھ گیا کہ یہ بات تم اپنے لیئے کہہ سکتے ہو اپنی میڈم کے لیئے مت بولا کرو۔

اسی طرح ایک اور واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب میں ۱۹۵۱ء میں پہلی بار انگلستان سے فرانس گیا تو ریل میں اپنے ساتھ ایک انگریز کو بیٹھا ہوا پایا۔ پہلے تو اُس نے اِس ڈینٹو، کو اِس لائق نہیں سمجھا کہ ہم کلامی کا شرف بخشے۔ لیکن جب سفر اور سکوت کی اکتاہٹ زیادہ بڑھی تو اس نے مختصر سوالوں میں گفتگو شروع کر دی۔ مجھے انگریزوں کے دکھڑ سکوت، کو توڑنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ ایک دفعہ جب اُس کو اِس لحاظ سے زچ کر لیتا ہوں تو پھر بے تکلف گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیتا ہوں۔ چنانچہ یہی اُس وقت ہوا۔ تھوڑی دیر کی بات چیت میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ اس خطۂ ارضی سے بخوبی واقف ہے جہاں سے میرا تعلق ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ۱۹۴۷ء سے قبل یو۔پی۔ کے فلاں گورنر سے اس کی قرابت داری رہی ہے اور اُس کے توسط سے وہ اس صوبے کے بیشتر زمینداروں اور جاگیرداروں کے ساتھ ترائی کے جنگلوں میں شیر کا شکار کھیل چکا ہے۔ اُس نے خاص طور پر نواب صاحب باعنیت اور یو پی کے کئی اور بڑے جاگیرداروں کے نام لیئے۔

تھوڑی دیر میں پیرس کا ریلوے اسٹیشن آگیا۔ میں قلی کی تلاش میں ڈبے کے باہر کھڑا ہوا تھا کہ وہ صاحب بہادر، لاٹ صاحب کے عزیز شیر افگن اپنے دونوں ہاتھوں میں دو بڑے بڑے سوٹ کیس لٹکائے ہانپتے کانپتے لپکتے جا رہے تھے!

ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پیرس کی فضا لندن سے بالکل مختلف تھی۔ وہاں حاکم و محکوم کی کوئی یادیں درمیان میں نہیں تھیں۔ یوں بھی فرانسیسی بنیادی طور پر بیروں بیں قوم ہے اور انگریزوں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ یہ جھینپو، ہوتے ہیں اور اپنے بودے پن کو چھپانے کے لیئے دبے رہتے ہیں۔ اُن کی کم سخنی اور دیر آشنائی کا یہی راز ہے۔ فرانس میں رنگ و نسل کا امتیاز بھی کم ملا۔ میں نے یہاں بارہا کالوں کے بازوؤں پر حسین فرانسیسی دوشیزاؤں کو لٹکے دیکھا۔ اپنے ہاسٹل میں ایک گورے اور کالے کے درمیان برابر کی مکا بازی دیکھی۔ رنگ روپ کے اعتبار سے میرا شمار درمیانی زمرے میں تھا لیکن بیشتر فرانسیسی مجھے اطالوی ہسپانوی یا ترک سمجھتے تھے۔ اس لیئے رنگ و نسل کے تعصب سے مجھے کبھی دوچار نہیں ہونا پڑا۔ اور

اس لحاظ سے میں فرانسیسی سماج کے ہر طبقے میں اچھی طرح گھل مل جاتا تھا۔ البتہ زبان کے روز مرّے کی نزاکتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی شرمندگی اٹھانا پڑتی تھی خاص طور پر جب لغزشِ زبان سے فرانسیسی میں "میں سونا چاہتا ہوں" کے بجائے "میں ساتھ سونا چاہتا ہوں" نکل جائے۔ ان کے لاطینی مزاج میں وہی گرم اختلاطی پائی جس کا اقبال نے اسپین میں مشاہدہ کیا تھا اور اپنی نظم مسجدِ قرطبہ میں ذکر کیا ہے۔

پیرس کو جس قدر انسان نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے حسین بنایا ہے فطرت نے بھی بُخل سے کام نہیں لیا ہے۔ پیرس میں میرا پہلا سابقہ وہاں کی خزاں سے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں پڑا تو کشمیر کی خزاں یاد آ گئی:

سونا اُگل دیا ہے فرنگی خزاں نے آج

شرما دیا بہار کو زخمِ نہاں نے آج

بادِ سحر میں بڑھ گئیں کچھ سرد مہریاں

کیا بے رخی دکھائی ہے آبِ رواں نے آج

برگِ خزاں سے پوچھئے بخشا ہے کس نے رنگ

تیری حنا نے یا میرے خونِ جواں نے آج

مسعود اعتبارِ بہاراں بڑھا دیا

رنگینیٔ زوال و غمِ جاوداں نے آج

(پیرس ۱۹۵۱ء)

قیامِ یورپ کا اثر ہندوستانیوں پر مختلف انداز میں مرتب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی خودنوشت "یادوں کی دنیا" میں اس کا ذکر نہایت مثبت انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مجھے تولون میں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ بڑے بڑے جنگی جہاز نہ تھے بلکہ نسوانی حُسن تھا۔ میں نے ایسا باغ و بہارِ حسن اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔۔۔ رنگ گورا، آنکھیں اور بال سیاہ، قد بوٹا سا۔۔۔ چال کا انداز، بقول داغ

ٹھہر گئے وہ جہاں سروِ باغ تھے گویا
اگر چلے تو نسیمِ بہار ہو کے چلے "

تولون کے قہوہ خانے میں بیٹھ کر جب میں فطرت اور انسان کے حسن کا مشاہدہ کر رہا تھا تو معاً مجھے غالب کی گُل والی غزل یاد آئی:

تیرے ہی جلوے کا ہے وہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل "

خود میرے تاثرات بھی کچھ اسی قسم کے تھے، لندن میں نہیں بلکہ فرانس پہنچ کر۔ لندن میں تو میں مغربی تہذیب کا ناقد ہی رہا جیسا کہ میری نظم 'انتظار' سے ظاہر ہے جو میں نے نومبر ۵۰ء میں لکھی تھی، جس کا تذکرہ اس سے قبل آچکا ہے۔

پیرس کے ایک سال کے قیام کے اندر وہ حادثہ پیش آیا جس نے میرا قبلہ مغرب سے موڑ کر مشرق کی طرف کر دیا۔ "انتظار" کے ٹھیک ایک سال بعد (نومبر ۵۱ء) پیرس میں میں نے نظم "مری زمین ہے بہتر کہ آسماں بہتر"، لکھی جو خود تشریحی حیثیت کی مالک ہے:

چلی گئی وہ اُمیدوں کے قافلے لے کر
مرے خیال کو دھندلا سا دے کر اک پیکر
یہ آسماں پہ گُہر اور زمین پہ پتھّر
یہ سوچتا ہوا شاعر، یہ سوچتا منظر
کوئی بہار سے پوچھے، بہار میں کیا ہے
وہ کہہ گئی تھی کہ آئے گی پھر، نہ آئی مگر
دلوں میں چھوڑ کر انگڑائیاں ادھوری سی
کدھر گئی ہیں وہ بانہیں، وہ لب، وہ زلف کدھر!
ہوا یہ اُس کی محبت میں اجنبی احساس
کسی کی زلف بلا بن کے آئی اپنے سر

پتہ نہ تھا کہ حقیقت یہاں فسانہ ہے

خبر نہ تھی کہ محبت یہاں ہے راہ گذر

ہر آستاں سے پھرا ہے اپنا کاسۂ چشم

مرا جنوں مجھے لاتا ہے پھر ترے در پر

قبول کر کہ مجھے دے کر ستارۂ مژگاں

ترے گہر کے سوا سب گہر نجوم سحر

مہ و ستارہ ہیں میری زمیں سے دور بہت

کنار خاک میں ملتا نہیں انھیں محور

مہ و نجوم کا عالم مجھے عزیز کہ تو

مری زمین ہے بہتر کہ آسماں بہتر؟

قیام یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کے لیے تنہائی کا احساس ایک مشترک تجربہ ہے جو وہاں کے 'بتانِ خود آرا' کے ہجوم اور 'بادہ ہائے ناب گوارا' کی لذّتوں کے باوجود کم نہیں ہوتا۔ میں اسے کچھ زیادہ ہی شدّت کے ساتھ محسوس کرتا تھا۔ میرے لیے یہ احساس لندن کی گھٹی فضا ہو کہ پیرس کا آزاد ماحول، ہر جگہ یکساں رہا۔ اسی لیے میری اس دور کی نظمیں اور غزلیں میری سب سے اچھی خود نوشت ہیں۔ نظموں کے نمونے دیکھ چلے۔ اب چند غزلوں کے اشعار سنیے۔

لندن ۱۹۵۱ء کی ایک غزل:

مری غزل ترا صدقہ، مری نوا ترا غم

یہ صوت حرف بنے اور توڑ دوں میں قلم

ترا خیال، تری یاد، میرا فن، مرا شوق

ہنر کا باقی رہے کوئی بھی نہ پیچ و خم

وہ انتظار کہ آنکھوں نے آہٹیں سن لیں

وہ دھڑکنیں ہیں کہ ہوتی نہیں کبھی مدّھم

تری وفا کے تصور سے کانپ اٹھا ہوں
برے جنوں میں یہ انداز ہیں مگر کم کم
گلوں میں غنچوں میں، تاروں میں ڈھونڈتا ہی رہا
مگر وہ آنکھ جو ہر دم کسی کے غم میں تھی نم!
جنوں نے بخیہ گری آج بھی نہیں سیکھی
تری مژہ کا تصور مگر رہا پیہم
ہجومِ لالہ و گل اور یہ بے شمار خطوط
ہزار نقش ملے پر نہ مل سکا آدم
کدھر ہے تو مرے مشرق، اے مرے مشرق!
عزیز جامِ سفالیں ترا، تری شبنم

انتظار، دوری، تنہائی، وفا اس دور کی شاعری کے کلیدی لفظ ہیں جو اس زمانے کی ذہنی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں:

خیالِ دوریٔ جاناں سے آنکھ بھر آئی
خبر نہیں کہ محبت نے کیا قسم کھائی (لندن اکتوبر ۱۹۵۰ء)

آپ دامانِ صبا باندھتے ہیں
کس سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں
کتنے پرکار ہیں خوبانِ فرنگ
دل کو زلفوں سے سوا باندھتے ہیں (لندن، مارچ ۱۹۵۱ء)

مغرب کی فضا میں 'پیمانِ وفا' کی تلاش عبث ہے اس لیے کہ ؎

نہ بام و در نہ فضائیں نہ آسماں ہم راز
مری نوا کو مگر اجنبی دیار ملا

خیالِ دامنِ اُلفت کہاں، کہاں مسعود
وہ نارسا ہی رہا اور شرمسار ملا (پیرس ۱۹۵۱)

اس نارسائی کے باوجود میں مغربی تمدن کا ان معنوں میں نقاد نہیں رہا جن معنوں میں اقبال تھے۔ اقبال کی نظر اس تہذیب کی مادیت پر رہی ہے اسی لیے کہا ہے:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

لیکن اس قسم کا کوئی ردِ عمل میرے یہاں پیدا نہیں ہوا۔ غالباً اس کی وجہ ہو گی کہ میں فلسفیانہ سطح پر نہیں سوچتا تھا۔ اقبال کی تنقیدِ مغرب تمام تر اسی سطح کی ہے:

فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی، خرد کی معموری

میں جب یورپ گیا ہوں تو میری عمر ½ ۳۱ سال کے قریب تھی۔ اقبال کے مذکورہ بالا اشعار (پہلے شعر کو چھوڑ کر) اُن کے دوسرے سفرِ یورپ کی یادگار ہیں جب ان کی عمر ۵۴ سال کی تھی۔ پہلے سفرِ یورپ کے وقت وہ البتہ ۲۸، ۲۹ سال کے تھے۔ اُن کتاب 'حرمِ الفت' کی اس دور کی یہ داستان سُنیے:

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبالؔ تو
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے

حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لیے

پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے

ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب

اے تلوّن کیش تو مشہور بھی رُسوا بھی ہے

مغرب کی جانب ہندوستانی ذہن کے ردعمل کی مختلف سطحیں تھیں۔ سیاسی، معاشرتی اور فلسفیانہ۔ سیاسی سطح پر میرے دل میں انگریزوں کی جانب سے جو تلخی بھری ہوئی تھی وہ پیرس جاکر ختم ہوگئی۔ معاشرتی سطح پر میں نے لندن اور پیرس کو ایک سا پایا، بجز اس کے کہ انگریز لئے دیئے رہتا۔ فرانسیسی زیادہ کھُلے دل سے ملتا۔ فرانسیسی لڑکیوں کے یہاں انگریز لڑکیوں سے زیادہ گل افشانیٔ گفتار اور گرم اختلاطی پائی۔ دونوں جگہ جنسی آزادی اور "رواداری" مشرق سے کہیں زیادہ دیکھی بسوائے اس کے کہ فرانسیسی اپنا الٹا ہاتھ عورت کے بازو میں ڈال کر چلتا ہے تاکہ بہ وقت ضرورت کی حفاظت کے لیے سیدھے ہاتھ سے تلوار کھینچ سکے اور انگریز اپنا دایاں ہاتھ عورت کے بازو میں ڈال کر چلتا ہے تاکہ بہ آسانی اسے نالے میں ڈھکیل سکے۔

یورپ میں ہندوستانی نوجوانوں کو سب سے زیادہ خیرہ کرنے والا وہاں کا حسنِ نسوانی ہے۔ خاص طور پر نسوانی حسن کے وہ ڈھلے ہوئے پیکر جو لاطینی ممالک (فرانس، اٹلی، اسپین وغیرہ) میں ملتے نظر آتے ہیں، ان کے لیے بے حد جنسی کشش رکھتے ہیں۔ ان کے جسم کے کمبخت دلآویز خطوط، یقیناً مشرقی حسن کے پیکروں سے زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ ان کو قیام، بھی زیادہ رہتا ہے "دیسی اور کھیسی" کی مثل اُن پر صادق نہیں آتی۔ ان کی جانب منفی اور مثبت دو قسم کے ردّعمل ہوتے ہیں لیکن دونوں سے ان کی یکتائی کا اثبات ملتا ہے۔ ایک ردعمل اقبال جیسوں کا ہے ؎

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب

بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کرلے جا

مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

دوسرا ردعمل اقبال کے ناقد ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے یہاں ملتا ہے (یادوں کی دنیا) جنھوں نے تولون کے حسینوں کو دیکھ کر اقبال کے استاد داغ کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

ٹھہر گئے وہ جہاں سروِ باغ تھے گویا
اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے

میں نے ڈاکٹر یوسف حسین کی طرح حسن کے ان نمونوں کو تنقیدی سے زیادہ تحسینی انداز میں دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے مجموعی طور پر اقبال یورپی تمدن سے انصاف نہیں کر سکے ہیں۔

مغرب کے نادٔ نوش کے اس ماحول میں بھی میں 'لال پری' سے دور رہا۔ اس میں اس قدر مذہبی قدغن کا خیال نہ تھا جتنا کہ اپنی صحت اور خاندانی روایت کا۔ یہی صورت سگرٹ نوشی کے سلسلے میں رہی جس کا مجھے تا حال کوئی تجربہ نہیں۔ اس کے بارے میں تو میرا خیال ہے کہ اسلامی ممنوعات و مکروہات میں اسے بھی بہ یک مُت سے لے کر شامل کر لینا چاہیئے۔ اگر امتناعِ شراب اور تحفظِ زن عالمی تہذیب کو اسلامی تحفہ ہے تو امتناعِ تمباکو نوشی بہ یک مُت کا۔

پیرس کے دورانِ قیام ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب اور بشیر حسین زیدی صاحب وہاں پہنچے۔ عابد صاحب کے قیام کا انتظام میں نے بہت یونیورسیٹیر کے قریب ایک ہوٹل میں کیا تھا۔ کھانے کے لئے وہ میرے یہاں آجاتے۔ ایک روز زیدی صاحب نے جو یونسکو میں شرکت کرنے ہندوستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، مجھ سے کہا کسی دن ہمیں 'ورسائی' کا محل دکھلائیے۔ چنانچہ عابد صاحب کے ہمراہ ہم لوگ وہاں پہنچے۔ کئی گھنٹے تک لوئی چہاردہم کے اس بے مثال محل کی سیر کی۔ لنچ نکل کر پاس کے ایک ریستوران میں کیا۔ چونکہ فرانسیسی سکہ 'فرانک' قیمت میں بہت ہلکا ہوتا ہے، اس لیے بل ہزاروں تک پہنچا۔ بیرا جب بل لایا تو میں نے چاہا اس میں شرکت کر لی جائے تاکہ کسی ایک پر سارا بوجھ نہ پڑ جائے۔ لیکن زیدی صاحب نے علی گڑھ کے سینئر کی روایت کے تحت ایسا نہیں ہونے دیا۔ ریستوراں سے نکلتے وقت میں نے عابد صاحب سے اپنی قلبی بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "زیدی صاحب کا آج بہت خرچ ہو گیا"! قلبِ مطمئنہ کے ساتھ اپنے مخصوص لکنت کے انداز میں بولے "مسعود صاحب! اِن کا تو خرچ ہوتا ہی رہتا ہے"۔
میں چپ تھا!

پیرس کے دورانِ قیام، 'انسٹی ٹیوٹ دُ فونیٹیک' کی تجربہ گاہ میں میں نے اردو عروض کے سلسلے میں ایک انوکھا تجربہ کیا۔ میرا عرصے خیال تھا کہ تمام کلاسیکی عروضوں (عربی، سنسکرت، لاطینی

کا جب موجودہ زبانوں پر اطلاق کیا جاتا ہے تو اُن کے جسم پر جامۂ حرف، تنگ جاتا ہے۔ اسی کو ہم مختلف زحافات سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اتفاق سے انسٹی ٹیوٹ میں میرے ایک ساتھی ایرانی اور دوسرے عرب تھے۔ میں نے اپنے نکتہ کو ثابت کرنے کے لیئے ان کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے بعد حافظ کی مشہور غزل جو بحر مضارع مثمن سالم میں ہے۔ اس کے دو مصرعے کے لیئے اور غالب کا ایک اردو مصرعہ:

(۱) الا یا ایھا الساقی ادر کاسا و ناولہا (عربی)

(۲) کہ عشق آساں نمود اول وے اُفتاد مشکلہا (فارسی)

(۳) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے (اردو)

اس کے بعد تینوں نے اپنے اپنے مصرعے بآواز بلند پڑھے جنھیں ٹیپ کر لیا گیا۔ لطف یہ تھا کہ ہم سب ایک ہی بحر کو استعمال کر رہے تھے لیکن ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو خارج از وزن قرار دے رہا تھا۔ ایرانی، عربی کے مصرعے کو بھی اپنے انداز میں پڑھ کر کہتا اس کو یوں نہیں یوں پڑھو۔ عرب کہتا تھا کہ تم عربی کا مصرع پڑھ ہی نہیں رہے ہو۔ جہاں تک غالبؔ کے مصرعے کا تعلق تھا دونوں بہ یک زبان اسے خارج از وزن بتاتے تھے۔ اس تجربے کے بعد یہ بات ثابت ہوئی کہ تینوں زبانوں کا عروض ایک ہوتے ہوئے تینوں زبانوں کا "سُر لہجہ" (Intonation) مختلف ہے۔ یہ سُر لہجہ ایک ہی بحر پر اس طرح حاوی ہو جاتا ہے کہ اس کی صوتی نوعیت بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح عروض ایک پیمانہ ہے جس سے زبان کا سُر لہجہ بہہ نکلتا ہے۔ اس لیئے ہر زبان کو اپنا عروض اُس زبان کے سُر لہجہ کے مطابق مرتب کرنا چاہتے۔

میرے اس تجربے کو انسٹی ٹیوٹ کے اساتذہ اور ریسرچ کے طلبہ نے بہت غور سے سنا اور اس کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ اسی طرح لاطینی بنیاد عروض کو انگریزی، جرمن، فرانسیسی زبان کے سُر لہجہ (Intonation) کے حوالے سے دیکھا جائے۔ میرا خیال ہے اس انداز کے مطالعے سے ہم زحافات کے چکروں سے باہر نکل آئیں گے، اور ہر زبان کے سُر لہجہ پر اس کے عروض کی بنیاد قائم کر سکیں گے۔ اس کے لیئے ضرورت اس بات کی ہے کہ توضیحی لسانیات نے صوتیات کے بارے میں جو گہری بصیرت دی ہے اس سے کام لیا جائے۔ اردو عروض کی

نئی تشکیل کے وقت ہمیں ہندی چھند کے اصولوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا لیکن عظمت اللہ خاں کی طرح اس کی نقل کرنا ضروری نہیں بلکہ اس کے جائزے کے لیۓ بھی ہمیں علمِ صوت کے جدید علم کا اطلاق کرنا ضروری ہے۔

پیرس میں میرے چھ مہینے قدرے تنگ دستی میں گزرے۔ لندن سے وہاں منتقل ہونے میں میرا کافی خرچ ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد یونسکو کے ایک ہندوستانی افسر مسٹر ڈھینگرا کی عنایت سے مجھے انگریزی سے اردو میں اخبارات کے لیۓ خبروں کا ترجمہ کرنے کا کام ملنے لگا۔ یونسکو میں ترجمہ کا نرخ بالا تھا۔ اس لیۓ میرے پاس اس قدر پیسے بچ جاتے تھے کہ میں ضرورت کی کچھ چیزیں خاص طور پر کتابیں خرید سکوں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ یونسکو میں ترجمے کا کام جب مجھے ملنے لگا تو ظاہر ہے کہ کسی پہلے مترجم کا نقصان ہوا ہوگا۔ انھوں نے پاکستانی سفارت خانے کے ذریعہ یہ اعتراض کرایا کہ جو اردو ترجمے اب اخبارات کیلئے کئے جا رہے ہیں انھیں پاکستانی اخبارات کو قبول کرنے میں تامل ہے، اس لیۓ کہ ان کی زبان معیاری نہیں ہوتی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کسی ہندوستانی ہندی والے سے کرائے جا رہے ہیں۔ یونیسکو کے ڈپٹی ڈائریکٹر اس معاملے کو ڈھینگڑا صاحب کے نوٹس میں لائے جنھوں نے میری سفارش کی تھی۔ ڈھینگڑا صاحب نے لکھ بھیجا کہ ان ترجموں کا کرنے والا فلاں آدمی ہے جو مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہے۔ اُس کی اُردو پر حرف نہیں رکھا جا سکتا اس لیۓ کہ علی گڑھ اردو کا مکّہ ہے۔

اس کے بعد پاکستانی سفارت خانے سے نہ کوئی جواب آیا اور نہ کوئی اعتراض۔ ڈپٹی ڈائریکٹر یونسکو نے مجھے چلتے وقت بڑا اچھا سارٹیفکٹ دیا اور اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا کہ اب پھر ہمارے یہاں ہندوستان اور پاکستان کی اُردو کا جھگڑا شروع ہو جائے گا۔

فروری ۱۹۵۳ء میں زبانی امتحان سے فارغ ہو کر وطن واپسی کے لیۓ رختِ سفر باندھا۔ دوستوں نے ہر چند کہا پیرس کی ایک بہار تک اور رُک جاؤ۔ لیکن اب آنکھوں میں کوئی اور ہی بہار بسی ہوئی تھی۔ میں نے رودبارِ انگلستان کو اسٹیمر کے ذریعے پار کیا اور ساؤتھم ٹن

پہنچ کر اپنا بحری جہاز پکڑا، جس کا ریزرویشن بہت پہلے کرا چکا تھا۔ پھر وہی راستہ، جبل الطارق، پورٹ سعید اور عدن؛ بالآخر دو ہفتے کے بعد بمبئی پہنچا۔ بمبئی سے سیدھا حیدرآباد کا رُخ کیا جہاں یوسف میاں اور خالہ صاحبہ میرے منتظر تھے۔ چند روز کے قیام کے بعد قائم گنج کے لیئے روانہ ہوگیا۔ ہندوستان کی بھولی بسری تہذیب کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب گاڑی آگرے سے قائم گنج کی جانب چلی۔ ہاتھرس پر شور سنا "ہولی ہے ہولی ہے" اور اس کے ساتھ ریل کے ڈبّوں پر تازہ گوبر اور کیچڑ اور پتھرّوں کی بارش شروع ہوگئی۔ ڈبّے میں ہولی کی وجہ سے صرف چند مسافر تھے۔ جب پتھراؤ بڑھ گیا تو میں نے کھڑکیوں کے ٹوٹتے ہوئے شیشوں سے مامون رہنے کے لیئے بیت الخلاء میں پناہ لی۔ اسی عالم میں کاسگنج پہنچا، جہاں میرے ماموں زاد بھائی بدر عالم خاں اور ایک محلے دار حکیم سرور عالم خاں مجھے لینے آئے تھے۔ وہ تو میری طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ اچانک میں بیت الخلاء سے برآمد ہوا۔ اُنھیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ حکیم صاحب نے ڈانٹ کر مجھ سے کہا کیا ہولی کے دن بھی سفر کیا جاتا ہے، میں نے کہا ہرگز نہیں، بھول گیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ سبق آج تک یاد ہے، اس لیئے کہ اکیسویں صدی کے باب داخلہ پر کھڑے ہونے کے باوجود ہماری 'سبھیتا' کا رنگ ڈھنگ ابھی تک نہیں بدلا ہے۔

لیکن کچھ دیر بعد قائم گنج پہنچ کر سفر کی ساری کلفت دور ہوگئی۔ اسٹیشن پر استقبال کے لیئے عزیزوں کا جمِ غفیر تھا۔ میرا بچّہ جاوید بھی کسی کی گود میں تھا۔ اب وہ تین سال کا ہوگیا تھا۔ رشتے کے چچا منظور احمد خاں کے ایما پر استقبالیہ کی تقریب ترتیب دی گئی تھی۔ سب سے پہلے اسٹیشن سے مجھے جلوس کی شکل میں ددھیال کے مکان لے جایا گیا، وہاں اُن کی جانب سے چائے پانی کا انتظام تھا۔ یہ بالکل اسی انداز میں کیا گیا تھا جیسا کہ ۲۷ برس پہلے ذاکر میاں کی جرمنی سے واپسی پر ہوا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر ننہال گیا۔ نانی صاحبہ منتظر تھیں؛ کوئی اور بھی انتظار کر رہا تھا۔ سب نے خوش آمدید کہا سوائے میرے بچّے جاوید کے جس نے ایک اجنبی کو اہمیت دیئے جانے پر اپنا ردِّ عمل ایک 'فری ہینڈ اسٹروک' کی شکل میں ظاہر کیا۔ نانی صاحبہ جھپٹ پڑیں۔ وہ تو سب نے ہائیں ہائیں کہا تو بچ گئے، ورنہ صاحب زادے پٹ جاتے۔

ڈھائی سال کی طویل رخصت کے بعد اب پھر کام پر لوٹنا تھا۔ چنانچہ چند ہی روز

میں اکیلا علی گڑھ چلا گیا۔ اِس مرتبہ بڑی مشکل سے انجینرنگ کالج کوارٹر نمبر ۴ الاٹ ہوا جس میں ایک ٹی۔بی کی مریضہ رہ چکی تھیں۔ اس لئے کچھ عرصہ اس کی قلعی وغیرہ کرانے میں لگا، اس کے بعد بیوی بچے کو لانے کے لیے پھر قائم گنج چلا گیا

ابھی ہم لوگ اپنے نئے گھر میں ٹھیک سے جمنے بھی نہیں پائے تھے کہ قائم گنج سے نانی صاحبہ کے انتقال کی خبر ملی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ صرف میری ولایت سے واپسی کا انتظار کررہی تھیں!

نواں باب

علی گڑھ (۳)

(۵۳ تا ۶۵۹)

علی گڑھ واپسی پر شعبۂ اردو میں ۱۹۵۴ء میں ریڈر بنا دیا گیا۔ ریڈر بننے کے بعد میری تدریسی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ ایم۔ اے کی کلاسوں کو تاریخ زبانِ اردو، دکنی اردو کا ادب، جدید شاعری اور اقبال کا درس دیتا۔ رفتہ رفتہ طالب علموں کے ذریعے میرے درس کی شہرت پھیلنے لگی۔ طلبہ اس بات کا فخریہ ذکر کرتے کہ ہم مسعود صاحب کے شاگرد رہے ہیں۔ اکثر اوقات میں اپنے شاگردوں کو پہچان بھی نہیں پاتا لیکن وہ اصرار کیے جاتے کہ ہم فلاں سنہ میں فلاں کلاس میں آپ کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ایسی صورت میں میں نہایت انکسار کے ساتھ اُن کے دعوے کو تسلیم کرلیتا۔ دوسروں سے بھی اپنے شاگردوں کے بارے میں توصیفی کلمات سُن کر خوشی ہوتی۔ مجھے صرف ایک شاگرد نے مایوس کیا ہے جو اب دہلی کی ایک بڑی یونیورسٹی میں اردو کے درس کی خدمات انجام دے رہے ہیں، جب اس یونیورسٹی کے ایک سینئر استاد نے مجھ سے شکایت کی کہ مسعود صاحب! ہر چند فلاں صاحب کو اصرار ہے کہ وہ آپ کے شاگرد رہ چکے ہیں، لیکن ان کی استعداد اور حرکات دیکھ کر یقین نہیں آتا۔" میں نے کہا وہ مستثنیات میں سے ہیں اور عرصہ ہوا میں اُن سے دست بردار ہوچکا ہوں۔" کہنے لگے "مگر وہ تو آپ سے دست بردار نہیں ہوتے!"

میں فطرتاً الیکشن باز نہیں ہوں جیسا کہ پانچویں باب میں مذکور ہو چکا ہے، طالب علمی کے زمانے میں صرف مختار آزاد کا الیکشن مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی سکریٹری شپ کے

لیے لڑا یا تھا جس میں وہ ہار گئے۔ اس کے بعد ۵۴ تا ۸۴ء اپنے لیے چار الیکشن لڑے جن میں سے علی گڑھ کے تینوں الیکشنوں میں کامیاب ہوا۔ چوتھا علی گڑھ سے باہر کا تھا، اس میں ناکام رہا۔ تفاوتِ زمانی کے باوجود تسلسل کی خاطر میں ان سب کا ذکر ایک جگہ کروں گا۔

یورپ سے واپسی پر میں نے پہلا الیکشن مسلم یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کی انتخابی سیٹ کے لیے ۵۴ء میں لڑا۔ اس میں میرا مقابلہ اپنے معالج ڈاکٹر اسلام الحق انصاری سے تھا جو اس وقت طبیہ کالج میں اُستاد تھے۔ میں نے جب اپنے کھڑے کیے جانے پر اُن سے تاسف کا اظہار کیا تو اُن کا اصرار تھا کہ میں ہرگز اس سے دست بردار نہ ہوں۔ میرے خاص کارکن شعبۂ کیمیا کے ریڈر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی تھے۔ اس میں غیر متوقع طور پر مجھے کافی ووٹوں سے کامیابی حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اِن دنوں وائس چانسلر تھے۔ شام کو حسبِ معمول جب میں ان کی کوٹھی پر گیا تو انھوں نے تعجب کے لہجہ میں پوچھا، "حضرت! آپ کی کامیابی کیوں کر ہوئی"۔ چونکہ ڈاکٹر انصاری، ذاکر صاحب اور رشید صاحب دونوں کے معالج تھے، اس لیے شاید ان لوگوں کی ہمدردی ان کے ساتھ ہو۔ میں نے ذاکر صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "اس لیے کہ لوگوں سے میرے تعلقات Personal تھے اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے Professional!" سُن کر خاموش ہو گئے۔ لطف یہ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے ہارنے کا مجھے بھی افسوس رہا!

دوسرا الیکشن ۷۰-۷۱ء میں مَیں نے اسٹاف ایسوسی ایشن کی صدارت کے لیے لڑا۔ اس میں میرے خاص کارکن شعبۂ قانون کے رحمٰن علی خاں صاحب تھے اور مقابلہ شعبۂ جغرافیہ کے پروفیسر محمد شفیع سے تھا۔ رحمٰن علی خاں نے پروفیسر شفیع صاحب کے خاص کارکن پروفیسر قمر الحسن فاروقی (شعبۂ کامرس) سے مفاہمت کے لیے بات چیت کی لیکن انھیں اپنی کامیابی کا یقین تھا اس لیے دونوں طرف سے زور دں پر تیاری ہونے لگی۔ میں کبھی بھی الیکشن میں ووٹ مانگنے نہیں نکلتا ہوں۔ یہی صورت شفیع صاحب کی جانب سے رہی۔ نتیجہ نکلا اور میں سات ووٹوں سے جیت گیا! دوسرے دن ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب سے ملاقات ہوئی، جو اس وقت وائس چانسلر تھے، کہنے لگے شفیع صاحب تو آپ سے سینئر رہے ہوں گے۔ میں نے کہا مَیں اُن سے عمر میں سات سال بڑا ہوں، اسی لیے مجھے سات ووٹ زیادہ ملے علی گڑھ اپنے سینئر کا احترام کرتا ہے۔

میرے ساتھ سکریٹری کی جگہ کے لیے انجینرنگ کالج کے رشید الظفر صاحب کا انتخاب ہوا۔ یہاں سے ہماری اُس دوستی کا آغاز ہوا جو تا حال جاری ہے۔ وہ بڑی فعّال شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی لیے بہت سے مخالف پیدا کر لیتے ہیں۔ خاص طور پر علی گڑھ کے مارکسٹ حلقوں میں وہ ہمیشہ غیر مقبول رہے، اس لیے کہ وہ ان کا ترکی بہ ترکی جواب تھے۔ میرے دورانِ صدارت سب سے افسوس ناک واقعہ پروفیسر رئیس احمد سے متعلق پیش آیا جن کے کسی بیان پر جس کی زد مسلم یونیورسٹی کے مسلم کردار پر پڑتی تھی، سارا علی گڑھ ان کے خلاف شمشیر بکف ہو گیا۔ اسٹاف ایسوسی ایشن نے بھی ملامت کا ریزولیوشن پاس کیا۔ دائیں اور بائیں بازو کی صف آرائی مکمل تھی۔ اُن کی موافقت اور مخالفت میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ میں مسز شکتی رئیس کی مدافعانہ تقریر سے بہت متاثر ہوا۔ چاہا کہ کوئی بیچ کی راہ نکل آئے لیکن نہ ہو سکا۔ علی گڑھ میں آپ دائیں اور بائیں کے درمیان نہیں رہ سکتے۔ یہ صورت یو۔پی کے اُس انگریز گورنر کی سی ہوتی ہے جس نے قومی تحریک کے سلسلے میں کہا تھا "جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں وہ ہمارے مخالف ہیں"۔

رشید الظفر صاحب کے ہوتے ہوئے تو نہیں لیکن ان کے بعد جب ایک سینیئر کیبنٹ ترقی کر کے تھوڑے عرصے کے لیے سکریٹری بن گئے تو انھوں نے بنام سکریٹری صدر کے اختیارات سلب کرنا شروع کر دیئے۔ وہ صدر کو صرف صدارت کے شغلِ عبث کے لیے سمجھنے لگے حالاں کہ اسٹاف ایسوسی ایشن کے دستور سے یہ کہیں ثابت نہیں ہے اور یوں بھی سوائے کمیونسٹ ممالک کے، سکریٹری ہمیشہ صدر کے تحت کام کرتا ہے۔ بہر حال میں نے اس تناؤ کو محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ میری دو سالہ مدت صدارت ۱۹۷۲ء میں ختم ہو گئی۔

تیسرا الکشن میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نو تنظیم شدہ کورٹ کے لیے ۱۹۸۳ء میں لڑا۔ کورٹ کے آئین کے مطابق دو رکن اردو کے حلقے سے منتخب ہوتے تھے۔ اس کے لیے میرے اور سرور صاحب کے علاوہ بیرونِ علی گڑھ کے کئی امیدوار تھے۔ علی گڑھ نے اپنے قدیم طالب علموں اور اساتذہ کو یاد رکھا اور ہم دونوں بآسانی منتخب ہو گئے۔ مجھے سب سے زیادہ ووٹ ملے۔ ہم دونوں کی مدتِ رکنیت ۸۵ء میں ختم ہو گئی۔ مجھے افسوس ہے کہ دوبارہ انتخاب کے وقت دھاندلی کی گئی یعنی انتخاب کرانے کے بجائے وائس چانسلر ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی کے ایما سے ایک کمیٹی بنا دی

گئی جس نے اِس زمرہ اور دوسرے کئی زمروں میں من مانی کرکے جسے چاہا نامزد کرادیا۔ اردو کے زمرے سے مالک رام صاحب اور خواجہ احمد فاروقی صاحب نامزد ہوئے جن کا علی گڑھ سے تعلق نہ بحیثیت طالب علم کبھی رہا ہے اور نہ بحیثیت استاد۔ میں نے ایک ملاقات میں اپنے پرانے ساتھی اخلاق صاحب کو جب اس کیلئے طعنہ دیا تو کہنے لگے مجھے اس سلسلے میں دھوکا ہوا۔ چونکہ یہ پوری کارروائی غیر قانونی تھی اس لیے چند صاحبان اس کے خلاف اِسٹے آرڈر لے آئے ہیں۔

ایک انتخاب جو میں نے بڑے اعتماد سے لڑا لیکن ہار گیا ساہتیہ اکادمی کی اردو کنوینر شپ کی جگہ کے لیے تھا۔ اعتماد مجھے اس لیے تھا کہ میری تائید میں اکادمی کے صدر ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اور اس کے سکریٹری شری پربھاکر ماچوے، دونوں تھے۔ اردو کے چاروں ممبروں نے میرا نام بالاتفاق رائے تجویز کیا یا تائید کی، جس میں قرۃ العین حیدر صاحبہ، مالک رام صاحب اور ڈاکٹر محمد حسن بھی تھے۔ انتخاب سے ایک دن پہلے مالک رام صاحب مجھ سے ضرور ملے تھے یہ کہنے کے لیے کہ میں ان کے حق میں دست بردار ہوجاؤں لیکن جب میں نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ میں ماچوے صاحب سے وعدہ کرچکا ہوں تو انھوں نے بھی میرے نام کی تائید کی۔ میرے مقابلہ میں ڈرامہ نگار حبیب تنویر تھے جب نتیجہ نکلا تو وہ جیت گئے۔ مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ دو روز قبل کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر میں ساہتیہ اکیڈیمی کے کمیونسٹ ممبروں اور ہم سفروں کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں مختلف زبانوں کے کنوینروں کے نام طے کرکے وہپ جاری کردیا گیا تھا۔ میں کبھی بھی کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کے حلقوں میں اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے پسندیدہ نہیں رہا ہوں۔ مختلف زمانوں میں علی گڑھ میں اور اس کے باہر بھی مجھ پر کارفرمائی کا عمل ضرور رہا ہے لیکن کانٹے کے وقت میں میں نے ہمیشہ خود کو تنہا پایا ہے۔ چوں کہ ذاتی تعلقات میں میرے اندر مروّت بہت زیادہ ہے اس لیے بعض اوقات یہ لوگ دوست بن کر بالادستی حاصل کرلیتے ہیں لیکن نہ میں انھیں اپنے نقطۂ نظر سے معتبر سمجھتا ہوں اور نہ یہ لوگ اپنے کام کے لیے مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں سے بعض حضرات مثلاً ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو میں ذاتی حیثیت سے پسند کرتا ہوں۔ لیکن ان میں بڑی تعداد موقع پرستوں کی ہے جو ذاتی مفاد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہیں اور جن کے نزدیک شرافت اور مروّت جیسی صفات بورژوا اخلاقی کمزوریاں ہیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ان تمام الکشنوں میں مجھے کاسۂ گدائی لے کر نہیں پھرنا پڑا۔ ہر بار چند مخلصین کو خیال آیا کہ مجھے کھڑا کیا جائے۔ انھوں نے ہی میرے لیے دوڑ دھوپ کی اور کامیاب کرایا۔ زندگی میں یہی میرا رویّہ مختلف عہدوں کی جانب رہا ہے۔ چاہے وہ جامعہ ملیہ کی وائس چانسلری ہو یا جامعہ اُردو کی شیخ الجامعی، جس پر میں پچھلے پندرہ سال سے فائز ہوں۔ جب میں نے جامعہ اُردو کے شیخ الجامعہ کے عہدے کے تیسرے انتخاب کے وقت یہ کہا کہ میں "کرسی سے چپکے رہنے کا عادی نہیں" تو اس پر امیرِ جامعہ ڈاکٹر رفیق زکریا نے فرمایا "یہ تو آپ اہلِ سیاست پر طنز کر رہے ہیں"! میں نے جواباً صرف یہ مصرعہ پڑھا ع

اُن کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں

۱۹۵۵ء میں مجھے لسانیات کے ماہرین کی ایک کانفرنس میں پونا مدعو کیا گیا جس کی صدارت کرنے کے لیے انگلستان سے مشہور مستشرق پروفیسر رالف ٹرنر تشریف لائے تھے۔ مسئلہ پیشِ نظر یہ تھا کہ راک فیلر فاونڈیشن کے وقیع عطیے کو، جو دکن کالج پونا کو توضیحی لسانیات کو عام کرنے کے لیے دیا گیا تھا کس طرح مفید اور منظم طور پر استعمال کیا جائے۔ دعوت نامہ دکن کالج کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ایس۔ ایم کاترے کی جانب سے تھا۔ شرکاء میں چوٹی کے ماہرینِ لسانیات۔ پروفیسر سُنیتی کمار چیٹرجی، ڈاکٹر بابو رام سکسینہ، ڈاکٹر دھیریندر ورما، ڈاکٹر سُکمار سین، پروفیسر سری کنٹھیا، پروفیسر سومیاجی اور ڈاکٹر پی۔ بی۔ پنڈت نے شرکت کی۔ اِس کانفرنس نے لسانیات کے علم کو عام کرنے کے لیے مختصر مدتی سرما اور طویل مدتی گرما اسکولوں کا منصوبہ بنایا۔ ۱۹۵۵ء کے دسمبر سے ان کا آغاز ہو گیا۔ میں شروع سے اس کے اساتذہ کی فہرست میں رہا اور سال میں دو بار پڑھانے کے لیے پونا جاتا رہا۔ ایسے معروف اہلِ علم کی صحبت میں خود بھی سیکھتا رہا اور میری نظر میں ہندوستانی زبانوں کے بارے میں وسیع الخیالی پیدا ہوتی گئی۔ میرے ذہن میں موجودہ ہندوستان میں اردو کا جو منصب اور مقام ہے وہ بھی واضح ہوتا گیا۔ ہر شخص اپنی مادری زبان کے بارے میں جذباتی رنگ میں سوچتا ہے، میں بھی اس سے خالی نہیں تھا خاص طور پر آزادی ملنے کے بعد ہندی مت ہوا۔ ہندوستانی عیسائیوں کی وہاں خاصی آبادی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں عیسائیت، ہندو

کی ریاستوں میں اس کے ساتھ جو دھاندلی ہوئی ہے اس سے دل برداشتہ رہتا تھا۔ میں نے اس مجمع میں اردو کا سب سے بڑا ہمدرد پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کو پایا۔ ممکن ہے ان کی یہ ہمدردی بعض معاویہ میں ہو اس لیے کر اس سے قبل وہ ہندی ساہتیہ سمیلن اور دوسرے کئی ہندی اداروں سے انعام پا چکے تھے۔ ہندوستانی زبانوں کے ارتقا کے لیے سنسکرت کی جو اہمیت ہے اس پر مسلسل زور دیتے رہتے تھے۔ لیکن بہر حال ایک بنگالی ہونے کے ناتے اردو کے حق میں کلمۂ خیر کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔ وہ کئی لحاظ سے مجھے ایک دلچسپ انسان نظر آئے۔ جیّد عالم لیکن طبیعت میں بچوں کی سی سادگی۔ (ابو الکلام (لغوی معنوں میں) تھے کہ مسلسل بولنے پر بھی نہیں تھکتے تھے۔ حافظہ بھی غضب کا پایا تھا۔ حاضرین و سامعین کے پیشِ نظر قرآن تک کی چند آیات پڑھ کر سنا دیتے تھے اور سنسکرت کے اشلوک تو ان کی نوکِ زبان پر رہتے۔ اردو کے بارے میں کہتے تھے کہ بڑی شستہ و رُفتہ زبان ہے اور اسی کی نسبت سے ہندی کو کھڑی اور کھردری بتاتے۔ ان کی تجویز تھی کہ اگر "اردو ہندی" سے جنس کی دخل اندازی نکال دی جائے تو اس زبان کا سیکھنا بہت آسان ہو جائے، جیسی کہ یہ کلکتے کے بازاروں میں بولی جاتی ہے۔ میں ہنس کر کہتا اس نکاحی شرط کے ساتھ تو اردو متعہ کے لیے بھی نہیں ملے گی۔ اس کی تذکیر و تانیث ہی میں تو اس کا لطف ہے۔ قدیم اردو میں تو یہ اس قدر تھی کہ حروف، صفات اور افعال اعداد تک اس سے متاثر ہوتے تھے! اب تو ہم نے اسے خاصا سہل بنا لیا ہے لیکن اور سہل بنا کر "وہ مرد گیا" وہ عورت گیا، ہمارا باپ گیا، ہمارا ماں گیا، شوب (سب) گیا" آپ لوگوں کی یہ مزید سہولت کے لیے نہیں کہا جا سکتا۔ معدہ قوی پایا تھا اس لیے ۵ء کے پیٹے میں بھی لذتِ کام و دہن کے دلدادہ تھے، اور اس کا ایک گل ہند ذوق رکھتے تھے۔ وہ مہاراشٹر کا "شری کھنڈ" اسی ذوق سے کھاتے جس لطف سے اپنا "رشو گلّا"! ہر چند ان کا توضیحی لسانیات کا علم مستحضر نہیں تھا لیکن وہ اپنی انسائی کلوپیڈیائی معلومات، گراں ڈیل شخصیت کی وجہ سے لسانیات کے اسکولوں پر چھائے رہتے۔ میری درسیات نظری و عملی صوتیات تک محدود تھیں چونکہ یہ کورس ہر طالب علم کے لیے لازمی تھا۔ اس لیے مجھے مستقبل کے بیشتر اساتذۂ لسانیات کے استاد ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ پروفیسر اشوک کیلکر، پروفیسر جگدیو سنگھ، پروفیسر گل، ڈاکٹر عبد الغفار شکیل، پروفیسر عبد العظیم ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ وغیرہ وغیرہ۔ عملی صوتیات کی مشقوں کیلئے ہم کسی ایسی زبان کو منتخب کرتے

تھے جو ہمارے طالب علموں کے لیے بالکل نئی ہوتی کہ انھیں نئی نئی اصوات کے سننے اور ادا کرنے کی مشق ہو سکے۔ اس زبان کے نمائندے کو دس روپیہ فی گھنٹہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ایک بار طے پایا کہ کوئی عربی زبان بولنے والا گرفتار کیا جائے اس لیے کہ اس زبان میں ہندوستانی طالب علموں کے لیے وافر صوتیاتی مواد ملتا ہے۔ چنانچہ کسی کے توسط سے پونا کے ایک یہودی کو تلاش کر لیا گیا، جو فلسطین میں عرصے تک مقیم رہنے کی وجہ سے عربی کی اچھی مہارت رکھتا تھا۔ ایسے الفاظ کی ایک فہرست تیار کی گئی جن میں عربی کی مخصوص آوازیں ق، غ، ع، ح، ذ، ث، ص، ض، ط، ظ اور ھمزہ پائے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کو اس سے ادا کرایا جاتا تھا اور طلبہ انھیں صوتیاتی رسم خط میں لکھتے اور ان کی ادائیگی کی نقل کرتے۔ اس عمل میں بعض اوقات آٹھ آٹھ دس دس بار اس نوگرفتار کو دُہرانے کی زحمت دی جاتی۔ کچھ طلبہ تفنن طبع کی خاطر بھی اس کو تھکانے کے جتن کرنے لگے۔ ایک روز جب اس کا گلا ان آوازوں کو ادا کرتے کرتے بیٹھ سا گیا تو دونوں ہاتھوں کو ہوا میں ہلا کر مجھ سے کہنے لگا "اس قدر محنت صرف دس روپے کے لیے۔ بس اب کل سے نہیں۔" لاکھ سمجھایا کہ یہ علم کی خدمت ہے تجارت نہیں ہے، لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آیا اور آنا چھوڑ دیا۔

ہندوستانی ماہرین لسانیات کے علاوہ ان اسکولوں میں امریکہ سے بھی کچھ اساتذہ آئے تھے۔ ان میں سے بعض خاصے معروف تھے یا بعد کو ہوئے مثلاً پروفیسر فربینکس، پروفیسر گلیسن (جونیئر)، ڈاکٹر جان گمپرز۔ ہندوستان میں جدید لسانیات کا آغاز دراصل انھیں اسکولوں سے ہوا جو پانچ سال تک راک فیلر فاؤنڈیشن کی مالی امداد سے دکن کالج پونا میں منعقد کیے جاتے رہے۔ اس کے بعد لنگوسٹک سوسائٹی آف انڈیا نے ان کی ذمہ داری لے لی۔ مالی دقتوں کی وجہ سے پہلے سرما کے اسکول بند ہوئے اور رفتہ رفتہ گرما کے اسکولوں کے انعقاد کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ تاہم اگلے پانچ سالوں میں ہندوستان کے دوسرے شہروں، دہرہ دون، حیدرآباد، اناملائی اور ٹریوینڈرم میں یہ اسکول منعقد ہوئے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ میں نے آخر بار ۱۹۶۴ء میں ٹریوینڈرم کے اسکول میں شرکت کی تھی۔ میرے دوست پروفیسر وی۔ آئی۔ سبرامنیم اس کے ڈائرکٹر تھے۔ دور دکن کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔ اس لیے وہاں کے مناظر (جس میں ناریل کا درخت خاص اہمیت رکھتا ہے) اور تہذیبی مظاہر سے خوب لطف اندوز ہوا۔ ہندوستانی عیسائیوں کی وہاں خاصی آبادی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں عیسائیت، ہندومت

سے ہم آہنگ ہو گئی ہے اور حضرت عیسیٰ بھی من جملہ دیگر دیوتاؤں کے ایک دیوتا بن گئے ہیں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب ہندوستان کے کسی بھی دوسرے علاقہ سے زیادہ ہے۔ ملیالم کے رسائل اور اخبارات کثیر تعداد میں شایع ہوتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں۔ عورت زندگی کے کاروبار میں برابر کی حصہ دار ہے اسملئے بھی کہ وراثت کا سلسلہ اس کی جانب سے چلتا ہے۔ کوئی کھانا ناریل، کاجو اور انناس کے بغیر مکمل نہیں خیال کیا جاتا۔

ہمارا سمر اسکول اپنے آخری مراحل میں تھا کہ اچانک پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کی خبر ملی۔ اس کے ساتھ اسکول برخاست کر دیا گیا اور وہ تمام پروگرام بھی جو اختتامی جلسے اور سبرامنیم صاحب کی ضیافت سے متعلق تھے۔ لسانیات کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں رائج کرنے کا طریقۂ کار یہ تجویز ہوا کہ پہلے زبانوں کے شعبہ جات میں لسانیات کے دو پرچے شامل کئے جائیں اور طالب علم کی سند پر اس تخصیص کا اظہار کیا جائے۔ اس کے بعد یو۔ جی۔ سی۔ کی تائید سے لسانیات کے علاحدہ شعبے قائم کیے جائیں۔ چنانچہ میرے یورپ سے واپس آنے کے بعد مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایسا ہی کیا گیا۔ مجھے توقع تھی کہ چند سالوں میں اس شعبے کے اندر لسانیات کی پروفیسری نکل آئے گی۔ یہ پہلا قدم ہوگا علاحدہ لسانیات کا شعبہ قائم کرنے کی جانب؛ لیکن بعض لوگوں کی کم توجہی کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا۔ رشید صاحب ۱۹۵۸ء میں شعبۂ اردو کی صدارت سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ اب کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر تھے اور پروفیسر آل احمد سرور، صدر شعبۂ اردو۔ انھیں ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین لکھنؤ سے غالب پروفیسری پر لے آئے تھے۔ جو ان کے علی گڑھ کے پرانے ساتھی، عطاء اللہ صاحب کے دجو امریکہ میں مُرمُروں کے بادشاہ بن گئے تھے)، گراں قدر عطیے سے غالب کے اردو کلام کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔

اس زمانے میں میں نے ایک کام اور کر ڈالا۔ یورپ سے ۱۹۵۳ء میں واپس آنے کے بعد ہی میں نے ایم۔ ایم۔ ہال کے سامنے دو بیگہ (پختہ) زمین کا ایک قطعہ اپنے دوست ڈاکٹر خورشید فاروقی سے خرید لیا۔ اس زمانے میں دودپور کی زمینیں گزوں سے نہیں بیگھوں کے حساب سے سستے داموں مل جاتی تھیں۔ پاکستان بن چکا تھا۔ علی گڑھ سے ہجرت کا سلسلہ اب تک جاری تھا

اس لیے صحرائی دلکش جائیداد کی قیمتیں بہت گر گئی تھیں۔ ۳ راپریل ۵۶ء کو میں نے تھوڑے سے سرمائے کی فراہمی کے بعد خدا کا نام لے کر اس قطعہ پر اپنے مکان کی داغ بیل ڈال دی۔ قائم گنج سے دو معمار اور چند مزدور بلوانے تاکہ تعمیر کے مقام پر شب و روز رہ سکیں تعمیر کے سلسلے میں میرے مشیر کار خلیل مراد صاحب لکچرر شعبۂ فزکس تھے جنھیں تعمیر کا دیسی تجربہ تھا اور جو خدائی خدمت گار کے جذبے سے ہر نئی تعمیر کے قریب از خود پہنچ جاتے تھے۔ وہ پروفیسر علاء الدین کے خسر تھے اور مجھ پر بہت مہربان۔ اپنی عمر کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ میرے ساتھ تعمیر کے مقام پر دھوپ میں کھڑے رہتے۔ تعمیر کے سلسلے میں ان کا نظریہ "کفایت" کا تھا جسے وہ ہر قیمت پر ترجیح دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس سلسلے میں میرے بڑے راج، محمد حسین سے ان کا اختلاف ہونے لگا۔ میں بھی، باوجود سرمایہ کی قلت کے، گھٹیا اور سستے کام پر راضی نہیں تھا۔ بالآخر میرے (ان کی دانست میں) بے جا صرف کو دیکھ کر انھوں نے یک لخت آنا بند کر دیا۔ اور اس طرح اُن کے مفت کے مشورے سے مَیں محروم ہو گیا۔

ایک شام جب ذاکر میاں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے شکایت کی "سنا ہے آپ نے مکان بنوانا شروع کر دیا ہے اور ہمیں خبر تک نہیں کی۔ یہ بھی سنا ہے کہ اس سلسلے میں آپ کے مشیر خلیل مراد صاحب ہیں۔ یہ وہ حضرت ہیں کہ جس نئی تعمیر کے پاس سے گزر جائیں تو اس کا ستیاناس کر دیں"۔ میں اُن سے یہ تو نہیں کہہ سکا لیکن دل میں ضرور کہا کہ "آپ سے تعمیر کی بات اس لیے پوشیدہ رکھی کہ آپ جس تعمیر میں دلچسپی لے لیں تو اسے تاج محل بنا دیں"! اس مکان کی تعمیر میں مجھ جیسے قلمی انسان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے یہ ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔ سیمنٹ پر کنٹرول تھا اس کا پرمٹ بیک وقت دس دس بیس بیس بوریوں سے زیادہ کا نہیں ملتا تھا، لیکن کھلے چور بازار، میں دو روپے زیادہ دے کر آپ جس قدر چاہیں لے سکتے تھے؛ البتہ جب اشد ضرورت کے وقت اس قسم کی خریداری کر لی جاتی تھی تو دھڑ کا لگا رہتا تھا۔ میں نے اس دھندے میں اپنی بیوی کو زیادہ جیالی پایا۔ ان کی دلچسپی اس لیے بھی زیادہ ہو گئی تھی کہ ان کے نام سے میں نے سرکاری کوآپریٹو سے سات ہزار کی رقم قرض لی تھی جس کے لیے زمین کا بیع نامہ ان کے نام کرانا پڑا تھا۔ چنانچہ مکان بن جانے کے بعد وہی اس کی قانونی مالکہ قرار پائیں۔ خود کو لٹا کر گھر بنانے کی پاداش میں اب تک ان کی یہ دھمکی سننا پڑتی ہے "یہ گھر میرا ہے جس کو جب چاہوں نکال دوں"!

گھر کی تعمیر کے دوران میں، چھ مہینے تک مطلق جاہل ہو گیا تھا۔ گرما کی تعطیلات کے ساتھ میں نے اپنی جمع شدہ چھٹی ملا لی تھی۔ سارا وقت، اینٹوں کے بھٹوں یا لوہیوں کے بازار کے چکر لگانے یا راشن آفس میں انتظار کی گھڑیاں کاٹنے میں گزرتا۔ گرمی کا موسم تھا اس لیئے میں ہیٹ کا استعمال کرتا تھا جس سے میرے ماتھے پر "ابلقِ ایام" کی سی کالی اور سفید دھاریاں پڑ گئی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے ایک بار بایں صورت، سائیکل دوڑاتے دیکھا تو مسکرائے اور کہا یہ کیا حال بنا لیا ہے۔ میں نے اس پر انھیں اپنا یہ تازہ شعر سنا دیا ؎

اک مکاں عالمِ امکاں سے وہ لائے ہیں بہ ضد
ہو گئے حضرتِ مسعود بھی تعمیر پسند

بہر حال چھ مہینے کی دوڑ دھوپ کے بعد مکان کا اس قدر حصہ مکمل ہو گیا کہ ہم لوگ ۳ر اکتوبر ۵۶ء کو انجینیرنگ کوارٹر کو خیرباد کہہ کر اس میں منتقل ہو سکیں۔

اس مکان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ منتِ انجینیر یا اُورسیر اٹھائے بغیر میری نگرانی میں تعمیر ہوا تھا۔ میں ہی اس کا آرکیٹیکٹ تھا، میں ہی انجینئر اور میں ہی اُورسیر۔ میں نے چنڈی گڑھ کے خالق، مشہور فرانسیسی آرکیٹیکٹ Le Corbusier کا یہ جملہ کہیں پڑھا تھا کہ "اگر کوئی مکان استعمال کے نقطۂ نظر سے قابلِ اطمینان ہو تو وہ خود اپنا طرزِ تعمیر تخلیق کر لیتا ہے"۔ آج میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ مکان میری اور میرے خاندان والوں کی ضروریات کو بوجوہ احسن پورا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا ایک اپنا طرزِ تعمیر بھی ہے جو نایاب ہے! کیوں نہ ہو ایک اناڑی سے سرزد ہوا ہے۔

اس کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ میں نے اپنی رہائش اور کتب خانے کے لیئے دو کمرے اوپر کی منزل میں اس انداز کے بنائے ہیں کہ وہاں پہنچ کر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہوں۔ میرے لائبریری کے کمرے کی دیواروں میں کتابوں کے شیلف بنے ہوئے ہیں۔ درمیان میں بڑی سی کھڑکی کے سامنے میری میز ہے جہاں سے میں دور تک اس میدان کا نظارہ کرتا تھا جو علامہ اقبال ہال بننے سے قبل یونیورسٹی کے قبرستان تک پھیلا ہوا تھا۔ مکان دو بیگھہ زمین کے عین وسط میں ہے اس لیئے مداخلتِ ہمسایہ سے محفوظ ہے اور اب کھلی زمین میں یوکلپٹس اور اشوک کے اونچے اونچے درخت ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے ایک کاٹیج کا سا سماں پیدا ہو گیا ہے۔ گو کہ یہ عالم رہتا ہے کہ پڑوس کے ہاسٹل کے طلبہ

میں اس کا نام Haunted House پڑ گیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی وائس چانسلری (۴۸ تا ۵۶ء) کا دور علی گڑھ کے لیے نہایت پُر آشوب زمانہ تھا۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد نے مردم شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے اس بدنصیب ادارے کو بلاخیز سیاسی تلاطم سے بچانے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتخاب کیا تھا۔ علی گڑھ نے انھیں تحفظاتِ ذہنی کے ساتھ قبول کیا۔ اس لیے کہ اس ادارے کو اس کا ماضی ہر لحظہ آئینہ دکھاتا تھا۔ مولانا آزاد کے پیشِ نظر ہندوستانی مسلمانوں کی باز آبادکاری کا اہم مسئلہ تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اُن کی نظر میں ہر لحاظ سے اس کے لیے مستند بھی تھے اور معتبر بھی۔ علی گڑھ زخم خوردہ اور سہما ہوا ضرور تھا لیکن اسے اپنے کیے پر پچھتاوا نہیں تھا۔ نجی ملاقاتوں اور مجلسوں میں سکتہ کا عالم ہوتا یا سکوت کا۔

اس سکتہ اور سکوت کے عالم کو ختم کرنے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین معمور کیے گئے تھے۔ وہ دل میں بڑے بڑے حوصلے لے کر آئے تھے لیکن آتے ہی ۱۹۴۹ء میں ان پر قلب کا دورا پڑا جس نے ماہیئتِ قلب کر دی۔ اب علی گڑھ کو حیاتِ نو بخشنے کے پروگرام کے ساتھ خود کو زندہ رکھنے کا عمل شامل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ ان کے عزائم کی کمزوری اور شخصیت کی تبدیلی میں اُن کی اس بیماری کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اب نرسوں، ڈاکٹروں اور شام کے بیٹھنے والے چند مقربین میں گھر کر رہ گئے۔ ان میں رشید احمد صدیقی صاحب، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن (میڈیکل آفیسر)، سید نوراللہ صاحب (پرو وائس چانسلر) حکیم عبداللطیف صاحب (پرنسپل طبیہ کالج) اور ڈاکٹر عبدالعلیم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بیماری کے باوجود ان کا ظرافت کا حس قائم رہا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کبھی کبھی آتے لیکن بہت طویل نشست کرتے۔ مطلب کی بات اس نشست کے سب سے آخر میں کہتے۔ ان کی اس طویل نشستی کے بارے میں ایک دن کہنے لگے "بھئی یہ بہت بھاری پیندے کے آدمی ہیں"۔ حسِ مزاح کے ساتھ ساتھ ان کا تنقیدی شعور بھی بیدار رہا۔ ایک دن کہنے لگے کہ "توفیقِ الٰہی نہ ہو تو دنیا کی ساری سہولتیں مہیا ہو جانے پر انسان کام نہیں کرتا"۔ یہ اشارہ تھا شعبۂ Telcom کے صدر کے اس اصرار کی جانب کہ اُن کے شعبہ کی کارکردگی کو بڑھانے کے لیے ان کے لیے ... ضروری ہے۔ مجھے تعجب اس وقت ہوا جب انھوں نے گاندھی جی کے بارے میں ایک دفعہ

یہ رائے دی کہ انھیں سیاست سے پہلے علاحدہ ہو جانا چاہیے تھا اور دوسری اس وقت لگا جب اقبال کے تذکرہ پر اچانک بولے "بھئی! وہ پنجابی تھے" سوچتا رہ گیا کہ یہ مولانا محمد علی کی زبان تو نہیں ہے جو 'اسرارِ خودی' کے اقبال کے پرستار رہے، اور اس کے بعد انھیں (غالباً سیاسی اختلافات کی بنا پر) 'اقبال مرحوم' کہنے لگے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ مولانا محمد علی ہی کی تحریک پر گاندھی جی نے اقبال کو ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ کی پرنسپلی کی پیش کش کی تھی، جسے انھوں نے ذاتی مجبوریوں کا بہانہ بنا کر قبول کرنے سے معذرت کر لی تھی۔ میں اس سے بھی واقف تھا کہ ۱۹۲۶ء میں پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہو جانے کے بعد اقبال نے زمیندار جماعت کی حمایت کی تھی۔ اس تمام معلومات کے باوجود ذاکر صاحب کا اقبال کی 'پنجابیت' کے تذکرہ کا پس منظر میری سمجھ میں نہیں آیا۔

ذاکر صاحب اور رشید صاحب دونوں ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ رشید صاحب کے لیے ذاکر صاحب 'مرشد' تھے۔ 'مضامینِ رشید' میں اس نسبت کا اعلان ملتا ہے۔ ذاکر صاحب جب بھی علی گڑھ آتے رشید صاحب کے یہاں قیام کرتے۔ لیکن ذاکر صاحب کو رشید صاحب کی شعبۂ اردو سے متعلق ناکردگی سے شکایت رہی۔ اسی لیے وہ ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ سے آل احمد سرور صاحب کو اپنے امریکی دوست عطاء اللہ صاحب کی قائم کردہ غالب چیئر پر لے آئے اور ان سے یہ وعدہ لیا کہ وہ خود کو صرف علمی کاموں میں مصروف رکھیں گے اور یونیورسٹی کی انتظامیہ سے بالکل الگ رہیں گے۔ لیکن ۵۶ء میں کرنل بشیر حسین زیدی کے وائس چانسلر بنتے ہی انھوں نے ایک ہال کی پرووسٹی قبول کر لی۔ یونیورسٹی کی سیاست اور دوسری مصروفیات کی بنا پر وہ تفویض کردہ غالب کے اردو دیوان کا ترجمہ بھی نہیں کر سکے جس کی وجہ سے ذاکر صاحب آخر وقت تک اُن سے شاکی رہے اور عطاء اللہ صاحب نے تو نازیبا کلمات استعمال کرتے ہوئے قانونی کارروائی کی دھمکی تک دی۔ دراصل پتہ مار کام سرور صاحب کے بس کا کبھی نہیں رہا۔ ایک ذہین انسان ہونے کے ناتے وہ طلاقتِ لسانی اور تنقیدی اشارات و متفرقات کے مردِ میدان ہیں۔ چونکہ ان کا مطالعہ وسیع ہے اس لیے وہ ہر موضوع پر تیزی کے ساتھ کچھ نہ کچھ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں عرصے سے اقبال پر تصنیف کا ایک خاکہ ہے جس کی تکمیل وہ کشمیر کے دس سالہ قیام میں بھی جب اقبال ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا، نہ کر سکے۔

ذاکر صاحب نے اپنی علالت کے باوجود علی گڑھ کو سیاسی ورطۂ بلا سے بچانے میں نمایاں کام کیا۔ اُن کی براہِ راست رسائی پنڈت نہرو اور مولانا آزاد تک تھی۔ اِس لیئے اُتّر پردیش کے کسی عامل یا وزیر کو علی گڑھ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ان کی شخصیت کا اسلامی پہلو نمایاں تھا۔ وہ علی گڑھ کے ممتاز اولڈ بوائے رہ چکے تھے، اِس لیئے علی گڑھ کا وہ حلقہ جو دا اسلامسٹ، کہلاتا تھا، ان کے خلاف کوئی فتویٰ نہیں دے سکا۔ انھیں کے ایماء پر ڈاکٹر عبدالعلیم اور ڈاکٹر نورالحسن لکھنؤ سے علی گڑھ آئے۔ علی گڑھ کے جانے پہچانے کمیونسٹ محمود حسین صاحب کو فعال جان کر رجسٹراری کے عہدے پر فائز کیا۔ یہ لوگ بھی ذاکر صاحب کے ممنونِ احسان رہتے۔ لیکن یہ توازنِ طاقت بہت دنوں تک نہیں چل سکا۔ جب چند سال کے بعد ذاکر صاحب ڈاکٹر گل کو ممتاز سائنس داں سمجھ کر امریکہ سے یونیورسٹی کے شعبۂ فزکس میں پروفیسر کی حیثیت سے لائے اور ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، تو وہیں سے بائیں بازو والوں سے وجہ افتراق شروع ہوئی۔ ڈاکٹر گل کی علمی لیاقت کے بارے میں میرے لئے کچھ کہنا دشوار ہے اس لیے کہ جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن اس کی شہادت دے سکتا ہوں کہ وہ ایک مضبوط انسان تھے جنھیں ذاکر صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ ۱۹۶۹ء میں جب ذاکر صاحب کی میّت راشٹرپتی بھون کے بڑے گنبد کے نیچے آخری رو نمائی کے لیئے رکھی ہوئی تھی تو من جملہ اعزّہ کے جس شخص کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے وہ ڈاکٹر گل تھے۔ اُن کا اب علی گڑھ یا ذاکر صاحب سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

رفتہ رفتہ بائیں بازو کے حضرات نے ذاکر صاحب کی علالت سے فائدہ اٹھا کر خود کو مجتمع کرنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کی جامعہ کے پرانے رشتے سے ذاکر صاحب تک شام کی نشستوں میں رسائی تھی۔ ذاکر صاحب ان کے تساہل اور علمی ناکردگی سے آزردہ رہتے لیکن انھیں عام معاملات میں صائب رائے سمجھتے تھے۔ اُن میں یہ خصوصیت بھی تھی کہ کمیونسٹ آئیڈیالوجی سے گہرا شغف رکھنے کے باوجود، کچھ باعتبار خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم اور کچھ باعتبار پیشہ (وہ ادارۂ اسلامیات کے سربراہ تھے) اس قبیل کے چھٹ بھیئوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع الخیالی اور شرافتِ نفس کے مالک تھے۔ ذاکر صاحب پر اثر انداز ہونے کا ان کا طریقہ نہایت دقیق اور نفسیاتی ہوتا۔ ذاکر صاحب ان کی رائے سے ایک زمانے میں اس قدر متاثر تھے کہ اپنے دوست رشید صاحب کے

بر عمل جذباتی عمل کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ رشید صاحب اکثر اس کی شکایت بھی کرتے۔ رجسٹرار کے دفتر پر محمود حسین صاحب کی حکمرانی تھی جو مستعد اور کارگزار آدمی تھے اور انگریزی کے استاد ہونے کی حیثیت سے انھیں اس کی تحریر و تقریر پر پورا عبور تھا۔ انگریزی وہ بولتے نہیں تھے بلکہ اس کی قرأت کرتے تھے، جس کی وجہ سے طلبہ میں ان کا نام 'قاری محمود' پڑ گیا تھا۔ بہت جلد ذاکر صاحب کو اس حلقے کی بڑھتی ہوئی مضبوط گرفت کا احساس ہونے لگا اور جب یہ لوگ پروفیسر گل کے خلاف اکیڈمک کونسل کے مجھ جیسے منتخب شدہ ممبران تک کو حرکت میں لے آئے تو انھوں نے خطرے کا مکمل طور پر احساس کر لیا۔

کیمونسٹ سیاست کا، چاہے وہ کسی ملک کی ہو یا یونیورسٹی کی کسی بھی تحریک کو منظم کرنے کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے، یعنی فیصلے ایک چھوٹی سی منظم جماعت کرتی ہے۔ اس کے بعد ذاتی روابط اور پروپیگنڈے کے ذریعے ایک وسیع حلقے کی ہمدردی حاصل کی جاتی ہے۔ غیر منظم اشخاص ان کی سیاسی چالبازی کا بہت جلد شکار ہو جاتے ہیں اور کبھی انسان دوستی کے نام پر، کبھی جمہوریت کے جھنڈے تلے (حالانکہ اصل جمہوریت سے ان کا کوئی رابطہ نہیں) کوئی بھی نوجوان 'ترقی پسند' ہونے کو کیوں کر رد کر سکتا ہے۔ یہ تو ایک بے ضرر ترکیب ہے جس سے کم از کم انسان کا نفس تو موٹا ہو جاتا ہے۔ غیر ترقی پسند یا رجعت پسند کہلانا کون پسند کرے گا۔ حالاں کہ از روئے قواعد 'ترقی پسند ادب' کی ترکیب سرتاسر غلط ہے اس لیے کہ ترقی پسند ادیب ہو سکتا ہے ادب نہیں۔ لیکن چلتی کا نام گاڑی ہے۔

علی گڑھ کے قیام میں، مَیں بھی اس دور سے گزرا ہوں۔ میری خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی 'اسلامیوں' اور 'کیمونسٹوں' دونوں نے مجھے مستقبل کا 'ہم سفر' سمجھ کر مجھ پر کام کیا ہے۔ ایک زمانے میں منٹو سرکل کے مشہور استاد سید محمد ٹونکی صاحب (جو ان معنوں میں مجموعۂ اضداد تھے کہ نماز بھی پڑھتے تھے اور پکے کیمونسٹ بھی تھے) مجھے اپنی گوں کا سمجھ کر کیمونسٹ پارٹی کا ہفتہ وار میرے پاس بیچنے کے لیے این ہاسٹل آتے۔ میں نے چند ہفتے اسے خریدا لیکن اس میں سوائے پارٹی کے پروپیگنڈے کے مجھے کچھ نہیں ملا۔ ایک بار جب وہ اس کے چند پرچے لیے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "ٹونکی صاحب آپ کی مروّت

میں اسے خرید لیتا ہوں لیکن مجھے اِس میں کچھ ملتا ہے نہیں"۔ ایک جھٹکے کے ساتھ پرچہ میرے ہاتھ سے لیا اور یہ جا وہ جا۔ اس کے بعد کبھی نہیں لوٹے، میں نے بے اختیاری میں ایک بات کہی تھی، لیکن آخر میں سبک سار رہا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ذاکر صاحب نے اپنی وائس چانسلری کے آخری دور میں اس حلقے کی گرفت کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے قبل وہ اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ زندگی کا کھیل ایک قسم کی پتنگ بازی ہے۔ پتنگ کا پیچ ڈھیل سے بھی لڑایا جاتا ہے اور کھینچ کر بھی۔ میں ڈھیل کا پیچ لڑنے والوں میں ہوں۔ اس کے بعد کہتے اللہ میاں کی رسّی بھی ڈھیلی بتائی جاتی ہے۔ میں نے ایک بار کہہ دیا کہ زیادہ ڈھیلی رسّی دیجئے تو جانور رسّی سمیت بھاگ جاتا ہے۔ یہ سن کر با معنی انداز میں خاموش ہو گئے۔

۱۹۵۶ء آتے آتے ان کا ذہن علی گڑھ کو چھوڑ دینے کا بن چکا تھا، حالاں کہ ابھی اُن کی وائس چانسلری کی کچھ مدّت باقی تھی۔ اس کی جانب انھوں نے سب سے پہلے اشارہ رشید صاحب سے کیا۔ رشید صاحب یہ سن کر بڑے سراسیمہ تھے۔ ہفتوں شام کی نشستوں میں تنہائی پا کر انھوں نے 'مرشد' سے اپنا ارادہ بدلنے کو کہا۔ ادھر علی گڑھ میں زبردست فرقہ دارانہ فساد ہو گیا جس کے بعد دلی اور بڑھ گئی۔ ایک شام میں وائس چانسلر کی کوٹھی کے دروازے میں داخل ہوا تو رشید صاحب اندر سے تیزی کے ساتھ لپکتے ہوئے باہر نکلے۔ مجھے دیکھ کر ذرا توقف کیا پھر کہا "مسعود صاحب! آج میں نے ذاکر صاحب سے کہہ دیا ہے کہ آپ یونیورسٹی کو رِفت رلیف کے ہاتھوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں"۔

'مرشد' چلے گئے تو 'مرید' کا ایمان متزلزل ہو گیا۔ پہلی بار رشید صاحب کے قلم سے ان کے خلاف تحریر نکلی یہ "ذاکر حسین حیات اور شخصیت" کے مختصر پیش لفظ کی شکل میں تھی جب وہ کچھ روز تک دلی اور جرمنی میں قیام کرنے کے بعد پٹنہ کے راج بھون میں داخل ہو گئے تو رشید صاحب کو ایک اور صدمہ پہنچا لکھا "انھیں علی گڑھ سے نکل کر کہیں جانا تھا تو جامعہ ملیہ جاتے"، جس کے لیے انھوں نے خود اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

ذاکر صاحب کا 'ڈھیل' کا طریقۂ کار علی گڑھ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جامعہ ملیہ ایک چھوٹی سی برادری تھی۔ پرانی رفاقت کی یادیں ابھی تک تازہ تھیں۔ ذاکر صاحب اگر ایک

جانب طنزاً یہ کہتے تھے کہ یہ "چڑیا کے برابر دماغ رکھنے والے لوگ ہیں" تو دوسری طرف کوئی کلرک یا چپراسی بھی ناراض ہو جاتا تو اسے منانے کی فکر میں رہتے۔ بچوں کے ادیب، الیاس مجیبی صاحب، ان کے سکریٹری تھے۔ بیگم صاحبہ سے کچھ عزیزداری بھی ہوتی تھی۔ بڑے نازک مزاج آدمی تھے۔ ذاکر صاحب اُن کی تنک مزاجی سے تنگ رہتے۔ ایک دن ہنسی کہنے لگے "ہماری زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ مجیبی صاحب سے نبھائے جائیں۔"

علی گڑھ زیادہ بڑی دنیا تھی۔ یہاں برادری کے اُصولوں سے نہیں جوڑ توڑ سے کام چلتا تھا۔ ذاکر صاحب جس سانچے میں ڈھل چکے تھے وہ علی گڑھ کے لیے سازگار نہیں تھا۔ وہ ایک نہایت ذہین انسان تھے اس لیے دوست دشمن سب کی صلاحیتوں کو سمجھتے تھے لیکن سمجھ کا جو تقاضا ہوتا اس کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے اکثر "اُستاد" قسم کے لوگ اچھے استادوں کو پیچھے ہٹا کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ خوشامدی میری رہتے اور خوددار گھاٹے میں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے تم ڈاکٹر مترا کو جانتے ہو۔ میں نے کہا نام سنا ہے، دیکھا آج تک نہیں۔ کہنے لگے دیکھو گے کیسے وہ گھر سے نکلتے ہیں تو فزکس کے لیے لیب میں چلے جاتے ہیں اور وہاں سے نکل کر گھر۔ آج وہی مترا C S I R کے ڈائریکٹر ہیں۔ وہ لوگوں کو پہچانتے خوب تھے۔ کیمسٹری کے شعبہ میں، ریڈر اور صدرِ شعبہ کی حیثیت سے اس وقت ڈاکٹر عمر فاروق کام کر رہے تھے، پروفیسر شپ کے امیدوار تھے۔ لندن کے امپریل کالج کے پی ایچ۔ ڈی تھے، لیکن وہاں سے واپس آنے کے بعد حسبِ روایتِ علی گڑھ، کوئی تحقیقی کام نہیں کیا تھا۔ دن رات تاش کھیلتے، گپ مارتے یا حقہ پیتے۔ انھوں نے سُن رکھا تھا کہ ذاکر صاحب تحقیق کرنے والے کے بڑے قدرداں ہیں۔ چنانچہ اپنے چند اسکالروں کو حکم دیا کہ لیبارٹری میں گئی رات تک کام کرتے رہا کریں۔ اِدھر سے جب بھی گذر ہوتا ساری فیکلٹی آف سائنس میں تاریکی چھائی ہوتی لیکن کیمسٹری کا شعبہ جگ مگ کرتا ہوتا۔ ذاکر صاحب کے بھی نوٹس میں یہ بات آئی۔ معاملہ کی تہ تک پہنچ گئے اور کہنے لگے "آجکل کیمسٹری کے شعبہ میں ہر شب چراغاں ہوتا ہے"۔ بات عمر فاروق صاحب کے کانوں تک پہنچ گئی۔ بہت ناراض ہوئے اور چند ماہ کی طویل رخصت لے کر انگلستان پہنچے تاکہ اپنے فرسودہ علم کو تازہ کر سکیں۔ اس وقت میں بھی وہاں تھا۔ یہاں بھی اُن کا زیادہ تر وقت تاش بازی میں گزرتا۔ کبھی کبھی امپریل کالج کی طبیعی

چھو آتے۔ واپس آکر اپنے علم تازہ کے معرکے رشید صاحب کو سناتے (جن سے اُن کا خلوص ذاکر صاحب کے وائس چانسلر ہو جانے کے بعد بہت بڑھ گیا تھا) اور کنکھیوں سے میری جانب دیکھتے جاتے۔

غرض کہ علی گڑھ اس قسم کی اساتذہ سے بھرا ہوا تھا۔ ایک دوسری مصیبت علی گڑھ میں اقربا پروری کی تھیں مشہور صحافی آرن شوری نے ایک زمانے میں علی گڑھ کے بعض برسر روزگار خاندانوں کے شجرے شائع کیے تھے۔ جو چپراسی اور کلرکی کی جگہوں سے لے کر پروفیسری اور پرووسٹ تک کی اسامیوں کا احاطہ کرتے تھے۔ اسی سے باہمی رقابتیں اور مناقشات پیدا ہوتے تھے۔ آپ ایک کلرک کو چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے' زنجیر دور تک ہل جاتی تھی۔ برادری کا ایک پورا حلقہ بگولے کی طرح آپ کو اپنی سمیٹ میں لے لیتا تھا۔ یہ 'حرم' کے اندر کی لڑائی تھی۔ اس کے باہر کی زور آزمائی تو علی گڑھ مسلسل کرتا رہا ہے۔

اسے علی گڑھ کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ کبھی بھی اکثریت کے دل میں گھر نہ کرسکا حالاں کہ اس ادارے میں غیر مسلم طلبہ اور اساتذہ کی تعداد ہمیشہ معتد بہ رہی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ رہی ہے کہ شہر علی گڑھ' جس میں غیر مسلموں کی ۲/۳ اکثریت ہے' اور اس کے دھرم سماج اور بارہ سینی جیسے کالجوں کے طالب علم اور اساتذہ کی آنکھوں میں مسلم یونیورسٹی ہمیشہ کھٹکتی رہی' ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی اور ۱۹۴۷ء کے بعد زیادہ شدت سے۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ علی گڑھ کو سیکولر ہندوستان کا 'تصویر چہ' بنا دیا جائے۔ ان کے خیال میں مسلم اقلیت کی بقا کے لیئے یہی ایک تدبیر تھی۔ اس میں دو طرفہ تنگ نظری کی دقتیں حائل تھیں۔ ہندو سمجھتے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کا ہندوستان پر کوئی حق باقی نہیں رہا وہ یہاں سے چلے جائیں اور یا ان کی شرائط پر اس ملک میں رہیں۔ مسلمان نہ صرف دلِ ریش ریش' رکھتا تھا اسے اب خاک وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا سمجھنے میں تامل تھا۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین دونوں کو اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا لیکن اس کے ساتھ وہ اسی غلو کے ساتھ خود کو ہندوستانی بھی سمجھتے تھے۔ اس اندازِ نظر کے تضادات اس وقت اور منقح ہو جاتے ہیں جب بابائے پرشوتم داس ٹنڈن جیسے لوگوں سے پڑتا ہے جنھوں نے ایک بار اردو کے

حوالے سے، ذاکر صاحب کی قوم پرستی کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا تھا۔ اسٹریچی ہال کے ایک جلسے میں اس سلسلے میں ذاکر صاحب کا جواب اور جلال دونوں دیدنی تھے۔

میرے خیال میں ہندوستانی قومیت اور مسلمان کے سلسلے میں مولانا آزاد اور ذاکر صاحب کا بتایا ہوا راستہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے آج بھی صحیح ہے۔ ہمیں اس ملک میں بہر حال رہنا ہے اس لیے اس سے وفاداری بہ شرطِ استواری اپنی بقا کے لیے لازمی ہے۔ لیکن ہمیں اپنا اسلامی تشخص کو بھی (اور یہاں میں 'اسلامی' صرف محدود مذہبی معنوں میں نہیں بلکہ وسیع ترین تہذیبی اور تاریخی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں) قائم رکھنا ضروری ہے۔ اس کے لیے ہمیں ہندوؤں کے اچھے اور دانشمند طبقے کا اعتماد حاصل کرنا چاہیئے تاکہ رجعت پسندانہ قوتوں کے ساتھ نبرد آزمائی کی جاسکے۔ مسلمانوں کے ذہن کے جالوں کو جدید تعلیم کے ذریعہ صاف کرنا ہوگا۔ اسلام کے نام پر جو بہت کچھ خرافات پھیل گئی ہے، اسے دور کرنا ہوگا۔ دوسری جانب ہم وطنوں کی اپنے تہذیب و تمدّن کے ظلمت پسندانہ اور دیومالائی عناصر کی جدید تعلیم کے ذریعے اصلاح کرنا ہوگی۔ جب اصلاح کا یہ عمل دونوں طرف ہو جائے گا تو تاریخ کے کسی نہ کسی پہلو پر ہم 'سنگم' کا نقطہ ڈھونڈھ لیں گے چاہے وہ مولانا آزاد کے وحدتِ ادیان کی شکل میں ہو یا ذاکر حسین کے عالمی انسان دوستی کے نظریے میں۔

دسواں باب

'ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں'

(اقبال)

(۵۹ تا ۶۰ء)

علی گڑھ میں ترقی کی راہیں مسدود ہوئیں تو وقتی طور پر ایک نئی راہ نکل آئی۔ لسانیات کے اسکول میں میری ملاقات ڈاکٹر جان گمپرز سے ہوئی جو بنیادی طور پر لسانیات کے طالب علم تھے لیکن سماجی لسانیات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے میرٹھ کے نواح کی 'ہندوستانی' پر اس نقطۂ نظر سے کچھ کام بھی کیا تھا۔ وہ یہودی النسل جرمن تھے لیکن ان کا خاندان امریکن بن چکا تھا۔ ان سے خاصے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ ہندوستان سے واپس جا کر جب وہ Association of Asian Studies کے عہدہ دار بنے تو میں انھیں یاد رہا اور از خود انھوں نے ایسوسی ایشن کی سینئر فیلو شپ کے لیے میرا نام تجویز کیا۔ اس کی اطلاع مجھے ۱۹۵۹ء میں میسور میں ملی یہاں میں سمر اسکول میں پڑھانے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس فیلو شپ کے تحت مجھے اجازت تھی کہ اپنی پسند کی یونیورسٹیوں میں جا کر ایک ایک سمسٹر رہوں اور جس پروفیسر کے لکچروں میں چاہوں شرکت کروں۔ چنانچہ اس کے لیے میں نے ٹیکساز یونیورسٹی، آسٹن اور ہارورڈ کا انتخاب کیا۔ آسٹن میں پروفیسر اے۔ اے۔ ہل تھے جو لسانیاتی اسلوبیات کے ماہر تھے۔ ہارورڈ میں لسانیات کا کوئی خاص ماہر پیشِ نظر نہیں تھا لیکن مجھے وہاں کے السنۂ مشرقیہ کے شعبہ جات اور ہارورڈ یونیورسٹی کی لائبریری میں مخزونہ السنۂ مشرقیہ کے ذخائر سے دلچسپی تھی۔

میں نے نیویارک تک کا سفر کے۔ایل۔ایم کے ہوائی جہاز سے کیا۔ یہ میرا ہوائی جہاز سے پہلا سفر تھا۔ مجھے اس وقت تک ہوائی سفر کرنے میں جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اس زمانے میں بہت سی ہوائی کمپنیوں کے ایجنٹ علی گڑھ آتے اور یہیں بیٹھے بیٹھے بکنگ ہو جاتی۔ میرے پاس ایر فرانس کا ایجنٹ بھی آیا تھا۔ میں نے مذاق میں کہا کہ یہ تو 'ایر چانس' ہے پہنچے پہنچے، نہ پہنچے نہ پہنچے، تو خفا ہو کر چلا گیا۔ ہماری پہلی منزل قاہرہ تھی جہاں جہاز رات کو پہنچا۔ قاہرہ کے ایرپورٹ پر کھانے پینے کی اشیاء کے متعلق سے وہ تمام گندگی دیکھی جس کے لیے مشرق مشہور ہے۔ دوسری منزل روم تھی۔ روم کے ایرپورٹ پر اترنے کے لئے جب ہوائی جہاز چکر لے رہا تھا اور پرواز کے دوران وہاں کے آثار الصنادید کی جھلکیاں نظر آئیں تو بے اختیار اقبال کا یہ شعر زبان پر آگیا۔

سواد رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے   وہی عظمت، وہی عبرت، وہی شانِ دلآویزی

اطالوی یورپ کے 'باورچی' کہلائے جاتے ہیں۔ اُن کے لئے یہ ایک تحقیری کلمہ ہے لیکن قاہرہ کے بعد یہاں جو کچھ کافی کے ساتھ نوش کیا اس کا ذائقہ کام و دہن میں دیر تک رہا، اس طرح کہ کلّی کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ تیسری منزل مغربی جرمنی کا شہر فرانک فرٹ تھا۔ ایرپورٹ پر صفائی کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر وقت نوکِ زبان چاٹتے رہتے ہیں۔ یہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ مرغ اس درجہ تندرست تھا کہ چھوٹا موٹا دنبہ معلوم ہوتا تھا۔ چوتھی منزل ہالینڈ کا ایمسٹرڈم تھا جہاں K.L.M کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہاں ٹھہرنے کے لیے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ اس لیے عارضی پرمٹ دے کر شہر کی سیر کرائی گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے نیشنل میوزیم بھی گئے جہاں ازمنۂ وسطیٰ کی مصوری کے شاہکار دیکھے۔ یہ مصوری 'خطوط' سے زیادہ 'خط و خال' پر مشتمل ہے اس لیے پسند آئی۔ ڈچ عام طور پر سہ لسانی ہوتے ہیں یعنی انگریزی اور جرمن زبان بولنے پر قدرت رکھتے ہیں، اس لیے بات چیت کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

شام کو یہاں سے چل پڑے۔ صبح ہوائی جہاز سے نیویارک پہنچا۔ اسی شام ریل سے آسٹن (ٹیکساس) کا سفر اختیار کیا جو میری پہلی منزل تھی۔ آسٹن کو شمالی نیویارک سے مختلف پایا۔ یہاں لوگوں میں لاطینی نسل ہونے کی وجہ سے حسن اور لباس دونوں میں مشرقیت پائی۔ شہر بھی کھلا اور صاف ستھرا تھا۔ دریا میں یونیورسٹی شہر کی جان تھی۔

البتہ بسوں میں کالوں کے لیے علاحدہ نشستوں کی تخصیص دیکھ کر صدمہ ہوا۔

یہ امریکی مدنیت پر سیاہ داغ ہے۔

پروفیسر ہل شعبۂ انگریزی کے استاد تھے لیکن لسانیات کے ماہر تھے۔ اس زمانے میں امریکی یونیورسٹیوں میں ادب اور لسانیات کے اساتذہ میں رسّہ کشی ہو رہی تھی۔ بعینہٖ جس طرح ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں آج پائی جاتی ہے۔ خاص طور پر انگریزی ادب کے استاد اس علم کی ادب پر یلغار کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے اور پروفیسر ہل اسی میدان کے اسکالر تھے جو لسانیات کا اطلاق تفہیم ادب کے لیے کر رہے تھے۔ ادب کے اساتذہ کہتے تھے کہ ادبی تنقید نے ادب کی تفہیم کے لیے جو اصول وضع کر دیے ہیں انھیں کے ذریعے اس کی تنقیص یا تحسین کی جانی چاہیے۔ لسانیات کے ماہرین کا خیال تھا کہ ادبی تنقید کی اصلاحیں گنجلک اور مبہم ہوتی ہیں اس لیے کہ انکی تہ میں کوئی واضح لسانی تصور نہیں ہوتا۔ یونانیوں کے زمانے سے جو اصطلاحیں دہرائی جا رہی ہیں ان سے ادبی تنقید آگے نہیں بڑھی ہے۔ ذوق کے نام پر ادبی تنقید زیادہ تر تاثراتی ہوتی ہے یا عمرانیاتی علوم کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ ۱۹۵۰ء تک جدید لسانیات اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی تھی۔ بلوم فیلڈ کی معرکۃ الآرا کتاب ''زبان'' ۱۹۳۳ء میں شایع ہوئی۔ اس نے توضیحی لسانیات کا نظریاتی چوکھٹا فراہم کر دیا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد لسانیات کا اطلاق اکتساب زبان اور تفہیم ادب پر کیا جانے لگا۔ پروفیسر ہل اس وقت لسانیات کا ادب پر اطلاق کرنے والوں کے سرخیل تھے۔

جب میں پروفیسر ہل سے ان کے دفتر میں ملا تو دیکھا، دفتر کیا تھا، چھوٹی موٹی لائبریری تھی جس میں کتابوں کے شیلف چھت تک جاتے تھے جن تک پہنچنے کے لیے المونیم اسٹیل کی سبک سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ کلاس سے فارغ ہوتے تو اپنے 'دفتر لائبریری' میں طلبہ سے ملاقاتوں کے ساتھ تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے۔ علی گڑھ کے ایک وائس چانسلر سید ہاشم علی صاحب کو یہ حسرت رہی کہ یہاں کے پروفیسروں کے کمروں میں جس چیز کا فقدان ہے، وہ کتاب ہے۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ صرف دفتر کے کمروں ہی میں نہیں، یہ نایاب شے ان کے مکانوں میں بھی شاذ ملتی ہے! بعد کو معلوم ہوا کہ پروفیسر ہل کی اس سے بھی زیادہ بڑی لائبریری ان کے مکان پر تھی۔ مکان پر ہوں کہ دفتر میں، وہ ہمہ وقت اپنے علمی کاموں میں مصروف رہتے۔

پروفیسر ہل کے لکچروں میں، جن میں میں پابندی سے حاضری دیتا تھا۔ وہی پایا جس کی

مجھے تلاش تھی یعنی لسانیات اور ادب کو کس طرح ہمد گر کیا جا سکتا ہے۔ میں ادبی تنقید کی فقرے بازی اور قولِ محال سے بیزار تھا۔ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوانِ غالب"۔ "غزل اردو شاعری کی آبرو ہے"۔ جن فقروں پر لوگ سر دھنتے تھے میری سمجھ میں اُن کا مفہوم نہیں آتا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ انھیں انشا پردازی کہہ سکتا ہوں، ادبی تنقید ہرگز نہیں۔ ان سے مجھے لطف مل سکتا ہے بصیرت نہیں ملتی۔ جہاں تک قدماء کے مشاہدات کا تعلق ہے ان میں کچھ جان پاتا تھا۔ لیکن ہر سطح پر علوم کے حوالے سے ان کی نئی تشریحات کی ضرورت محسوس کرتا۔ بیان و بلاغت کی کتب میں 'حرف'، کا تصور اس طرح چھایا رہا ہے کہ 'صوت'، کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ حالاں کہ حرف تو صرف جامہ ہے' زبان کی جان تو صوت ہوتی ہے۔ صرف و نحو کی سطح پر منطق اور فلسفے نے ہماری قواعد کی جو درجہ بندی کر دی ہے اس سے ہم سرِ مو تجاوز نہیں کر سکے ہیں۔ قواعد نویسی کے ہم نے تین چوکھٹے بنا رکھے ہیں۔ (۱) یونانی۔ لاطینی (۲) سنسکرت (۳) اور عربی۔ باقی تمام جدید زبانوں کی قواعد کو ہم ان چوکھٹوں میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اوقات چوکور میں گول۔ فتح محمد جالندھری نے اپنی اردو قواعد میں عربی کے تتبع میں صیغۂ تثنیہ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے بعد لکھ دیا ہے کہ یہ اردو میں نہیں ملتا۔

غرض قواعد نویسی ہو یا عروض و بلاغت کے اُصول ہماری علمی نظر ان گہرائیوں تک نہیں جاتی جو توضیحی لسانیات نے اس صدی میں پیدا کر دی ہے۔ شعر و ادب بھی زبان سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اس کے اصول وضع کرنے میں علم زبان سے آغاز کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ لفظ و معنی کی بحث پڑا تو دیو مالا کی چھوٹ پڑتی ہے یا ہم فلسفیانہ موشگافیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ محسوس تو کر لیتے ہیں کہ شاعر "گنجینۂ معنی کا طلسم" بناتا ہے لیکن اس ترکیب کے پیچھے جس معنیاتی حقیقت سے سامنا ہے اس کی توضیح نہیں کر پاتے۔ چنانچہ یا تو "شاعری جز و الیست از پیغمبری" کہتے آئے ہیں یا "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" ہم نے زبان کے تہ نشین امکانات کو چامسکی کے وقت تک مطلق سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

چامسکی کی معرکۃ الآرا تصنیف Syntactic Structures پہلی بار ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی' جس نے جدید لسانیات کی دنیا ہی بدل دی۔ آج لسانیات کی ہر سطح صوتیات، صرف، نحو،

معنیات - پر چامسکی کا نظریہ اثر انداز ہو رہا ہے لیکن پروفیسر ہل کا تعلق بلوم فیلڈ کے 'بیوہاری' دبستان سے تھا۔ انھوں نے ابھی تک (یعنی ۱۹۵۹ء تک) چامسکی کے نقطۂ نظر کو لائق اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ اس لیے ان کی 'لسانیاتی اسلوبیات' کی اساس بلوم فیلڈ کے نظریے پر قائم تھی۔

چامسکی کے لسانی نظریے کو ماہرینِ لسانیات اس وقت تک کس قدر مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جو فرانس کے مشہور لسانیات کے ماہر پروفیسر مارتی نے مجھ سے پٹیالہ کی ایک کانفرنس میں بیان کیا تھا۔ پروفیسر مارتی نے عرصہ تک کولمبیا یونیورسٹی میں بھی لسانیات کے پروفیسر اور لنگوئسٹک سوسائٹی آف امریکہ کے نامور جریدہ "زبان" کی مجلسِ مشاورت کے رکن رہے ہیں۔ چامسکی نے Syntactic Structures کا مسودہ ایک طویل مقالے کی شکل میں لکھ کر پہلے 'زبان' میں شائع ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ 'زبان' کے کارگزار ایڈیٹر نے رائے کے لیۓ اسے پروفیسر مارتی نے کو بھیجا۔ مارتی نے اس کے سلسلے میں نہایت مختصر الفاظ میں لکھا "اس مقالے کا لسانیات سے کوئی تعلق نہیں اس لیۓ 'زبان' کے علاوہ کہیں بھی شائع کیا جا سکتا ہے۔"

چامسکی کے نظریے میں متداول لسانی نظریے سے اس قدر مغائرت تھی اور اس کی فکر پر فلسفہ اور ریاضی کا اس قدر ہجوم تھا کہ ماہرینِ لسانیات نے ابتدا میں اسے لائق اعتنا تک نہیں سمجھا۔ آئنشٹائن کو نیوٹن کے ٹھوس مادی نظریے کو رد کرنے میں اسی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ دونوں کی فکر کی اہمیت اہلِ علم پر رفتہ رفتہ آشکار ہوئی تھی۔

آسٹن میں میں نے تقریباً دو سمسٹر گزارے، اس کے بعد ہارورڈ کا رخ کیا۔ ابھی تک مجھے ہوائی جہاز سے سفر کرنے میں تکلف تھا اس لیۓ ریل کے ذریعے ساری امریکا کا چکر لگاتا ہوا۔ لاس اینجلز، سان فرانسکو، شکاگو اور نیو یارک ہوتا ہوا، ہارورڈ پہنچا۔ اپنے پہنچنے کی اطلاع پہلے سے کر دی تھی اس لیے طلبہ کی امدادی جماعت کی جانب سے میرے قیام کا بندوبست قریب میں ایک لینڈ لیڈی کے یہاں کر دیا گیا تھا۔ ہارورڈ تعلیم کی قبلہ گاہ ہے۔ اس بارے میں یہاں سے جو نکلتا ہے اسے نہ صرف امریکہ کی دوسری یونیورسٹیاں بلکہ ہندوستان تک کی جامعات اپنا لیتی ہیں۔ جنرل ایجوکیشن کی اسکیم نکلی تو علی گڑھ تک اس کی زد میں آ گیا، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ ہمارے یہاں تخصیصی تعلیم ہے کہاں۔ ہمارے یہاں تو ہر چیز جنرل ہوتی ہے! اس

تعلیم کی ضرورت تو اس سماج کو ہے جہاں تخصیصی تعلیم، بالخصوص میکانیکی تعلیم نے انسان کو کل کا پرزہ بنادیا ہو۔

ہارورڈ میں لسانیاتی لوگ بہت کم تھے لیکن دریا پار .M.I.T میں میں نوام چامسکی جیسے شہرۂ آفاق لوگ موجود تھے۔ بلوم فیلڈ کی 'بیوہاریت'، کا طلسم ٹوٹ رہا تھا اور لسانیات نئی پرواز کے لیے پر تول رہی تھی۔ ہارورڈ کے ادارے میں اس وقت مشہور عالم آئی۔ اے رچرڈز بھی موجود تھے لیکن انھوں نے اپنی تحقیقات کو اب صرف انگریزی زبان پڑھانے کے طریقوں تک محدود کر دیا تھا۔ جس شخص نے ساری عمر ادب کی ماہیت اور معنی کی معنویت سمجھنے میں گزاری تھی آخری عمر میں بچوں اور بالغوں کو انگریزی پڑھانے کے طریقوں کی ایجاد پر وقت صرف کر رہا تھا! ہارڈ ورڈ میں میں نے خود کو کسی پروفیسر یا لکچروں کے سلسلے سے وابستہ نہیں کیا لیکن اس کی مشہور آفاق لائبریری سے استفادہ کرتے ہوئے فن شعر پر بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں میرے سر میں سودا سمایا ہوا تھا کہ زبان کے نازک ترین استعمال یعنی شاعرانہ استعمال کی کنہ تک پہنچ سکوں۔ لسانیات کا مطالعہ اب میرے لیے ثانوی ہو گیا تھا۔ جب ادبی نقادوں کی لفاظی سے گھبرا جاتا تو پھر لسانیات میں غوطہ زن ہوتا۔ قدما کے علم بیان و بلاغت کے بارے میں مشاہدات اور فرمودات کو لسانی علم کی کسوٹی پر کسنے کی کوشش کرتا۔ اس میں چامسکی کے نظریے سے بہت مدد ملتی اس لیے کہ اس نے علم لسان کی آنکھیں باہر کے بجائے اندر کی جانب کر دی تھیں۔ اب 'معنی' اس قدر بے معنی، نہیں تھا جس قدر کہ 'بلوم فیلڈیوں'، نے سمجھ رکھا تھا لیکن اس کے لیے 'نفسیاتی لسانیات' پر کام کرنے کی ضرورت تھی۔ ہارورڈ ہی میں میں نے ادب اور 'مارکسزم' پر مختلف تصانیف پڑھیں جس کا نتیجہ میرے "سماج اور شعر" والے مضمون کی شکل میں نکلا جو میں نے امریکہ سے واپسی کے بعد لکھا اور جس پر بعض حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی اور سی۔ پی۔ آئی کے جریدے میں یہ تک لکھا گیا کہ یہ ڈالر بول رہے ہیں۔ حالاں کہ روبل اسی قدر جھنکار دیتے ہیں جس قدر کہ ڈالر۔ ہارورڈ کے قیام میں میری دلچسپی کا مرکز "تخلیقِ شعر" کے مسائل رہے۔ اس لیے کہ لسانیات کا اطلاق کرنے سے پہلے جاننا چاہتا تھا کہ شعر کے بارے میں ادبی نقادوں نے کیا سوچا

اور کہا ہے۔ صرف ان ادبی نقادوں کے اقوال میں بصیرت ملی جنھیں خود تخلیقِ شعر کا تجربہ تھا۔ لیکن ان کے بیانات بھی تاثراتی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی جدید لسانیات سے واقف نہیں تھا۔ مختلف اصوات کس طرح ارکانِ تہجی کی شکل اختیار کرتی ہیں اور پھر یہ ارکان کس طرح 'لفظ' کی تشکیل کرتے ہیں، ان کے دائرۂ نظر سے دور تھا۔ پھر یہ نظر نحوی ساخت میں جاکر اور اُلجھ جاتی تھی۔ معنیات کی سرحدوں پر جاکر تو ماہر لسانیات بھی ساکت و صامت ہو جاتا ہے لیکن ادبی ناقدین کی طرح وہ قیاس آرائیوں سے اجتناب کرتا ہے اور شاعر کے منتخب کردہ الفاظ پر متبادل الفاظ رکھ کر غور کرنے لگتا ہے۔

ادبی تنقید کی ایک اور اُلجھن جس سے میں اس زمانے میں دوچار تھا یہ تھی کہ جب ادبی نقاد عام بیانات پر اُتر آتا ہے تو وہ نہ اصنافِ ادب پیشِ نظر رکھتا ہے اور نہ اصنافِ شعر، شلاً ناول اور افسانہ کی حقیقت نگاری شعر کی حقیقت نگاری سے الگ ہوگی اور شعر میں بھی غنائی شاعری کے اُصولِ نقد بیانیہ شاعری یا نظم نگاری کے اصولوں سے مختلف ہوں گے۔ غنائی شاعری موسیقی سے قریب ترین ہے۔ جس طرح موسیقی کے موثر ہونے کا اندازہ 'سماجی تنقید' سے نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح غنائی شاعری کو (جس میں غزل کا اہم مقام ہے) ہمیشہ سماجی اقدار کے تابع نہیں لایا جا سکتا۔ غزل میں 'خود کاوی' کی جو کوشش ہوتی ہے اُسے شاعر کی شخصیت کے حوالے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک رِلکے، غالب یا میرؔ خود اپنی ذات' پر پیچ و تاب کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ کسی سیاسی انقلاب کا مرہونِ منّت نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں نے نقدِ شعر کو متنِ شعر اور شاعر کی لسانی مہارت کے مطالعے تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔

اب میں اپنی فیلوشپ کے اختتام پر آچکا تھا اور واپسی کے لیے پر تول رہا تھا کہ اچانک برکلے سے ڈاکٹر جان گمپرز کا خط ملا کہ کیلیفورنیا یونیورسٹی (برکلے) کے ساؤتھ ایشین ڈپارٹمنٹ کے صدر، پروفیسر بیلر کی یہ خواہش ہے کہ فیلوشپ کے اختتام پر ہندوستان واپس جانے کے بجائے میں ایک تعلیمی سال کے لیے برکلے آجاؤں اور ہندی اردو کی تعلیم کے سلسلے میں وہاں شعبے کے اساتذہ کی مدد کروں۔ میں رکنے کا خواہشمند تو تھا لیکن ایک تو شعبۂ اردو کے نئے صدر پروفیسر آل احمد سرور کے خط پر خط آرہے تھے کہ

وہاں لسانیات کے پرچوں کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے، دوسرے بیوی بچے علی گڑھ میں تھے اور امریکی سماج کی خوفناک تنہائی سے گھبرا گیا تھا اس لیے میں نے بے دلی کے ساتھ ڈاکٹر گمپرز کو لکھا کہ میں رُک جاؤں گا بشرطیکہ آپ کی یونیورسٹی میرے بیوی بچوں کے (جو اس وقت تعداد میں تین تھے) بلانے کا بندوبست کر سکے۔ میری اس درخواست پر غور کیا گیا اور میرے مشاہرے میں تھوڑی سی تخفیف کرنے کے بعد میرے بال بچوں کے سفر خرچ اٹھانے کی ذمہ داری لے لی گئی۔ اس کے بعد میں نیویارک منتقل ہو گیا۔ یہاں ڈیڑھ مہینے کے انتظار کے بعد میری بیوی دو بچوں کی انگلی پکڑ کر اور ایک کو گود میں لے کر ایک صبح ہوائی جہاز سے اتریں۔ نیویارک کے قیام میں میں نے اس شہر اور اس کے نواح کی خوب سیر کی اور وہاں کی مشہور پبلک لائبریری کو بھی کھنگالا۔ انتظار اور تنہائی کا میرے لیے یہ بڑا خوفناک تجربہ تھا۔

ع آہ اِس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

'آباد ویرانے' کا یہ تجربہ مجھ تک مخصوص نہیں تقریباً ہر ہندوستانی نے جسے چند سال یورپ یا امریکہ میں گزارنے پڑے ہیں اس کو محسوس کیا ہے۔ بعض نے اس سے نجات پانے کے لیے 'حوریانِ فرنگی' کی محبت میں پناہ لی، بعض نے مے نوشی اور مدہوشی میں۔ چوں کہ میں اقبال کی طرح (تازہ ترین تحقیق کے مطابق) دونوں سے محروم رہا، اور متاہلانہ زندگی کی آسودگی سے آشنا بھی تھا' اس لیے کام سے فراغت پا کر فرصت کا وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ بعض اوقات بلا کسی مقصد کے نیویارک کی سڑکوں یا باغوں میں مارا مارا پھرتا' وہاں بھی جی نہیں لگتا تو عجائب گھروں میں گھومتا رہتا۔ تسکین نہ ملنے کی صورت میں ذوقِ نظر آتشِ شوق کو اور بھڑکاتا۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ انسان اپنی اصل سے کٹ کر کس قدر بھیانک زندگی گزارتا ہے! یہاں فراقؔ نے سہارا دیا ؎

میں ہوں، دل ہے، تنہائی ہے
تم بھی ہوتے، اچھا ہوتا

نیویارک سے برکلے کا سفر پھر ہم نے ریل سے اختیار کیا۔ ریل سے اتنے لمبے سفر امریکہ میں عام طور پر پسند نہیں کیے جاتے۔ ریلیں تو وہاں بار برداری کا وسیلہ ہیں۔

راستے میں ٹھنڈا دودھ پینے کی وجہ سے میری چھوٹی بچی نادرہ کو شدید قسم کا نزلہ اور زکام ہو گیا۔ اسی حالت میں ہم برکلے پہنچے جہاں پہلے سے نچلے متوسط طبقے کے علاقے میں ایک کاٹیج ہمارے لیے کرائے پر لے لی گئی تھی۔ کاٹیج کے مالک کسی جونیئر کالج کے ریٹائرڈ استاد ڈاکٹر مؤر تھے۔ انھوں نے بچی کو بیمار دیکھ کر پڑوس کے ایک کلینک کا پتہ دیا جو کئی ڈاکٹروں نے اشتراک میں قائم کیا تھا۔ بچی کو فوراً لے جاکر دکھایا اس لیے کہ اُسے تیز بخار بھی ہو گیا تھا۔ تجویز ہوا کہ کلینک کے دوسرے حصے میں خون، پیشاب اور پاخانے کے ٹیسٹ کرائے جائیں۔ اس کے بعد دوا تجویز ہوگی۔ بل سیکڑوں پر پہنچ گیا۔ تیسرے روز پھر بچی کو لے کر گئے۔ اب تجویز ہوا کہ گردے متاثر ہیں۔ ان کا ایکسرے کرایا جائے۔ اس پر الگ سے گراں قدر رقم خرچ ہوئی۔ ہماری مالی پریشانی بڑھنے لگی۔ میری بیوی نے کہا مجھے تو یہ سب لوٹنے کا دھندہ معلوم ہوتا ہے۔ بچی کے نہ گردے خراب ہیں اور نہ پھیپھڑے۔ معمولی زکام ہے، البتہ غدود متاثر ہیں۔ اس لیے تیز بخار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ گھریلو معالجہ کیلئے چند اجزا خرید کر لائیں اور اُن سے جو علاج کیا تو بچی دو روز میں بالکل ٹھیک تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے دوستوں سے کہا یہاں علاج کے بجائے مرجانا سستا ہے۔ ایک ستم ظریف نے کہا کہ مرنے کے بعد اگر گڑنے کی خواہش ہے تو یہ اس سے بھی زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اندازہ ہوا کہ امریکی ذہن ہر وقت ڈالر کے چکر میں کیوں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی بات یا آدمی کو بھی ڈالروں میں تول کر بتایا جاتا ہے یعنی یہ ملین ڈالر کی بات ہے یا وہ ملین ڈالر کا آدمی ہے۔

ہمارے مالکِ مکان ڈاکٹر مؤر نہایت شائستہ اور خلیق انسان تھے۔ وہ متوسط طبقے کے ہر امریکی کی طرح محنتی اور جفاکش بھی تھے۔ ہماری کاٹیج کافی پرانی تھی اور ہر قسم کی مرمت چاہتی تھی وہ اپنے موٹر میں بڑھئی کے سارے اوزار بلکہ گھاس کاٹنے کی مشین تک لے کر آتے ہر قسم کی مرمت خود کرتے اور سامنے کے لان کی گھاس تک خود کاٹتے۔ انھیں ہاتھ کا کام کرنے میں کسی قسم کا عار نہیں تھا۔ یوں بھی امریکہ میں انسان کے ہاتھ کی بہت قیمت ہے۔ جنس سستی ہے لیکن اس میں انسان کا ہاتھ لگ جائے تو قیمت دگنی ہو جاتی ہے۔ وہاں دور کی بھی اُجرت اس قدر مقرر ہے کہ ہم اس کا سان دگمان بھی نہیں کر سکتے۔

ظاہر ہے ڈاکٹر موؤ اپنے گھر کا سارا کام کرنے بعد ہی کرائے کے مکان کا رُخ کرتے ہوں گے۔ ایک بار رات کو تیز ہوا سے، جو خلیج سان فرانسسکو کی جانب سے چلتی تھی، برآمدے کے کچھ شیشے ٹوٹ گئے۔ موؤ صاحب کو جب علم ہوا تو ایک روز موٹر میں چھوٹے بڑے شیشے، ان کو کاٹنے کی ایک کنّی اور پُڈنگ (مسالہ) لے کر آئے اور کام پر پل پڑے۔ میری بڑی بچی فریدہ کے لیے، جس کی عمر اس وقت چھ سال ہوگی، یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ وہ موؤ صاحب کے ارد گرد مسلسل گھومتی رہتی اور سوالوں کی بوچھار شروع کر دیتی، یہ خیال کر کے کہ موؤ صاحب اس کی زبان ضرور سمجھتے ہونگے۔ "ایں موؤ صاحب! یہ آپ کیا کاٹ رہے ہیں! شیشہ کیسے کٹ جاتا ہے۔ کنّی میں کیا لگا ہوا ہے وغیرہ" موؤ صاحب اس خیال سے کہ بچی اضطراب میں کہیں پاؤں شیشوں پر نہ رکھدے بار بار کہتے " Sit Down "۔ وہ بچاری موؤ صاحب کی 'دُرکی' کیا سمجھتی، سمجھی یہ ناراض ہو کر دھتکار رہے ہیں۔ ماں کے پاس باورچی خانے میں دوڑی ہوئی گئی اور کہا "امّی! امّی! موؤ صاحب مجھ سے کہہ رہے ہیں "ڈنڈالاؤں"۔ دیکھئے، تقلیبِ صوت کے اعجاز نے کسی طرح ایک بچّی کی سماعت کے لیے "سِٹ ڈاؤن" کو "ڈنڈالاؤں" میں تبدیل کر دیا! جب میں نے موؤ صاحب کو یہ لطیفہ سُنایا تو فریدہ کو پیار کرتے جاتے اور ہنس ہنس کر لوٹ جاتے تھے بار بار پیار سے کہتے "ڈنڈا لُو، ڈنڈا لُو"۔

برکلے میں میں نے اُردو ہندی کی تدریس کے ساتھ اپنی دلچسپی کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ امریکن یونیورسٹیوں میں کتب خانوں میں جو سہولتیں ہیں وہ قابلِ رشک ہیں۔ کونسی کتاب ہے جو وہاں موجود نہیں۔ اور جو موجود نہیں وہ منگا دی جاتی ہے۔ کتب خانوں کا عملہ عبادت کے طور پر آپ کی خدمت کرنے کو تیار رہتا ہے۔ غرض کہ ایسا ماحول ہوتا ہے کہ پڑھنے لکھنے کو خود بخود جی چاہتا ہے۔ کتب کی فراہمی کے علاوہ جدید فوٹو گرافی کی تیکنک سے جس قدر سہولتیں پیدا کی جا سکتی ہیں وہ بھی سب موجود تھیں۔ میں نے برکلے کی لائبریری میں فوٹو فلموں کی شکل میں مسلم لیگ پر ایسا مواد بھی دیکھا جو ہندوستان تک میں دستیاب نہیں۔ یہ مواد غالباً کسی ایسے ریسرچ اسکالر کی فرمائش پر مہیا کیا گیا تھا جو مسلم لیگ کی تحریک پر کام کر رہا تھا۔ مشہور روزناموں کی فلمیں الگ تھیں ان کا ایک علاحدہ سیکشن تھا۔

مجھے شعبے کی جانب سے عبرانی کے ایک پروفیسر کا جو طویل رخصت پر ملک سے باہر گئے ہوئے تھے، کمرہ دیا گیا۔ اس سے ملحق عربی کے ایک استاد کا جن کی شہرت مصر تک پھیلی ہوئی تھی کمرہ تھا۔ امریکی یونیورسٹیوں میں حسنِ خدمت پر سبکدوش اساتذہ کا نہ صرف احترام کیا جاتا ہے بلکہ اگر ان میں سے کسی میں دَم خم باقی رہ گیا ہو تو انھیں وہ تمام سہولتیں دی جاتی ہیں جو دیگر اساتذہ کو حاصل ہوتی ہیں۔ وہ شعبے کے عربی کے استاد ڈاکٹر برنر کے استاد تھے اور میں دیکھتا تھا کہ ڈاکٹر برنر ان کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا ان کا احترام امریکی کلچر کی دین تھی یا اُس کا ماخذ دور مشرق کی سرزمین کی برکت تھی اس لیے کہ دونوں یہودی النسل امریکی تھے۔ پیرانہ سالی کے باوجود ان میں حوصلۂ قلم و رقم اب تک باقی تھا۔ پابندی سے آتے اور اپنا علمی کام کرتے۔ ان کے کمرے میں کتابوں کا اس قدر انبار تھا کہ شلیف چھت تک پہنچتا تھا اُن تک رسائی کے لیے الومنیم اسٹیل کی سبک سیڑھی تھی۔ میں ہمیشہ اُن سے اس خدشے کا اظہار کرتا کہ کہیں وہ چڑھنے میں گر نہ پڑیں۔ کہتے کہ نہیں میرے پیروں میں دَم خم ہے۔ انھوں نے ایک بار مجھ سے کہا کہ "میں نے آپ سے زیادہ خاموش پڑوسی آج تک نہیں دیکھا۔" میں نے جواب دیا ؏

فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے

پھر اس مصرع کا مطلب سمجھایا تو بہت خوش ہوئے۔ یہ نہیں بتایا کہ اقبالؔ نے یہ مصرع مسولینی کے لیے کہا تھا۔

پروفیسر موصوف شعبے کے عربی کے استاد اور میرے عزیز دوست مسٹر برنر کے استاد تھے جو ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ دونوں یہودی تھے۔ شعبے کے صدر مسٹر بیلر تھے لیکن ان کا تعلق کسی ہندوستانی زبان سے نہیں تھا۔ صرف ڈاکٹر جان گمپرز کو ہندوستان اور ہندوستانی زبانوں سے دلچسپی تھی۔ اتفاق سے وہ بھی یہودی تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی امریکہ کی مالیاتی دنیا ہی پر نہیں علمی دنیا پر بھی کس طرح چھائے ہوئے ہیں۔

برکلے سے ملا ہوا سان فرانسکو کا اُم البلاد ہے جو مشرق کا نیویارک ہے۔ لیکن جب کہ نیویارک ہلکے رنگوں اور دھندلکوں کا جہان ہے سان فرانسکو نیلے آسمان اور نیلگوں

سمندر کا سوادِ اعظم رکھتا ہے۔ موسم کے لحاظ سے بھی یہ نیویارک سے بہتر ہے اور چوں کہ کیلیفورنیا کو امریکہ کا کشمیر کہا جاتا ہے، فواکہات کی کثرت، موسم کی تازگی اور شہر اور قصبوں کی صفائی دیکھ کر اقبال کا یہ مصرع یاد آتا تھا ع

افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کے مانند

دودھ کی ندیاں، شہدِ ناب کی بہتات، مشروبات کی کثرت، کام و دہن کی آزمائش کے لیے کیا کچھ نہ تھا۔ مرغ کا گوشت سب سے سستا پایا، چنانچہ ہم لوگوں نے زیادہ تر اسی کو آزمایا۔ بچے اس آزمائش سے اس قدر عاجز آ گئے تھے کہ جب ثابت مسور کی دال (بس یہی دال وہاں ملتی تھی) پکتی تھی تو من و سلویٰ سمجھ کر کھاتے۔ میں یونیورسٹی کے کیمپس سے نکلتے وقت پاس کے ریستوران سے المونیم فوائل میں لپٹا ہوا بجلی کے ہیٹر پر بھنتا ہوا ایک مرغ شام کے کھانے کے لیے ضرور خرید لیتا۔ وہ گھر پہنچنے پر بھی بھبکتا ہوا نکلتا۔ بچے اس پر بھی راضی نہیں تھے۔ دودھ سے بھی سیر ہو گئے تھے۔ البتہ آئس کریم شوق سے کھاتے۔ یہی حال پھلوں اور ان کے عرق کا تھا۔ ہر چیز سے نیت بھر گئی تھی۔ گھر کا ہر فرد اس غذا پر سرخ سفید ہو گیا تھا۔ اس وقت تک میں 'کولسٹرول' وغیرہ کی تباہ کاریوں سے واقف نہیں تھا۔ اتفاق سے ہندوستان آنے سے چند ہفتے قبل میں نے صحت کی انشورنس کے تحت اپنا میڈیکل معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر نے تہدید کی کہ مسٹر حسین آپ کے خون میں شکر بہت بڑھ گئی ہے، وزن بھی زیادہ ہے۔ آپ اب احتیاط شروع کر دیجیے۔ پھر کچھ ہدایات اور دوائیں لکھ کر دیں اور کہا ہندوستان پہنچ کر ہر تین مہینے پر اپنا طبی معائنہ کراتے رہیے۔ جتنا کھایا پیا تھا یہ سن کر سب نکل گیا۔ واپس آنے کے بعد اپنے 'خون' سے کشاکش کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تا حال جاری ہے۔ جب بھی کوئی شیرینی پیش کرتا ہے خود کو 'نمک خوار' بتا دیتا ہوں۔

اپنے بڑے بچے جاوید کے سلسلے میں مجھے امریکن اسکولوں کے تعلیمی نظام کا بھی تجربہ ہوا۔ اس کی عمر دس سال کے قریب تھی۔ ہماری خواہش تھی کہ اس کا تعلیمی سال ضائع نہ ہو، اس لیے پڑوس کے ایک اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ ظاہر ہے اس کی انگریزی بہت کمزور تھی اس لیے وہ کلاس میں بے جان سا خاموش بیٹھا رہتا اور ٹیچر دل کے

سوالات کا جواب نہیں دے پاتا۔ چند ہفتوں کے بعد مجھے اس کے کلاس ٹیچر نے اسی کے ہاتھ رقعہ بھیجا جس میں یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ان سے جاکر اسکول میں ملوں۔ گیا تو انھوں نے نہایت تشویشناک لہجے میں کہا "مسٹر حسین، آپ کا بچہ نارمل نہیں ہے۔" دریافت کرنے پر تفصیلات بتانے لگیں، اور نفسیات کے کسی ماہر کے پاس لے جانے کے لیے کہا۔ میں صورتِ حال کو فوراً سمجھ گیا کہ جاوید کے بارے میں یہ اسی انداز میں سوچ رہی ہیں جس طرح ہمارے برکلے پہنچنے پر وہاں کے ڈاکٹروں نے میری چھوٹی بچی کے معمولی سے زکام کا بتنگڑ بناکر آدھے درجن ٹیسٹ بنا دیئے تھے۔ میں نے کہا آپ تشویش نہ کریں اور مجھے پرنسپل صاحبہ سے ملنے کا موقع دیں۔ چند روز میں اُن سے ملاقات کا وقت مقرر ہوگیا۔ گیا تو وہ مجھے زیادہ سمجھدار اور معقول نظر آئیں۔ میں نے کہا جاوید بالکل نارمل بچہ ہے۔ اس کی 'ایب نارمل' حرکتوں کا تعلق انگریزی زبان کی استعداد کم ہونے کی وجہ سے ہے۔ دو تین مہینوں میں دیکھیے گا وہ کلاس میں چل نکلے گا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ اس کے بعد پھر اس کی کوئی شکایت نہیں آئی۔ امریکہ کے ڈاکٹروں کا تجربہ تھا ہی، ان کے تعلیمی نظام کا یہ تجربہ مزید ہوا تو بے ساختہ زبان سے نکلا ؏

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا

البتہ اس قدر ضرور کہونگا کہ باوجود بعض خرابیوں کے (مثلاً ہر امریکن بچے کا خط خراب ہوتا ہے) امریکی سماج اپنے بچوں کو مستقبل کی دولت سمجھ کر عزیز رکھتا ہے۔ یہ صورت چاہے خاندان میں نہ ہو (جہاں ہر تین شادیاں ایک طلاق پر ختم ہوتی ہیں) لیکن سماج اور حکومت کی نظر میں ضرور ہے۔ میں نے دیکھا اسکولوں کے چاروں طرف سڑکوں پر آہستہ موٹر چلانے کی ہدایات لگی ہوتی ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ان پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں خفیہ پولیس کے لوگ 'اسپیڈ' کی شناخت کے لیے باریک تار سڑکوں پر ڈالے ہوئے دور بیٹھے رہتے ہیں۔ ان تاروں پر سے موٹر گذرتے ہوئے اپنی رفتار بتا جاتی ہے اور قانونی کارروائی کے لیے اس موٹر کا نمبر فوراً نوٹ کر لیا جاتا ہے۔

سماجی احساس کی ایک اور مثال کا واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ جاوید کے اسکول کے سامنے بچوں کے کھیلنے کا میدان تھا۔ جہاں ایک دن پڑوس کا کتا آ گیا۔ بچوں کو

فٹ بال کے ساتھ اچھلتے کودتے دیکھ کر وہ بھی اُچھلنے لگا۔ اِس اُچھل کود میں اتفاق سے اس کا دانت جاوید کی ٹانگ میں لگ گیا۔ بس پھر کیا تھا اسکول اور محلّے دونوں میں کہرام مچ گیا۔ ٹیلیفون کھڑکھڑانے لگا۔ ایک خاتون نے (جو کتّے کی مالکہ تھیں) پہلے تو ہم سے معافی مانگی، اس کے بعد یقین دلایا کہ ان کے کتّے کے ٹیکا لگا ہوا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس سلسلے میں میڈیکل ایڈ پر جو بھی خرچ ہو اُسے وہ برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ سماجی ذمہ داری کے احساس کی یہ انتہا تھی۔

برکلے میں سال بھر گذارنے کے بعد بالآخر وطن کو واپسی کی تیاری ہونے لگی باوجود نعمتوں اور راحتوں کے واپسی کی خوشی تھی اور اقبال کا یہ شعر وردِ زبان رہتا ؎

فرنگ میں کوئی دن اور مَیں ٹھہر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

میرے خیال میں اقبال ہی نہیں اِس ذہنی کیفیت سے قیامِ فرنگ میں ہر ہندوستانی گزرتا ہے۔ "وہ مشتِ خاک" جس سے وطن عبارت ہے اور جس کے بدلے میں حالؔی نے 'بہشت' تک لینے سے انکار کیا ہے 'مشتِ خاک' نہیں 'طرزِ حیات' ہوتا ہے جس کے باہر انسان زیادہ دنوں تک خوش نہیں رہ سکتا۔ یہ کبھی تنہائی بن کر ستاتا ہے اور کبھی دوری کی شکل میں کاٹتا ہے۔ میرے ان تاثرات کا دھندلا سا عکس اس غزل میں دیکھئے، جو میں نے قیامِ امریکہ کے پہلے سال میں لکھی تھی جب میں تنہا تھا:

ترے دیار میں کوئی بھی ہم زباں نہ مِلا
ہزار نقش ملے، کوئی رازداں نہ مِلا
میں سوچتا ہوں کہ یہ بھی حسین ہیں لیکن
تصوّرِ رُخِ جاناں کا امتحاں نہ مِلا
یہ سچ نہیں ہے کہ چھُٹنے کے بعد جانِ وصال
تجھے زمیں نہ ملی، مجھ کو آسماں نہ مِلا

ادائے خاص ملی اور صلائے عام ملی
مگر کہیں بھی وہ اندازِ جانِ جاں نہ مِلا
گداشناسیٔ اہلِ کرم مُسلّم ہے
ہم اُٹھ کے جس کے قدم لیں وہ پاسباں نہ مِلا
جہاں بھی دیکھا وہیں پایا تجھ جانِ جمال
تری نگاہ کا پرتو، کہاں کہاں نہ مِلا
وہ دل ہی کیا جو محبت سے آشنا نہ ہوا
سفینہ کیا وہ جسے بحرِ بیکراں نہ مِلا
کسے سُنائیں غزل بہر شرحِ دلِ مسعود
کہ اس دیار میں کوئی بھی نکتہ داں نہ مِلا

(امریکہ اکتوبر ۵۷ء)

چنانچہ ہم سب ہندوستان لوٹنے پر خوش تھے۔ پھر طے کیا کہ سفر خشکی اور سمندر سے کیا جائے، حالاں کہ ہمیں ہوائی جہاز سے سفر کرنے کی اجازت تھی اور اس کے ذریعے ہم دو روز کے اندر پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ برکلے سے نیویارک تک کا سفر پھر ریل سے طے کیا۔ نیویارک سے کوئن میری (جو اب معطل ہو چکا ہے) برٹش کمپنی کا جہاز لیا۔ جہاز کیا تھا سمندر پر تیرتا ہوا شہر تھا۔ اس کے عرشے، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، ایسا معلوم ہوتا تھا آپ کسی پانچ ستاروں کے ہوٹل میں آگئے ہیں۔ تینوں بچوں سمیت کھانے کے لیے دونوں وقت ہم لوگ ڈائننگ روم جاتے۔ چوں کہ میری بیوی کو ذبیحہ کا بہت خیال رہتا تھا اس لیے روز مچھلی کی فرمائش ہوتی۔ چنانچہ انگریز بیرا، جو غیر معمولی طور پر مسخرا تھا، ہمیں دیکھتے ہی کہتا "فش اینڈ چپس" آرہے ہیں۔ 'چپس'، کا اشارہ ظاہر ہے تینوں بچوں کی جانب ہوتا۔ ہفتہ بھر میں بحر اوقیانوس پار کر کے لندن پہنچ گئے۔ وہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا پہلے سے انتظام تھا۔ بال بچوں کو تین روز تک لندن کی سیر کرائی۔ ایک فریج اور کچھ چھت کے پنکھوں کی خریداری کی اور بحری جہاز سے بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔

میں دس برس پہلے لندن میں سال بھر رہ چکا تھا۔ اس وقت لندن، دہلی

اور بمبئی کے مقابلے میں ایک نہایت عمدہ شہر معلوم ہوا تھا۔ امریکہ سے واپسی پر یہاں کی ہر چیز گھٹیا لگی۔ بچوں کے لیے دودھ لینے، وہ کم تر، ریستوران میں کھانا کھایا وہ گھٹیا ملا۔ غرض کہ امریکی معیار سے ہر چیز کو فروتر پایا۔ وہاں سے سوئے مشرق روانہ ہوئے تو جہاز ہی سے بمبئی کی خوشبو آنے لگی: بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ لندن اس سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ یہاں کی تو ہر چیز بد سے بدتر تھی، لیکن یہ احساس کہ — اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے! — زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔

بمبئی میں معلوم ہوا اس روز ریلوں کی اسٹرائک تھی۔ ہم نے ہوائی جہاز کے سفر کے بدلے میں فرسٹ کلاس ایر کنڈیشنڈ کا ریزرویشن کرایا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک گاڑی میں جگہ ملی۔ ساری گاڑی کو خالی پایا۔ سروس کی قلت اور تنہائی کے خوف سے فرسٹ کلاس میں تھرڈ کلاس کا لطف آیا!

گیارھواں باب

دکھن ملک بھوتیچ خاصا اہے (وجہی)

(۶۲ تا ۶۶۸)

علی گڑھ واپس آکر میری بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ میرے لیے ترقی کے راستے مسدود تھے۔ موجودہ صدرِ شعبہ، پروفیسر آل احمد سرور مجھ سے عمر میں صرف سات سال بڑے تھے جیسا کہ اشارہ کر چکا ہوں وہ شعبہ میں لسانیات کی دوسری پروفیسری کے لیے بہت زیادہ خواہش مند بھی نہیں تھے۔ میری امریکہ کی غیر حاضری میں انھوں نے لسانیات کی ایک ریڈر شپ حاصل کر لی تھی۔ اب ان کی خواہش تھی کہ میں اس پر چلا جاؤں تاکہ میری ریڈری پر ڈاکٹر محمد عزیز کا تقرر کیا جا سکے، جو ابھی تک لکچرر تھے۔ میں ڈاکٹر عزیز صاحب کا بڑا احترام کرتا تھا اس لیے کہ وہ اللہ کے ایک نیک بندے تھے۔ لیکن میرے ساتھ جو بے انصافی ہو رہی تھی (جس کا چرچا علی گڑھ میں عام تھا) اس کے پیشِ نظر میں نے اس منتقلی سے انکار کر دیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نئی ریڈری پلان کی پوسٹ تھی اور میرا تقرر شعبے کی سب سے پرانی ریڈری رشید احمد صدیقی صاحب کی جگہ پر ہوا تھا۔ میں اس انکار کے بعد خوش ہوں، کہ ڈاکٹر عزیز صاحب کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ کسی نہ کسی تاویل کے ذریعے لسانیات کی ریڈری پر ان کا تقرر کر دیا گیا، حالاں کہ عزیز صاحب اور میں دونوں، اس بارے میں متفق تھے کہ ان کی ترقی کا سب سے آسان طریقہ یہ ہو تاکہ مجھے لسانیات کی پروفیسری قائم کر کے اس پر

ترقی دے دی جاتی اور ان کا تقرر میری جگہ پر ہو جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ پروفیسر شپ قائم کرنے کی تجویز اکیڈمک کونسل میں پیش بھی ہوئی تھی لیکن چوں کہ صدر شعبہ کی مرضی نہیں تھی اس لیے ریڈری میں تبدیل کر دی گئی۔

میں اب علی گڑھ سے غیر مطمئن تھا۔ اور نظریں اِدھر اُدھر دوڑانے لگا تھا۔ اس زمانے میں پروفیسری بڑی مشکل سے ملتی تھی، ایک تو یہ بہت کم تھیں۔ دوسرے مقابلہ بہت سخت تھا۔ حسنِ اتفاق پروفیسر عبدالقادر سروری کسی کام کے سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے۔ ان سے مجھے نیازمندی حاصل تھی اور وہ میرے کام کے قدر داں تھے۔ جب وہ پونا کے سمر اسکول میں بحیثیت طالب علم آئے تھے تو اس وقت انھوں نے مجھے استاد کی حیثیت سے بھی دیکھا تھا، بلکہ اردو داں ہونے کے باعث ڈاکٹر کاترے نے انھیں صوتیات کے اس گروپ میں رکھا تھا جسے میں پڑھا رہا تھا۔ انھوں نے مجھے جونیئر سمجھ کر درخواست دی کہ انھیں ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی کے گروپ میں منتقل کر دیا جائے۔ ڈاکٹر کاترے اس پر برہم تھے کہ ایک اُردو کا آدمی اور بنگالی کے گروپ میں جانا چاہتا ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ڈاکٹر کاترے سے پُرزور سفارش کی کہ ان کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے انھیں چٹرجی کی کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے۔ ڈاکٹر کاترے ناراض اِس بات پر تھے کہ وہ ایک نئے علم کی واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جونیئر سینیئر کے چکّر میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے بہرحال، ہمارے معاشرے میں حفظِ مراتب کی جو روایت ہے، اس کا حوالہ دے کر انھیں قائل کر لیا اور قبل اس کے کہ وہ میری کسی کلاس میں شرکت کر سکیں، ان کے نام کا چٹرجی کے رجسٹر میں اندراج ہو گیا۔ میں نے اس راز کو سروری صاحب پر کبھی افشا نہیں کیا۔

بہرحال علمی اعتبار سے وہ میرے قدر داں تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کے اس بار کے سفر میں برسبیلِ تذکرہ اپنے ریٹائرڈ ہونے کا تذکرہ کیا اور بالواسطہ انداز میں یہ جاننا چاہا کہ آیا میں حیدرآباد آنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں نے ہامی بھر لی۔ چند مہینوں کے بعد ان کا خط ملا جس میں اردو کے شعبے کی پروفیسری کے اعلان کا تراشہ اور ساتھ میں درخواست

کا فارم ملفوف تھا۔ میں نے نہایت بے دلی کے ساتھ اسے بھر کر بھیج دیا۔ فروری ۶۲ء میں اچانک رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی کے یہاں سے مجھے انٹرویو کی اطلاع ملی اور میں دکن کے لیے پابہ رکاب ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو میرے بڑے بھائی امتیاز حسین خاں ششدر رہے۔ ساری عمر وہاں گزارنے کے بعد بھی وہ عثمانیہ یونیورسٹی کی ملازمت کو نہ معلوم کیوں، میرے لیے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرے دن میں اپنی تصانیف کا پلندہ اٹھائے، سوٹ پہنے انٹرویو کے لیے آرٹس کالج کی سنگین عمارت میں پہنچا جہاں وائس چانسلر کا دفتر تھا۔ دفتر سے ملحق ایک کمرے میں امیدواروں کو بٹھایا گیا تھا۔ خاص خاص امیدواروں میں دو عثمانیہ کے تھے یعنی ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر رفیعہ اور ایک میری طرح باہر کے یعنی ڈاکٹر گیان چند جین، جو اس وقت بھوپال سے آئے تھے۔ میں غالباً چوتھے نمبر پر بلایا گیا۔ اندر جا کر دیکھتا ہوں تو سروری صاحب کے علاوہ پروفیسر اعجاز حسین اور پونا کے شری بھگوت دیال ورما موجود تھے۔ شری ورما پونا کے ایک کالج میں اردو فارسی کے استاد تھے اور یہ حسن اتفاق تھا کہ چند سال قبل وہ لسانیات کے سمر اسکول میں میرے طالب علم کی حیثیت سے شرکت کر چکے تھے۔ صدر انتخاب کمیٹی وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ ریڈی تھے۔ پرنسپل اور ڈین کی حیثیت سے پروفیسر عبدالقادر نے شرکت کی جو میرے بڑے بھائی کے دوست تھے۔ مجھے اپنے منتخب ہو جانے کی قوی امید ہو گئی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں ابھی باہر نکل کر اپنے کاغذات ٹھیک ہی کر رہا تھا کہ ایک کلرک آیا اور مجھ سے کہا "صاحب (مراد وائس چانسلر) کہہ رہے ہیں کہ آپ ابھی نہ جائیں" اور لوگ جو کمرے میں تھے انھوں نے نتیجہ کو بھانپ لیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے پھر طلب کیا گیا اور ڈاکٹر ریڈی نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں عثمانیہ جوائن کرنے میں کتنا وقت لوں گا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک آدھ مہینے میں آ جاؤں۔ لیکن میں نے کہا کہ علی گڑھ کا کورس نا تمام پڑا ہے، اس کے بعد امتحانات ہوں گے اس لیے مجھے جون تک مہلت دی جائے، اس وقت تک عثمانیہ یونیورسٹی تعطیلاتِ گرما کے بعد کھل جائے گی۔

شام تک اردو کے نئے پروفیسر کے انتخاب کی خبر عام ہو گئی۔ میں سروری صاحب کے یہاں جا کر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب سے ملا تو انھوں نے بڑے مزے لے لے کر

گیان چند صاحب کی اُمید واری کا قصہ سنایا۔ کہا جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہوگا یہ الٰہ آباد کے طالب علم رہے ہیں لیکن وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے ہمیں کبھی نہیں پوچھا۔ اب جو انھیں اس انتخاب کمیٹی کے رکن ہونے کی خبر ملی تو اچانک میرے پاس خط آیا اور مجھے کسی زبانی امتحان کے لیے بھوپال آنے کی دعوت دی جہاں وہ اس وقت حمیدیہ کالج میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ میں نے بھی یہ خیال کیا کہ حیدرآباد تو جانا ہے ہی ایسی تاریخ دی کہ میں بھوپال ہوتا ہوا حیدرآباد پہنچوں۔ چنانچہ بھوپال میں امتحان لیا اور جب حیدرآباد کے لیے روانہ ہوا تو وہ بھی امیدوار کی حیثیت سے میرے ہم سفر تھے۔

شام کو ورما صاحب سے بھی ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنی معمولاً نیاز مندی سے کہا "آپ سے بہتر اور کون شمانیہ کو مل سکتا تھا۔ میں نے تو صرف حقِ شاگردی ادا کیا ہے۔" میں ان کے یہ کہنے پر رلشہ خطمی تھا، حالاں کہ خوب جانتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے پروفیسر نہیں تھے بلکہ پونا کے ایک کالج کے استاد تھے!

دو روز کے بعد جب علی گڑھ کے لیے واپسی کا سفر اختیار کیا تو اتفاق سے اپنا ہم سفر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کو پایا۔ اسی سفر میں انھوں نے مجھے گیان چند صاحب کے ہم سفر ہونے کا قصہ سُنایا تھا۔

جون ۶۲ء میں حیدرآباد پہنچ کر سروری صاحب سے شعبۂ اردو کا چارج لیا۔ وہ اس وقت توسیعِ ملازمت پر چل رہے تھے۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ریڈی شعبے میں ان کی کارگزاری سے زیادہ خوش نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ میں جلد از جلد حیدرآباد پہنچ جاؤں۔ میں وہاں تنہا پہنچا تھا اور اپنی ہمشیرہ کے ساتھ ریڈ ہلز (لال ٹیک) میں مقیم تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میری بیوی بھی بال بچوں کو لے کر آگئیں۔ چند ہفتے لال ٹیک میں مزید قیام کرنے کے بعد میں اُڈیکمیٹ میں یونیورسٹی کے مکان میں منتقل ہو گیا جو ڈاکٹر ریڈی کی عنایت سے مجھے الاٹ ہو گیا تھا۔ یہ مکان کسی زمانے میں ایک جاگیردار نے شہر سے باہر موسمِ گرما گزارنے کے لیے بنوایا تھا۔ سامنے کی زمین میں جہاں موجودہ انجینیرنگ کالج ہے، اس کا آموں کا باغ تھا۔ مکان میں مکانیت بہت کم تھی صرف دو بڑے کمرے اور ایک بہت بڑا ہال تھا جو غالباً رقص وسرود کی محفلوں

کے کام آتا ہوگا۔ اس کا رو کار عظیم تھا، رومن فنِ تعمیر کے اونچے ستون اور کشادہ سرِ در تھا۔ ڈاکٹر ریڈی جب کبھی شہر جاتے ہوئے اس طرف سے گزرتے تو مجھ سے بعد کو ضرور کہتے "نواب کا محل معلوم ہوتا ہے"۔ میں کہتا "جی ہاں! صرف باہر سے" میرا اصل مسئلہ اس 'محل' کے لئے فرنیچر اور اسباب آرائش فراہم کرنے کا تھا جو میں اپنے قیام کی چھ سالہ مدت میں بھی نہ کر سکا۔ مکان مل جانے کے بعد مجھے بچوں کے داخلے کی فکر ہوئی۔ جاوید علی گڑھ سے ساتواں درجہ پاس کر کے آیا تھا، اُسے مسعود یزدانی صاحب کی بیگم صاحبہ کی سفارش سے حیدرآباد کے ایک اچھے اسکول، گرامر اسکول، میں داخلہ مل گیا۔ دونوں بڑی بچیاں۔ فریدہ اور نادرہ ۔ لڑکیوں کے مشہور محبوبیہ اسکول داخل ہو گئیں۔ اِس اسکول کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ نظام شاہی میں جاگیردار گھرانے کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا اور یہاں سے لڑکیاں مردانہ بولی ۔ میں جاتا ہوں، میں جاؤں گا۔ کہتی ہوئی نکلتیں۔ میں نے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا بولی ٹھولی کا یہ انداز مغل شہزادیوں سے نکلا تھا جن کی بلوغت کی عمر پہنچنے تک لڑکوں کی طرح تربیت کی جاتی تھی، بغیر دوپٹے کا لباس، گول کامدار ٹوپی اور کھڑا پاجامہ ان کا لباس ہوتا۔ گھڑسواری کی تربیت دی جاتی۔ وہ مردانہ بولی بولتیں اور ان کو بیٹی کے بجائے 'بیٹا' سے بلایا جاتا۔ آج بھی ہم لاڈ میں بیٹی کو 'بیٹا' کہہ دیتے ہیں۔

حیدرآباد پہنچنے کے دو مہینے کے بعد ہی میرے آخری 'بیٹا' (یعنی بیٹی زیبا) کی پیدائش ہوئی۔ صحت اور وزن کے لحاظ سے بھی وہ 'بیٹا' معلوم ہوتی تھی۔ ساڑھے بارہ پاؤنڈ وزن، موٹے موٹے ہاتھ پاؤں۔ لیڈی ڈاکٹر زبیدہ اس کو فخریہ اپنے کلینک میں آنے والوں کو دکھاتیں۔ کچھ عرصے تک اس کی ولادت کے چکر میں رہا۔ اس سے فارغ ہو کر شعبہ کی جانب متوجہ ہوا۔ ڈاکٹر ریڈی نے دورانِ گفتگو اس سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا۔ در اصل انتشار و افتراق اس شعبے کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا جو ڈاکٹر محی الدّین قادری زورؔ اور پروفیسر عبدالقادر سروری کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے کھلی جنگ میں تبدیل ہو چکا تھا، اور ہر وائس چانسلر کے لئے دردِ سر بنا رہا۔ ڈاکٹر ریڈی کا خیال تھا کہ اب اس شعبے کو کسی 'غیر ملکی' (بیرونِ حیدرآباد کا) کے سپرد کرنا چاہیئے تاکہ اس کی پارٹی بندی ختم ہو۔ شعبے کے اساتذہ میں سب سے سینئر

ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ تھیں جو بحیثیت ریڈر مرکزی شعبے میں کام کر رہی تھیں۔
زینت ساجدہ ویمنس کالج کی اچھی استاد سمجھی جاتی تھیں۔ ہمدرد اور پُرخلوص خاتون تھیں۔
لیکن مزاج کا یہ عالم تھا ع کی بات جس سے اُس نے شکایت ضرور کی۔ ڈاکٹر حفیظ مرنجاں مرنج، جسمانی
اعتبار سے ٹھُس مگر کلاسیکی ادب میں ٹھوس قابلیت کے آدمی تھے۔ ان کا معرکتہ الآرا تحقیقی کام
وہ چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ 'معراج العاشقین' خواجہ بندہ نواز کا رسالہ
نہیں، ان کے کئی سو سال بعد کسی دوسرے اہلِ تصوف نے تصنیف کیا تھا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،
پروفیسر سروری صاحب کی ترجیحی فہرست میں نمبر ایک تھی۔ انھیں کے ساتھ انھوں نے "اردو
نثر کا ارتقا" اپنا تحقیقی مقالہ تصنیف کیا تھا، جسے حوالے کی کتاب سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے بعد
وہ کوئی خاص کام نہ کر سکیں۔ وہ خاطر تواضع کرنے اور تعلقات بڑھانے میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ ان
کے پاس توصیفی کلمات کہنے کا جمع خرچ بھی بہت زیادہ تھا۔ نوجوان اساتذہ میں سب سے اچھی صلاحیت
کی مالک ڈاکٹر سیدہ جعفر تھیں۔ وہ بھی سروری صاحب کی عزیز شاگرد تھیں لیکن شاید آخری
زمانے میں استاد اور شاگرد کے ویسے تعلقات نہیں رہے تھے اس لیے کہ ایک بار باتوں
کی رَو میں سروری صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ "یہ جتنی زمین کے اوپر ہیں اتنی ہی اندر ہیں"۔ بہر حال
مجھے اُن سے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا، اور ان کا قد زمین کے اوپر بڑھتا ہی گیا۔ میں نے
انھیں ریڈر بنانے میں پوری مدد کی۔ اب دکنیات کی ماہر کی حیثیت سے ان کا علمی حلقوں
میں احترام سے نام لیا جاتا ہے۔

شعبے کے پہلے سال کی تقسیم کار کے وقت میں نے تاریخِ زبان کے پرچے کے علاوہ
دکنی نثر کے شہ پارے، 'وجہی کے سب رس'، کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی لی۔ مجھے
یاد ہے کہ میرے اس انتخاب کے وقت اساتذہ اور طلبہ دونوں میں چہ میگوئیاں تھیں۔
یعنی ایک 'غیر ملکی' دکنی کے شاہ کار کا حق کس طرح ادا کر سکتا ہے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد
جب میں نے 'سب رس' کے متن کو اردو زبان کے ارتقا کے ساتھ مربوط کر کے درس
دینا شروع کیا تو ذہین طلبہ نے فوراً محسوس کر لیا کہ وہ 'ملکی' ہوتے ہوئے بھی دکنی
اردو کے رموز و غوامض سے کتنے ناواقف تھے۔ اہلِ زبان ہونے کے یہ معنی نہیں

ہو۔ تر کہ آپ 'زبان'، جانتے بھی ہیں۔ دکن کی تمام تر خصوصیات جو اسے جدید اُردو سے ممیّز کرتی ہیں وہ اس کے پراکرت نژاد الفاظ ہیں جو فتوحاتِ علائی و تغلق کے ساتھ گجرات اور دکن پہنچے تھے اور جن کا منبع و سرچشمہ نواحِ دہلی کی بولیاں تھیں۔ وہ نہ تلگو سے مستعار لئے گئے ہیں اور نہ کنڑ سے۔ مراٹھی کے بعض الفاظ سے اشتراک اس وجہ سے پایا جاتا ہے کہ ہند آریائی خاندان کے رشتے سے مراٹھی، ایک متجانس زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ دکن کے اساتذہ اور محققین دونوں کی یہ محرومی رہی ہے کہ وہ نواحِ دہلی کی بولیوں سے ناواقفِ محض رہے ہیں۔ چاہے وہ ڈاکٹر محی الدّین قادری زورؔ ہوں یا پروفیسر عبدالقادر سروری۔ سروری صاحب کسی قدر ہندی سے واقفیت رکھتے تھے۔ زورؔ صاحب کو پنڈت ونشی دھر النکار سے مدد لینی پڑتی تھی۔ اس لحاظ سے دکنی اردو کے سب سے اچھے اسکالر ڈاکٹر شری رام شرما گذرے ہیں، جنھوں نے ہندی میں اپنی معرکتہ الآرا کتاب "دکھنی ہندی کا اُدبھو اور وکاس" ۱۹۶۴ء میں تصنیف کی اور نام کمایا۔ ان کی بھی دقتیں دو تھیں: ایک تو انھیں دکنی اردو کو 'دکھنی ہندی'" ثابت کرنا تھا اور دوسرے وہ دکنی کے مخطوطات سے، اردو کم جاننے کی وجہ سے، خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے بعض اوقات زبردست غچّا کھا جاتے تھے۔ میں بہرحال اُن کا بڑا احترام کرتا تھا اور مجھے سخت افسوس تھا کہ ایسے اہلِ علم کو شعبۂ ہندی کے اربابِ حل و عقد نے عرصہ تک لکچرار کی اسامی پر ڈالے رکھا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جب حق بہ حقدار رسید، تو وہ ایک حادثے میں جاں بحق تسلیم ہو گئے۔

دکنی اردو کے سائنسی مطالعہ کے ساتھ ساتھ میں نے اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق (جو میری تحقیقات کا خاص موضوع رہا ہے) علمی نقطۂ نظر کی ترویج کرتے ہوئے اپنی تحریروں میں 'دکنی'، کے مقامی نام پر شمس اللہ قادری اور عبدالحق کے پسندیدہ نام 'قدیم اردو' کو ترجیح دی۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ اردو کا 'دکنی' نام سولھویں صدی سے پہلے نہیں ملتا۔ وجہی تک نے 'سب رس' میں اسے 'زبانِ ہندوستان' کہا ہے۔ اس سے پہلے اس کا عام نام ہندی اور ہندوی رہا ہے۔ قدیم اردو (یا اردوئے قدیم) کے نام پر دکن کے بہت سے اہلِ علم نے ناک بھوؤں چڑھائی، لیکن میرا اندیشہ دور از صحیح ثابت ہوا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اور ڈاکٹر شری رام شرما نے اسے صاف صاف 'دکھنی ہندی' بنا دیا۔ اَمرت رائے کا تو

خیال ہے کہ اردو کی بدعت ولی اور اس کے بعد سے شروع ہوئی ورنہ اس سے قبل کی دکنی تمام تر ہندی یا ہندوی ہے جس کا ادب ہندی تاریخ ادب کا اسی طرح جزو بنایا جا سکتا ہے جس طرح برج بھاشا یا اودھی کا ادب۔ لیکن یہ ان کی بدنیتی یا خود فریبی ہے۔ وجہی کی 'سب رس' یا نصرتی کے قصائد قدیم اردو کے نقوش ہیں نہ کہ قدیم ہندی کے، اسلوب اور فرہنگ دونوں اعتبار سے۔ اردو کا دامن بہت وسیع ہے۔ یہ غالب و اقبال تا نظیر اکبر آبادی اور پریم چند، سب کا احاطہ کرتی ہے لیکن اپنی 'کھڑی بولی' اساس سے یک لحظ غافل نہیں ہوتی۔ اسی لیے یہ برج بھاشا اور اودھی کے ادب پاروں کو اپنانے سے انکار کرتی ہے۔

علمی اعتبار سے عثمانیہ یونیورسٹی میں میرا چھ سالہ قیام (۱۹۶۲ تا ۱۹۶۸ء) خود میرے لیے بارآور رہا۔ اسی دوران میں نے 'قدیم اردو' کے نام سے اردو کے قدیم متون کو، سائنسی انداز میں مرتب کر کے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا، جن میں پرت نامہ، بکٹ کہانی، اور ابراہیم نامہ کے متون میرے مرتب کردہ ہیں۔ ابراہیم نامہ کا متن نہایت ادق زبان میں لکھا ہوا تھا اور اس کا صرف ایک ہی خطی نسخہ دستیاب تھا، اس لیے باوجود کوشش کے ڈاکٹر زور بھی اس کی تدوین کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ میں نے یہ ہفت خواں دو سال کی محنتِ شاقہ کے بعد طے کیا۔ اسی زمانے میں میں نے اپنے علمی و لسانیاتی مضامین کا انتخاب 'شعر و زبان' کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ اس میں 'تخلیق شعر'، 'مطالعۂ شعر (صوتیاتی نقطۂ نظر سے)'، 'سماج اور شعر'، 'ہندوستان میں اردو کا عروج و زوال'، 'دکنی یا اردوئے قدیم'، 'علی گڑھ تحریک، مسلم یونیورسٹی اور اردو زبان' اور 'اردو صوتیات کا خاکہ' جیسے اہم مضامین شامل ہیں۔ ایک اور اہم کتاب جو میں نے اس زمانے میں ترتیب دی 'عیسوی خاں کا قصۂ مہر افروز و دلبر' ہے، جس کا واحد نسخہ آغا حیدر حسن صاحب کے کتب خانے کی زینت تھا اور جو انھوں نے نہایت فیاضی سے مجھے مرتب کرنے کے لیے دیا۔ یہ شمالی ہند کی سلیس زبان میں لکھی ہوئی ایک قدیم داستان ہے۔ اس داستان کو یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ ہندی والوں کے لیے بھی قدیم ہندی کی نثر کے اوّلین نمونے کے طور پر اہمیت رکھے گی بڑی محنت سے ہندی رسم خط میں مع حواشی کے شائع کیا، لیکن جو لوگ وجہی کی 'سب رس' کے دعویدار ہیں انھوں نے بھی اس سے اغماز کیا۔ صرف ہندی کے نقّاد رام ولاس شرما نے اپنی معرکتہ الآراء

تصنیف "بھارت کے پراچین بھاشا پری وار اور ہندی" میں ہندی کے ارتقاء سے بحث کرتے ہوئے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی نے میرا دکنی اردو کی لغت، کا پراجکٹ منظور کیا اور مجھے ایک تنخواہ دار اسسٹنٹ بدیع حسینی صاحب کو اس کام کے لیے فراہم کیا۔ میں نے اس میں از خود ڈاکٹر غلام عمر خاں کو شریک کیا۔ بعد کو مجھے اس سلسلے میں تلخ تجربہ ہوا۔ جب یہ کام اپنے آخری مراحل میں تھا اور میں حیدرآباد سے پرواز کرنے کے لیے پَر تول رہا تھا تو انھوں نے شرلپسند کالکرنی کے ساتھ یہ مشہور کیا کہ یہ سارا کام تو ان دونوں کا ہے جو مسعود حسین خاں نے ہڑپ کر لیا ہے۔ حالاں کہ عمر خاں میں اس کام کو تنہا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی اس لیے کہ وہ ہندی یا شمالی ہند کی بولیوں کے کینڈے سے قطعاً ناواقف تھے۔ میں تو ریکارڈ کی خاطر یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ اس لغت کی تدوین میں مجھے اپنے شاگرد اور اسسٹنٹ بدیع حسینی سے کہیں زیادہ مدد ملی ہے، جن کی نظر دکنی کے محاورے پر بہت اچھی تھی۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی نے لغت کا معاوضہ بھی مجھ ہی کو دیا ہے۔

اسی قسم کے علمی اشتراک کا دوسرا تجربہ مجھے پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی جانب سے ہوا جنھوں نے بکٹ کہانی کے تیسرے ایڈیشن میں میرا لکھا ہوا پہلے ایڈیشن کا دیباچہ حذف کر کے اپنا کام بنا لیا ہے۔ حالاں کہ بکٹ کہانی کا قدیم ترین نسخہ (نمبر ۹) جو ادارۂ ادبیات (حیدرآباد) کا مخزونہ ہے اور جس پر اس متن کی اساس ہے سر تا سر میرا مرتب کردہ ہے اسی طرح بکٹ کہانی کے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ کا ایک ایک لفظ میرا لکھا ہوا ہے۔ ترتیب و تہذیب کے اس کام میں شریکِ غالب ہونے کے باوجود میں نے فراخ دلی سے سرورق پر اس کے مرتبین میں پہلی جگہ ان کے نام کو دی تھی۔

کئی لحاظ سے حیدرآباد کا چھ سالہ قیام میری علمی زندگی کا ایک یادگار زمانہ رہا ہے۔ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد کا مجھے مکمل اعتماد حاصل رہا اس میں وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی۔ ایس ریڈی، پرنسپل اور ڈین پروفیسر عبدالقادر اور ان کے بعد سنسکرت کے پروفیسر آر یندر شرما خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رفقائے شعبہ نے مجھ سے مکمل تعاون کیا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا نام لوں گا جو اردو

کی پروفیسر شپ کے دعویدار رہے تھے۔ مجھ پر غیر ملکی ہونے کا لیبل بھی چسپاں نہ ہو سکا اس لیئے کہ میرے دادا فدا حسین خاں، پچھلی صدی کے اختتام پر حیدر آباد جا کر بس گئے تھے اور وہاں بیگم بازار میں اپنی رہائش کے لیئے دو منزلہ بھی تعمیر کرالیا تھا۔ والد نے بھی اپنی ملازمت کا آغاز وہیں سے کیا لیکن عمر نے وفا نہیں کی۔ میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور بڑے بھائی امتیاز حسین خاں نے بھی نیک نامی کے ساتھ اپنی ساری زندگی عثمانیہ یونیورسٹی کی نذر کی۔ اور بڑے بھائی تو بالآخر حیدر آباد ہی کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ حیدر آباد پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اپنے دادا کی طرح مجھے بھی شاہ نصیر کی اس جنت میں رہ پڑنا چاہیئے۔ چنانچہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے شوہر محمود صاحب کے مشورے سے ہم دونوں نے میر عالم تالاب کے کنارے نہایت پُر فضا مقام پر دو پلاٹ خرید لیئے اور پروگرام بنا لیا کہ علی گڑھ کا مکان بیچ کر یہاں تعمیر کی جائے۔ لیکن ۱۹۶۸ء میں میری مراجعتِ علی گڑھ کے بعد یہ پروگرام منسوخ کرنا پڑا اور اس قطعہ کو فروخت کر دیا۔

نہ صرف اپنا تحقیقی کام کرنے کے مواقع مجھے عثمانیہ میں ملتے رہے، بعض طلبہ نے میری نگرانی میں نہایت اعلیٰ تحقیقی مقالے بھی لکھے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان میں ڈاکٹر مغنی تبسم کا مقالہ "فانی: حیات اور شاعری" اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا "رشید احمد صدیقی: حیات اور شاعری"، تحقیقی ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ مغنی تبسم صاحب نے اردو میں پہلی بار فانی کے آہنگ کا تجزیہ صوتیات کے اُصولوں کی روشنی میں کیا، جس میدان میں مَیں اپنی امریکہ کی واپسی کے بعد سے کام کر رہا تھا۔ سلیمان اطہر جاوید صاحب کی بڑی سفارشوں اور مشکل کے بعد رشید صاحب کے صاحبزادے تک رسائی ہوئی اور احسان رشید صاحب کی مدد سے ان کی حیات کے بارے میں نایاب مواد حاصل کیا۔ مجھے اس بات کی تھوڑی سی خلش رہی جو کام علی گڑھ میں ہونا چاہیئے تھا وہ عثمانیہ میں ہوا۔

وجہی نے قطب مشتری میں سچ ہی کہا ہے کہ دکھن ملک بھوت ہیچ خاصا اہے۔ یہ خاصہ کئی لحاظ سے ہے۔ اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہاں 'ملکی' اور 'غیر ملکی' کا مسئلہ ہے۔ یوں تو 'مقامیت' کا شکار کسی حد تک ہر خطہ ہوتا ہے لیکن یہ جذبہ حیدر آباد میں کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ سقوطِ حیدر آباد سے پہلے تو یہ ایک متعدی مرض کی طرح پھیلا ہوا تھا جس کا شکار شمال سے

آئے ہوئے بڑے بڑے علماء، فضلاء اور شعراء تک ہو جاتے تھے، لیکن ۶۲ء میں جب میں حیدرآباد پہنچا ہوں اس وقت تک یہ صرف اندازِ فکر کے طور پر باقی تھا۔ مجھے اس سے بھی بوجوہ سابقہ نہیں پڑا۔ اس وقت تک اس کے سیاسی اسباب ختم ہو چکے تھے۔ جامعہ عثمانیہ، عثمانیہ یونیورسٹی بن چکی تھی۔ شمال سے لوگوں کی آمد بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب منفی جذبے کی جگہ دکن اور دکنی کے ایک مثبت تفاخر نے لے لی تھی۔ مثلاً 'دکنی زبان'، اور 'دکنی ادب' کی اصطلاحوں پر اصرار تھا۔ میں نے 'دکھنی ہندی' کے اندیشہ ہائے دراز کی پیشِ نظر 'دکنی اردو' کی اصطلاح منسوخ کرنی چاہی تو اس کو بھی تائید نہیں ملی۔ 'قدیم اردو' (عبدالحق) یا 'اردوئے قدیم' (شمس اللہ قادری) کی تراکیب تو قطعاً قابلِ قبول نہیں تھیں۔ بالآخر وہی ہوا کہ ڈاکٹر بابو رام سکسینہ، شری راہل سانکرتائن اور ڈاکٹر شری رام شرما جیسے محققین نے اسے 'دکھنی ہندی' میں تبدیل کر دیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو آصفی دور میں ملکی کی تحریک چلانے والے بیشتر خاندان شمال سے آئے ہوئے تھے کسی نے دکن کی تعریف کرتے ہوئے اُسے ریل کے تیسرے ڈبے سے تشبیہ دی ہے جس میں ایک بار داخل ہو جانے کے بعد آپ 'اہلِ خانہ' ہو جاتے ہیں اور بعد کو آنے والوں کو آپ 'بیرونِ خانہ' کہہ کر ان پر دروازہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود خاندانِ آصفیہ غیر ملکی تھا۔ ان کے ساتھ آئے ہوئے دیگر امراء و روساء اور عسکری غیر ملکی تھے۔ ایران و عرب سے تعلق رکھنے والے خاندان غیر ملکی تھے۔ مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب جیسے ادیبوں کے بھی آباء و اجداد غیر ملکی تھے۔ فرق صرف تفاوتِ زمانی کا تھا۔ کوئی دو سو برس پہلے آیا تھا تو کوئی سو برس پہلے۔ فانی نے جو دکن ہی کے پیوندِ زمین ہوئے ع غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔ اپنے اس احساس کو زبانِ غزل میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا ہمیں

ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ۱۹۴۸ء میں رسی تو جل چکی تھی مگر 'دکنیت'، کے تفاخر کی شکل میں بل باقی تھا۔ ان حالات میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے 'آصف جاہ اول'، تصنیف کی، پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے تاریخِ دکن کی جلدیں لکھیں، قطب شاہیوں کی تاریخ

مرتب کی اور بانیٔ حیدر آباد، محمد قلی قطب شاہ کی حیات اور کارناموں پر سب سے مستند مونوگراف لکھا۔ میرے حیدر آباد پہنچنے تک یوسف صاحب تو علی گڑھ آچکے تھے لیکن جامعہ عثمانیہ کی باقیات میں سب سے اہم شخصیت پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی تھی جس نے میری نسبتی عزیز داری بھی تھی۔ انھیں دیکھ کر مجھے جامعہ عثمانیہ مرحوم کی عظمت وجلال کا خیال آجاتا تھا۔ سن رسیدگی کے باوجود ان کا علمی انہماک پرانے اہلِ علم کی یاد دلاتا تھا۔ میں نے ان کی سی مرتب اور منظم علمی زندگی گزارتے ہوئے بہت کم عالموں کو دیکھا ہے جو کام ہاتھ میں لیتے اسے تکمیل تک پہنچاتے۔ میں اکثر ان کے دولت کدے پر حاضری دیتا۔ مکان کیا تھا ایک کتب خانہ تھا جس میں صبح سے شام تک پابندیٔ اوقات کے ساتھ وہ کام کرتے رہتے تھے۔ آخری زمانے میں ان کا زیادہ تر وقت تاریخِ دکن کی تالیف میں گذرتا جو وہ ڈاکٹر جوشی کے تعاون سے مرتب کر رہے تھے۔ ایک دن اچانک میرے یہاں آئے اور کہنے لگے "مسعود میاں! آپ کو میرے لیے ایک کام کرنا ہے۔ انکار نہ کیجئے گا"۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تاریخِ دکن کے ازمنہ وسطیٰ کی جلد کے لیے مجھ سے دکنی اردو کے ادب پر ایک باب لکھوانا چاہتے ہیں۔ مجھے اس ذمہ داری کو قبول کرنے میں کسی قدر تامل تھا، اس لیے کہ دکنی اردو کی ادبیات کے حیدر آباد میں کچھ اور ماہر اور دعویدار موجود تھے۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ جو کام میں کرسکتا ہوں کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ بہرحال انھیں کی ہمت افزائی پر میں نے قلم سنبھال لیا اور اب وہ مضمون ایک ذیلی باب کی شکل میں تاریخِ دکن کی متذکرہ جلد میں شامل ہے۔

شیروانی صاحب کی علمی دلچسپیاں متنوع تھیں۔ تاریخ کے علاوہ انھیں اردو زبان اور اس کے مسائل سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں بے تکان لکھتے تھے۔ ساتھ ہی ان کا فارسی زبان کا علم اور فارسی مخطوطہ شناسی کا ملکہ غیر معمولی تھا۔ یہ ان کی بدقسمتی ہے کہ مورخ کی حیثیت سے مؤرخین کے ترقی پسند گروہ نے جن کا فارسی کا مبلغ علم بس یوں سا ہوتا ہے، ان کی قدر نہ کی اور 'غیر ملکی' ہونے کے ناتے، دکن کی ساری عمر خدمت کرتے کے باوجود، وہ حیدر آباد میں یاد نہیں رکھے گئے۔ لیکن ازمنہ وسطیٰ کے مورخین کا وہ طبقہ جن کی اس دور کے بنیادی ماخذات تک رسائی ہے ان کی تصانیف کو آج بھی حوالے کی کتب کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تاریخ کا کوئی زاویۂ نظر، علمی کمی کا بدل نہیں بن سکتا!

حیدرآباد میں بہ ہمہ وجوہ مطمئن ہونے کے باوجود علی گڑھ کی یاد اور خلش باقی رہی۔ یہ مارچ ۱۹۶۶ء میں بڑے بھائی کے اچانک انتقال کے بعد تیز تر ہو گئی۔ وہاں میرا ذاتی مکان تھا، وطنِ مالوف قائم گنج نہایت قریب تھا۔ میرے بیشتر عزیز و اقارب یو۔پی۔ اور دہلی میں بسے ہوئے تھے۔ دکن کی کشش بھائی صاحب کی طرح شاید مجھے بھی پیوندِ زمین بنا دیتی اگر خاتونِ خانہ یعنی میری بیوی کی مصلحت بینی آڑے نہ آجاتی۔ میرے ایک لڑکا اور چار لڑکیاں تھیں۔ لڑکیاں پریم چند کی زبان میں گنگا جمنا کی طرح بڑھتی آ رہی تھیں۔ عمر بھر جو کمایا تھا وہ کھایا۔ ان لڑکیوں کا کیا ہوگا؟ یہ سوال مجھ سے پہلے اُن کے ذہن میں پیدا ہونے لگا۔ حیدرآباد کے معیار کا سگھڑ جوڑا کہاں سے آئے گا، جہاں لڑکیاں شادی بیاہ کے ہاٹ میں بکتی ہوں وہاں ہم اپنے محدود وسائل اور اجلے خرچ کے پیشِ نظر قیمت کہاں سے چکا سکیں گے۔ ہماری فیملی پلاننگ بھی تاخیر کی شادی کی وجہ سے اچھی نہیں ہوئی تھی! یعنی ریٹائرڈ ہونے تک ہم زیادہ سے زیادہ دو بچوں کو لگا سکتے تھے۔ باقی تین بچیوں کا کیا ہوگا؟ ملازمت میں میری اچھل کود نے پنشن کا حق بھی سوخت کر دیا تھا اور جو کچھ پراویڈنٹ فنڈ ملتا زیادہ اکھاڑ پچھاڑ کی نذر ہوتا رہا۔ بچہ ان تفکرات سے مجھے دو چار کرتی رہتیں۔ پہلے تو میں حسبِ معمول سُنی اَن سُنی کرتا رہا، لیکن تکرار میں اثر ہوتا ہے، بالآخر اس کا شکار ہو گیا۔ اِدھر علی گڑھ سے خبریں آنا شروع ہوئیں کہ وہاں لسانیات کی پروفیسری آنے والی ہے۔ لسانیات کا شعبہ نواب علی یاور جنگ کے ذہن میں بھی تھا اور جیسا کہ مجھے بعد کو ڈاکٹر ریڈی نے بتایا کہ انھوں نے مجھے واپس لے جانے کی فرمائش بھی کی تھی لیکن ڈاکٹر ریڈی اس بات پر آمادہ نہیں ہوئے اور اُن سے کہا "نواب صاحب! آپ بھی عثمانیہ کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ یہاں کے شعبۂ اردو کی تاریخ بھی آپ کی نظر میں ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مسعود حسین کو لے جا کر اس شعبے کا حشر پہلا جیسا بنا دیں۔ انھوں نے آ کر اسے سنبھال لیا ہے اور میں ان کے کام سے بہت مطمئن ہوں"۔ اس کے بعد نواب صاحب نے مجھے واپس بلانے کا خیال چھوڑ دیا۔

لیکن ۱۹۶۵ء میں جب ڈاکٹر عبدالعلیم مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو چوں کہ وہ سیاسی خیالات کے اختلافات کے باوجود میرے قدردانوں میں تھے، انھیں علی گڑھ سے میری ہجرت کے اسباب کا بھی علم تھا۔ پہلا کام جو انھوں نے کیا یہ تھا کہ

پرو وائس چانسلر فضل الرحمٰن صاحب سے کہا کہ مجھے خط لکھ کر دریافت کیا جائے کہ وہ علی گڑھ لسانیات کی پروفیسری پر آنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ فضل الرحمٰن صاحب کا کہنا ہے کہ انھوں نے مجھے اس مضمون کا خط لکھا تھا، لیکن وہ مجھے کبھی نہیں ملا۔ چنانچہ علیم صاحب کی تحریک سے کافی عرصہ تک میں غافل رہا۔ جب کچھ دنوں کے بعد علی گڑھ ایک امتحان کے سلسلے میں آنا ہوا اور علیم صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے شکایت کی کہ "حضرت! اب تو آپ خط کا جواب تک نہیں دیتے" میں نے کہا کیسا خط؟ اس وقت انھوں نے تفصیل بتائی اور میرے یہ بتانے پر کہ اس قسم کا کوئی خط مجھے تا حال نہیں ملا ہے، اپنی پیش کش کو دہرایا۔ میں نے فوراً قبول کر لی، ان شرائط کے ساتھ کہ میں انٹرویو میں حاضر نہیں ہونگا اور دوسرے یہ کہ میرا تقرر چند اضافوں کے ساتھ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انتخابی کمیٹی کا ہونا ضروری تھا، وہ ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی بھی تھے۔ انھوں نے فوراً میرا نام تجویز کرتے ہوئے کہا "وہ آپ ہی کے آدمی ہیں انھیں بلا لیجیے۔"

بہت جلد مجھے تقرر کا پروانہ مل گیا۔ اس کو لے کر میں ڈاکٹر ریڈی سے ان کی کوٹھی پر ملا اور کہا کہ مجھے اُن کی سرپرستی میں یہاں ہر قسم کی آسائش اور عزت حاصل ہے لیکن میری ذاتی مجبوریاں ہیں جن کے تحت مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ بادلِ ناخواستہ انھوں نے مجھے اس کی اجازت دی اور پھر وہ گفتگو سنائی جو ان کے اور علی یاور جنگ کے درمیان میرے بارے میں ہوئی تھی، جس کا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں۔

میرے تقرر کی خبر علی گڑھ میں پھیلی تو بہی خواہوں اور دوستوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ رشید صاحب نے ۱۳ جولائی ۶۸ء کے خط میں لکھا:

"۱۰ جولائی کا نوازش نامہ ملا۔ ہاتفِ شیراز بہت پہلے سے "یوسفِ گم گشتہ" کے کنعان واپس آنے کی بشارت دے رہے تھے۔ لیکن کیا کیجیے اس 'قمر در عقرب' یا اشٹ گرہ، کو (معلوم نہیں سنسکرت کا صحیح مترادف استعمال کر رہا ہوں یا نہیں؟ بہت دن ہوئے یہ لفظ سننے میں آیا تھا)

جس کی نحوست و نجاست یونیورسٹی پر مسلّط ہے۔ پرو وائس چانسلر صاحب سے درخواست کی ہے کہ آپ کی خدمت میں تقرر کا اطلاع نامہ (باضابطہ) جلد سے جلد بھجوادیں تاکہ آپ یہاں پہنچنے کا انصرام بر وقت اور آسانی سے کرسکیں۔ ابر و باد و باراں کی بے دریغ بخشی سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کے خیر مقدم کے لیے میگھ دوت نے حیدرآباد کے موسم کو علی گڑھ منتقل کردیا ہو۔"

خلیق احمد نظامی صاحب نے مختصراً لکھا "حق بہ حقدار رسید"۔

بارھواں باب

علی گڑھ (۴)

(۶۸ تا ۷۳ء)

اگست ۶۸ء میں حیدر آباد کو خیر باد کہہ کر میں پھر علی گڑھ آن دھمکا۔ اس سے قبل میں اپنا مکان 'جاوید منزل' جو یونیورسٹی کے پاس کرائے پر تھا، واگذاشت کرا چکا تھا۔ حیدر آباد میں کچھ سامان اونے پونے بیچا اور باقی ایک ٹرک پر لدوا کر علی گڑھ کے لیے روانہ کر دیا۔ اس اکھاڑ پچھاڑ میں ایک بار پھر میرا کافی نقصان ہوا۔ لیکن علی گڑھ واپس آنے کی اس قدر خوشی تھی کہ اس کی پروا نہ کی۔ میرے مزاج میں ہے کہ جب کسی کام کو پورا کرنے کی دُھن سما جاتی ہے تو پھر اس میں اخراجات کی مطلق پروا نہیں کرتا۔

علی گڑھ پہنچ کر معلوم ہوا کہ لسانیات کا شعبہ صرف کاغذ پر قائم ہوا تھا۔ میرا اس کی پروفیسری پر تقرر ضرور ہو گیا تھا لیکن نہ تو طلبہ تھے نہ اسٹاف اور نہ کمرے۔ وقتی طور پر آل احمد سرور صاحب، صدر شعبۂ اردو کی عنایت سے اُن کے شعبے میں مجھے ایک کمرہ مل گیا اور پڑھانے کے لیے 'تاریخِ زبانِ اردو کے چند گھنٹے۔ یہاں بیکار بیٹھ کر میں اکثر سوچتا کہ اگر یہ صورت چھ سال قبل نکل آتی تو میرا حشر اس کہاوت کے مطابق کہ "جاؤ پوت دکھن، یہ ہی کرم کے پھُھن"، کیوں ہوتا۔ گھر سے بے گھر ہونے کی نوبت کیوں آتی، اپنی ملازمت کی پنشن سے کیوں محروم ہوتا۔ میں ایسے کاموں میں تقدیر پر زیادہ بھروسا

نہیں کرتا۔ البتہ انسان کی تدبیر پر یقین رکھتا ہوں۔ چنانچہ ایک شخص کی ترکیب، سے میں دکھن اور دوسرے شخص کی "تدبیر" کے ذریعے پھر واپس علی گڑھ آیا!

اگلے سیشن یعنی ۱۹۶۹ء میں شعبۂ لسانیات کے لیے تین کمرے جنرل ایجوکیشن سینٹر میں مل گئے اور چار طالب علموں پر مشتمل ایم۔اے کی پہلی کلاس اسی سال کھل گئی۔ شعبۂ اردو سے میرے پرانے طالب علم ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کی خدمات لسانیات کے شعبے میں منتقل کر دی گئیں۔ اگلے سال ۱۹۷۰ء میں چار نئے طالب علموں نے داخلہ لیا۔ ایک اور استاد اقتدار حسین خاں کا بحیثیت لیکچرر اضافہ ہوا۔ نئے شعبہ کی درسیات کا تمام تر رُخ ہم نے اردو زبان کی جانب رکھا کہ یہی اس کے قیام کی وجہ جواز تھی۔ جب پی ایچ ڈی میں داخلے کا سلسلہ شروع ہوا تو ایسے موضوعات کا انتخاب کیا گیا جن کا براہ راست تعلق اُردو زبان سے تھا مثلاً "سولھویں تا اٹھارہویں صدی کی شمالی ہند کی اردو کا لسانی تجزیہ"، "اردو ہندی کا تقابلی مطالعہ"، "دہلی کی کرخنداری اردو کا تجزیہ"، "دکنی اردو کا تجزیہ" وغیرہ وغیرہ میرے پرانے ساتھی ڈاکٹر انور انصاری، جو اب شعبۂ نفسیات کے صدر تھے، جنرل ایجوکیشن سنٹر کے ڈائریکٹر بھی تھے۔ جگہ کی سخت قلت کی وجہ سے ان سے شعبے سے ملحق ایک کمرے کا تقاضا کیا۔ اس میں جنرل ایجوکیشن کا کباڑ بھرا ہوا تھا۔ پہلی گفتگو میں انھوں نے اس پر ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس کے بعد "بہانۂ بسیار" کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں بھی اہلِ غرض بن کر پیچھا کرتا رہا۔ اب ان سے شرفِ ملاقات تک حاصل نہیں ہوتا تھا۔ لکھنوئی تکلف کے انداز میں کہلا بھیجتے، "مسعود صاحب تکلیف نہ کریں، میں خود حاضر ہوں گا"۔ اس "تکلف اور تکلیف دونوں سے تنگ آکر میں نے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم کا رُخ کیا۔ انھوں نے طعنہ دیا کہ "وہ تو آپ کے پرانے یار ہیں"۔ میں نے کہا "جی ہاں! یہی تو بدنصیبی ہے، دوستی کا حجابِ اکبر درمیان ہے"۔ کہنے لگے "یہاں تو ہر شخص اپنی ریاست بنائے بیٹھا ہے"۔ میں نے کہا "وائس چانسلر کا ریاست شکن، ہونا ضروری ہے"۔ میری یہ بات ان کی معمول کی گہری خاموشی میں ڈوب گئی اور میں پھر کنارہ پر رہ گیا!

خدا خدا کر کے شعبے کی قسمت جون ۷۲ء میں پلٹی جب آرٹس فیکلٹی کی نئی عمارت

میں اس کو تیسری منزل پر چند کمرے مل گئے اور شعبہ، جنرل ایجوکیشن سینٹر سے وہاں منتقل ہو گیا۔ وہاں دو بڑے کمرے تھے۔ ایک میں سمینار لائبریری اور دوسرے میں صوتیات کی لیبارٹری قائم کی۔ سمینار کے لیے میں خود دہلی جا کر منشی رام منوہر لال کی دکان پر گھنٹوں صرف کرتا اور کتابیں منتخب کرتا۔ صوتیات کی تجربہ گاہ کے لیے ایک سینیر ٹیکنیشین مبین احمد خاں صاحب کا تقرر کرایا اور ٹیپ ریکارڈر اور ٹیپ خریدے۔

اسی زمانے میں ماورائے شعبہ بھی میری سرگرمیاں بڑھیں۔ ۱۹۶۹ء میں سرور صاحب چھ ماہ کے لیے امریکہ گئے تو مجھے انجمن ترقی اردو کا قائم مقام سکریٹری نامزد کیا گیا۔ میں نے دفتری کام کے علاوہ اس کے دو رسالے سہ ماہی 'اردو ادب' اور ہفتہ وار 'ہماری زبان' کی ادارت کا کام بھی سنبھال لیا۔ 'ہماری زبان' کے اداریوں نے مجھے اردو داں طبقے سے بحیثیت صحافی متعارف کرایا۔ میرے بیشتر اداریے اردو زبان سے متعلق ہوتے جن پر مجھے مسلسل داد رشید صاحب سے ملتی۔ وہ ہر اداریے پر رقعہ کی شکل میں کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجتے۔ میں ان کی اس حوصلہ افزائی کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتا اور میرے قلم کو مہمیز ملتی۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(۱) 'سنسکرت، اصطلاحاتِ علمیہ اور اردو زبان' (۸ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

"ہماری زبان، کا پچھلے ہفتے کا اداریہ خوب تھا، ترتیب، مقدمات، عبارت اور لب و لہجہ ہر اعتبار سے، مبارک باد دیتا ہوں۔ خیال تھا کہ ملاقات ہو جائے گی تو زبانی تہنیت پیش کروں گا۔"

(۲) 'اردو ایک تہذیبی قدر اور ضرورت' (۱۲ر نومبر ۱۹۶۹ء)

"'ہماری زبان' میں آپ کا تازہ ترین اداریہ خوب ہے عبارت کیا، اشارت کیا ادا کیا! اور یہ سب لنگوئسٹک ہونے کے باوجود!...... اس سے قبل جتنے مضامین تھے وہ مبنی برحقائق تھے۔ یہ ہمارے تہذیبی تقاضوں (غیرت اور حمیت) کا اقرار اور اعلان ہے۔ خدا آپکو خوش رکھے۔ کارے کردی!"

(۳) 'اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم' (۱۸ر نومبر ۱۹۶۹ء)

"پرسوں ہماری زبان میں آپ کا اداریہ (اردو ذریعۂ تعلیم) دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں ایسے مدلّل و مسلسل مضامین، سب و شتم اور جزع و فزع سے پاک اردو کی حمایت میں کہیں اور شائع نہیں ہوئے۔"

(۴) 'اردو رسمِ خط' (۴ دسمبر ۱۹۶۹ء)

"آج ہماری زبان کا یکم دسمبر کا شمارہ ڈاک سے موصول ہوا۔ اردو رسمِ خط کے عنوان سے آپ کا اداریہ بے نظیر ہے۔ ایسے اہم اور متنازعہ فیہ مسئلے پر اس جامعیت اور قابلیت سے اتنا مختصر مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ پھر اس کا سنجیدہ، شریفانہ اور علمی لب و لہجہ۔ میرے نزدیک یہ مضمون اِس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔"

(۵) 'اردو ہے جس کا نام.....' (۱۱ دسمبر ۱۹۶۹ء)

"پرسوں ہماری زبان میں آپ کا مضمون اردو کی مرکزیت اور لامرکزیت سے متعلق پڑھا۔ جب سے آپ نے یہ اداریے لکھنے شروع کیے ہیں اردو کے معرکہ آرا مسائل پر اس اختصار و جامعیت کے ساتھ، ایسے خوبصورت اُسلوب اور شگفتہ عالمانہ انداز میں کسی اور کا کوئی مضمون، کم سے کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ مدتوں پہلے سے بھی۔

بار بار اِس قسم کے توصیفی کلمات، وہ بھی آپ کو لکھنا، کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ آپ کا جو حق ہے وہ ہر حال میں اور ہر وسوسے و خطرے کو نظر انداز کر کے آپ کو پہنچا دینا، بہرحال اولیٰ ہے۔"

(۶) 'گروگرنتھ صاحب اور اردو' (۱۸ دسمبر ۱۹۶۹ء)

"جب سے انجمن کا کام آپ کے سپرد ہوا ہے، ہماری زبان کے اداریے ہر اعتبار سے بڑے وقیع ہونے لگے ہیں...... ان مضامین کا مجموعہ ضرور شائع ہونا چاہیے۔" (۱)

(۷) 'اردو بہ نام ہندی' (۵ جنوری ۱۹۷۰ء)

"ہماری زبان کے سالِ نو کا آپ کا پہلا اداریہ پیشِ نظر ہے۔ جس جامعیت کے ساتھ زبان کے کتنے تاریخی لسانی اور نزاعی مسائل کو آپ نے عالمانہ حقیقت پسندانہ اور دلنشیں انداز

میں قلم برداشتہ قلم بند کیا ہے اُسے میں اظہار و ابلاغ کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں۔۔۔۔ میرا مستقل خیال ہے کہ آپ کے اداریوں کا 'آخر میں' انجمن کی طرف سے ایک مجموعہ شائع کیا جائے" (۲)

(۸) ۱۹۷۱ کی مردم شماری اور اردو ' (۴, فروری ۱۹۷۰ء)

" ہماری زبان (یکم فروری کا) کل ملا۔ شمار و اعداد کے فن یافنوں کو آپ نے ادب کا درجہ دے دیا ہے "

(۹) ' دل اور دے ان کو۔۔۔۔۔' (۱۱, فروری ۱۹۷۰ء)

"اس ذہانت اور خوش مذاقی سے، جس کا اظہار عنوان کے انتخاب اور اس طرح کی دوسری باتوں سے ہوتا ہے، میں اس کا اندازہ کر لیتا ہوں کہ لکھنے والا کس مرتبے اور معیار کا ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ انجمن اور ہماری زبان کا جو چارج آپ کو ملا ہے' اس میں اللہ کی کوئی مبارک مصلحت پوشیدہ ہے"

(۱۰) 'اردو: علاقائی یا دوسری سرکاری زبان' (۱۳, مارچ ۱۹۷۰ء)

" ہماری زبان ، ۸, مارچ کا اداریہ اسی اعلیٰ پایہ کا ہے جیسے آپ کے اداریے ہوا کرتے ہیں، تنقیح، توضیح، زبان اور زور، ہر اعتبار سے۔۔۔۔ آپ کا شمار میں اُن چند (چند سے بھی کم) لوگوں میں کرتا ہوں، جو ہندوستان میں ان دنوں اردو کے بہترین وکیل اور سفیر کہے جا سکتے ہیں"

(۱۱) 'اردو کا محضرنامہ' (۲۵, اپریل ۱۹۷۰ء)

" ہماری زبان کا اسپیشل نمبر تھوڑی دیر ہوئی ملا۔۔۔ آزادی کے بعد اردو کا یہ کاغذی پیرہن یادگار رہے گا۔ عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا "

---

(۱) و (۲) رشید صاحب کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے میرے ایک عزیز شاگرد ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے ۱۹۷۳ء میں ان اداریوں کا مجموعہ " اردو کا المیہ " کے نام سے مرتب کر کے شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع کرایا۔

ان اداریوں کے لیے تحسینی کلمات صرف رشید صاحب تک محدود نہیں تھے۔ مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم نے انجمن ترقی اردو کے جلسے میں کہا کہ ان سے اردو کی تحریک چل پڑی ہے۔ ایک ملاقات میں سکندر علی وجد صاحب نے، جو اس وقت ایم۔پی تھے، مجھ سے کہا "مسعود صاحب! آپ کی گراں قدر تصنیف 'اردو کا المیہ' گھر اور لوک سبھا دونوں جگہ میرے پاس رہتی ہے۔ اسی سے میں اردو کے اعداد و شمار لیتا ہوں اور اسی سے اردو کی حمایت کے لیے دلائل۔"

۷۰، ۷۱ اور ۷۲ء کے تین سال میرے لیے بڑی گھما گھمی کے تھے۔ ایک نئے شعبے کی تشکیل و تدریس کی ذمہ داریاں، انجمن ترقی اردو سے انتظامی وابستگی۔ قدیم متون کی ترتیب کا تسلسل، غرض کہ نہ اپنی صبح تھی اور نہ ہی شام۔ اسی زمانے میں میں نے شمالی ہند کے ایک قدیم متن روشن علی سہارنپوری کے عاشورنامہ کو مرتب کیا جو ۱۶۸۸ء کی تصنیف ہے اور جس کا واحد نسخہ رضا لائبریری، رام پور کا مخزونہ ہے۔ اس کا فوٹو عکس مجھے سید سفارش حسین صاحب نے لا کر دیا تھا اور جب وہ خود اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تو مجھے اس کی جانب مائل کیا۔ میں نے سال بھر کی محنت کے بعد اس کی ترتیب و تدوین مکمل کر لی۔ جب میں نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے مؤلفین میں ان کا نام بھی شامل کیا جائے تو بولے "اس میں میرا کیا ہے" ترتیب و تدوین آپ کی، پیش لفظ آپ کا۔ میں نے تو صرف خدمت کی ہے۔" کتاب شائع ہوتے وقت میں نے مؤلفین میں ان کا نام، ان کے یہ کہنے کے باوجود شامل کیا۔ علمی کاموں میں یہ فیاضی میرا ہمیشہ کا وطیرہ رہا ہے۔ حالاں کہ اس قسم کے اشتراک کے دو تلخ تجربے مجھے ہو چکے ہیں۔ ایک ڈاکٹر غلام عمر خاں سے، "دکنی اردو کی لغت" کے سلسلے میں، جن کی تفصیل میں نے کسی اور باب میں دی ہے اور دوسرا پروفیسر نورالحسن ہاشمی سے جن کے ساتھ بکٹ کہانی کی تدوین میں، میں شریکِ غالب کی حیثیت رکھتا تھا لیکن میرا حشر بقولِ غالب ع

"کہ جو شریک ہے میرا شریکِ غالب ہے"

ہوا۔ میں نے شریکِ غالب ہونے کے باوجود مؤلفین میں ان کا نام اوّل رکھا۔ لیکن اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کراتے وقت انھوں نے میرے مقدمہ کا بیشتر حصہ اس سے

عارج کر کے آخر میں صرف اپنا نام رکھا!

میں اب عمر کے چوّن سال پورے کر چکا تھا۔ باوجود مرتب زندگی اور احتیاط کے بہرحال کام کی زیادتی سے اب جسم ٹوٹنے لگا تھا۔ جنوری ۳، ۱۹۷۰ کو جب میں رات کی گاڑی سے لکھنؤ جانے کی تیاری کر رہا تھا تو معلوم ہوا کہ زمین پاؤں کے نیچے سے سرک رہی ہے، اور دل بیٹھا جا رہا ہے۔ شدید کمزوری کا دورہ پڑا۔ فوراً میرے ہم زلف ڈاکٹر حسین احمد، جو بچوں کے ڈاکٹر ہیں، اس ادھیڑ عمر کے ناتواں کو دیکھنے آ گئے۔ ان کے توسط سے ڈاکٹر گپتا کو جواہر لال میڈیکل کالج میں دکھایا۔ ہر قسم کے ٹیسٹ تجویز ہوئے۔ E.C.G. ہوا۔ بعد کو تشخیص ہوئی کہ خون میں شکر کی زیادتی اور فربہی کی وجہ سے یہ دورا پڑا تھا۔ غذائی احتیاط اور بندشیں سخت کر دی گئیں۔ کچھ عرصے کے لیے لٹا دیا گیا اور حکم ملا کہ بالائی منزل کی رہائش چھوڑ کر پلنگ اور بستر نیچے لایا جائے۔ کھوڑ میں کھاج یہ ہوئی گھٹنوں میں درد رہنے لگا۔ ہڈیوں کے ڈاکٹروں، ڈاکٹر عباس اور ڈاکٹر صادق کو دکھایا۔ صادق صاحب نے کمال صفائی سے کہا "ڈاکٹر صاحب ہم لوگ آپ کا علاج کر سکتے ہیں لیکن اس مرض میں مکمل شفا ناممکن ہے"۔ میڈیکل کالج سے یہ سُن کر بہت نڈھال تھا، اس لیے کہ میں اپنے پاؤں کو قلب سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ بہرحال اب میری دوڑ قلب اور ہڈیوں کے ماہرین کے درمیان تھی۔ ایک اعتبار سے جواہر لال میڈیکل کالج کا قیام، علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔ میں اس نعمت سے بارہا بہرہ ور ہوا ہوں۔

میں نہایت پکّے ارادے کا انسان ہوں، بشرطیکہ کسی قسم کی چنوتی کا سامنا ہو۔ زندگی میں عموماً کترا جانے کا قائل ہوں لیکن جب مقابلہ آ جاتا ہے تو ڈٹ کر کرتا ہوں۔ جب ہڈیوں کے ڈاکٹر صاحبان نے مایوسی کا چیلنج پیش کیا تو میں نے طے کر لیا کہ میں اس کا مقابلہ کر کے رہوں گا۔ اس کے بعد وزن کو کم کرنے کا ایک باقاعدہ پروگرام بنایا اور غذا کے سلسلے میں اس قدر احتیاط کی کہ کوئی صوفی یا سادھو بھی کیا کرے گا۔ چند مہینوں میں ۱۵ کلو وزن کم کر لیا۔ رفتہ رفتہ پابندی سے ٹہلنا اور ہلکی ورزش بھی شروع کر دی۔ قبلہ قلب کی جانب سے تو مطمئن ہو چکا تھا، غذا اور ورزش کی احتیاط و پابندی نے پانووں

کا بھی مزاج ٹھیک کر دیا۔ وزن کم ہو جانے کی وجہ سے جوانی کے خط و خال ابھر آئے۔ طبّی مشورے پر میں بالائی منزل سے نیچے آ گیا تھا۔ اس سے مجھے سخت کوفت تھی اس لیے کہ میرا کتب خانہ بالائی پر نیچے آ گیا تھا، جس کا نقشہ مکان تعمیر کرتے وقت میں نے خود بنایا تھا۔ اس کی صدر کھڑکی کھلے میدان کی جانب کھلتی تھی جہاں سے میں، اقبال ہال بننے تک، مسلم یونیورسٹی کے قبرستان کا نظارہ کر سکتا تھا۔ یہاں پر پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر عمر الدین جیسی ہستیاں ابدی نیند سو رہی ہیں۔ میں لکھنے پڑھنے سے تھک کر جب قبرستان کی جانب نظر اٹھاتا تو پردۂ خیال پر رشید احمد صدیقی مرحوم کی تصویر ابھر آتی تھی:

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سمائے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

نیچے کی منزل میں آ کر میں اپنے گھر میں اجنبی بن گیا تھا، حالاں کہ وہاں میری بیوی بچیاں سب تھیں۔ تاہم زندگی کو با ہمہ اور بے ہمہ گزارنے کی جو عادت ابتدا سے پڑی تھی اس میں کسی تبدیلی کو برداشت کرنا میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔

صحت یاب ہونے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا اپنا پلنگ اور بستر اوپر کی منزل پر لے گیا جہاں میری رنا زنینانِ حرم تھیں، زینے پر بے تکان چڑھنے لگا۔ قلب، قدم کا اور قدم قلب کا ساتھ ایک آہنگ کے ساتھ دینے لگے اور بقدر ۱۵ کلو سبک سار ہو جانے کی وجہ سے جسم میں پھرتی آ گئی۔

رشید صاحب نے مجھے پھر سے تندرست پا کر جامعہ اردو کا جوا میرے کاندھوں پر لا رکھا۔ جنوری ۷۲ء میں ان ہی کی تحریک سے میں شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر رفیق زکریا امیرِ جامعہ منتخب ہوئے۔ ابھی میں جامعہ اردو کی ذمہ داری پوری طرح سنبھال بھی نہیں پایا تھا کہ ستمبر ۷۲ء میں میرا انتخاب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ہو گیا۔ جب میں رشید صاحب سے "آشیرواد" لینے کے لیے پہنچا اور شکایت کی کہ آپ نے ایک پٹھان کو شیخ بنا دیا اور اب نواب صاحب چھتاری اور جسٹس ہدایت اللہ

نے اسے "ڈبل شیخ" بنادیا، تو کہنے لگے اب لطیفے کو زیادہ سنگین نہ بنایئے اور جامعہ ملیہ کی خدمت کے لیئے کمربستہ ہو جایئے۔ جامعہ کا آپ پر کئی طرح سے حق ہے۔

جامعہ ملیہ کی وائس چانسلری پر میرا انتخاب کس طرح عمل میں آیا۔ اس کی تفصیل میں نے کسی اور باب میں دی ہے۔

لیجئے ایک بار پھر بنجارا لاد چلا۔ پہلے مکان کے لیئے کرایہ دار کی تلاش ہوئی وہ بھی ایک سرکاری دفتر کی شکل میں مل گیا۔ کچھ سامان ساتھ لیا اور باقی کو مکان کے دو کمروں میں بند کیا اور چل دیا۔

مسلم یونیورسٹی سے میرا تعلق قائم رہا اس لیئے کہ جامعہ ملیّہ میں ۵ سال کے ڈپوٹیشن پر گیا تھا۔ دوسرا تعلق جامعہ اردو کا رہا۔ جامعہ اردو کی مجلس عام نے میرا تعلق اس سے نہیں ٹوٹنے دیا اور مجھے ایک بار پھر ۱۹۷۳ء میں شیخ الجامعہ منتخب کر لیا۔ البتہ مقامی طور پر نگرانی کے لیے میری تجویز پر ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی کو نائب شیخ الجامعہ بنا دیا گیا۔ میں ہر مہینے ایک یا دو بار آتا جاتا رہا۔ الحاج عبید الرحمٰن خاں شروانی اعزازی خازن کی حیثیت سے پہلی بار ۱۹۷۳ء میں منتخب ہوئے۔ وہ عرصے تک مسلم یونیورسٹی کے اعزازی خازن رہ چکے تھے اور مالیات کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ ان کا عام رجحان کفایت اور بچت کی جانب تھا۔ وہ خاندانی رشتے کے حوالے سے مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور اسی نسبت سے میں ان کا احترام کرتا۔ ہر بڑے خرچ پر ان کا کفایتی نوٹ لگانا ضروری تھا اس لیئے کہ ان کے خیال میں اس کے بغیر کسی ادارے میں خازن کی وجہ جواز کیا ہے۔ چوں کہ وہ اس حیثیت میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ بھی برسوں کام کر چکے تھے اور ان کے بڑے مداح تھے، لطف لے لے کر سناتے کہ جب میں کسی خرچ پر اپنا کفایتی نوٹ لگاتا تو ذاکر صاحب کہتے: "شروانی صاحب آپ کا اعتراض سر آنکھوں پر لیکن کام بھی ہونا ہے، اس لیئے اب آپ ہی اس کے لیئے راہ نکالیئے۔ اور اس کے بعد میں "ہرا ڈال اور لال نکال" کے جادو سے خرچ کے لیئے کوئی نہ کوئی راستہ پیدا کر دیتا۔

سنانے کو یہ قصہ مجھے سنا گئے، اب میرے ہاتھ ایک ایسی جادو کی چھڑی آ گئی

کہ میں ذاکر صاحب کے حوالے سے اعتراض کرنے والے پر اعتراض کو زائل کرنے کی ذمہ داری ڈال دیتا اور وہ اپنے قلم سے اپنے اعتراض کو کاٹ دیتے۔ اس طرح بات بھی رہ جاتی اور کام بھی ہو جاتا۔

ع ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا

اردو کو میں نے پیشے کے طور پر اختیار کیا تھا، اب وہ میرا مقدر بنتی گئی۔ ہماری زبان کے اداریے لکھتے وقت اس کی تاریخ اور تشکیل کے ساتھ ساتھ اس کی تقدیر پر بھی سوچنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ہر ہر قدم پر اس زبان کے ساتھ کیا کیا بے انصافی کی جارہی ہے۔ میں ہندی کا کبھی مخالف نہیں رہا، میں نے اس زبان کو بڑے چاؤ سے اس زمانے کے علی گڑھ میں سیکھا جب پنڈت رام سروپ شاستری کو ہندی کے طالب علم کی تلاش ہوتی تھی اور آفتاب ہاسٹل سے چپراسی بھیج کر بلایا جاتا تھا۔ ہندی شاعری سے ہی پاکر پہلے پہل مجھے گیت نگاری کی تحریک ملی۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد سے ہندی والوں کا جو رویہ اردو کی جانب رہا ہے اس نے بہت سی اچھی چیزوں میں میرے ایمان کو متزلزل کر دیا ہے۔ ریاستی حکومتوں نے (خاص طور پر اتر پردیش میں) اس کا تعلیمی نظام درہم برہم کر دیا۔ مردم شماری میں اس کے اعداد و شمار طرح طرح کی ترکیبوں سے گھٹا کر لکھے جانے لگے۔ اتر پردیش اور بہار میں اردو بولنے والے اتنے بھی نہیں درج کیے گئے جتنے کہ مسلمان ہیں! ووٹ حاصل کرنے کی خاطر ہر الکشن سے پہلے جھوٹے وعدے کیے گئے۔ اردو والوں سے کہا گیا کہ جب ہر ریاست کے مسلمان وہاں کی زبان اپنا چکے ہیں تو ہندی کے علاقے کے مسلمان ہندی کو کیوں نہیں قبول کرتے۔ آج ملک کی 'ایکتا' اور 'اکھنڈتا' کا کس قدر ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے لیکن اس کے سب سے بڑے دشمن خود ہندی والے ہیں جنھوں نے ملک کی 'ایکتا' اور ہندی زبان کو لازم و ملزوم سمجھ لیا ہے۔ خالصتان کی تحریک کا یہ رنگ نہ ہوتا اگر ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں پنجاب کے ہندوؤں نے اپنی مادری زبان پنجابی کو اپنانے سے انکار نہ کر دیا ہوتا۔ جب یہ صورت نہ چل سکی تو یہ لالچ دیا گیا کہ زبان پنجابی

رہے لیکن اس کے لیے رسم خط دیوناگری تسلیم کیا جائے۔ اردو کے لیے دیوناگری رسم خط کی تحریک یہاں بھی چلائی گئی۔ بہار میں شری جگن ناتھ مشرا نے ریاست کے لسانی ایکٹ میں ترمیم کرا کے جب اردو کو بھی ثانوی زبان کی حیثیت سے داخل کرادیا تو ہندی کے دانشور (دائیں اور بائیں بازو دونوں طرف کے) بلبلا اٹھے۔ مہا دیوی ورما اردو کے خلاف میدان میں کود پڑیں۔ امرت رائے نے اردو کو ایک لسانی انحراف بتایا، جو ولی کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور ما قبل ولی کے ادب کو 'ہندوی' کا نام دے کر ہندی تاریخ ادب کی کڑی بنا دیا۔ ترقی پسند دانشور نامور سنگھ اور ترقی پسند مصنفین نے اردو کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا بلکہ اسے ملک کے لیے بدنصیبی بتایا۔ ڈاکٹر گیان چند جین سے اشارہ پاکر امرت رائے نے اردو کو دستور کے آٹھویں شیڈول میں شامل کرنے کو پہلی لسانی بھول بتایا۔

اس کا جواب صرف یہ ہے کہ 'ذوق تلخ تر' اور گام را تیز تر، کر دیا جائے۔ اس بات کا اعلان کیا جائے کہ اردو اس ملک کی سیکولرزم کی ایک نشانی ہے اور اگر اس کے چاہنے والوں میں 'چند' 'چند' بھی نہ رہیں تب بھی مسلمانوں کی تہذیبی ضرورت کا تقاضا ہے کہ اسے برقرار رکھا جائے۔

میں نے اس دوران اردو سے متعلق جو مضامین لکھے ان میں بار بار کہا کہ تاریخ کے بعض ادوار میں زبان، عقیدہ سے بھی زیادہ کسی جماعت کے تشخص اور بقا کے لیے اہمیت اختیار کرلیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خود اردو والے اپنے لیے اس کو ایک 'قدر' تسلیم کریں۔ جب یہ ان کے لیے 'قدر' کا حکم رکھے گی تو اس کی تعلیم و ترویج ان کا وظیفہ بن جائے گا۔ اردو کے زوال کی ذمہ داری بہت کچھ اغیار پر ہے۔ لیکن تھوڑی بہت خود اردو بولنے والوں پر بھی ہے جس کی انجمنیں، بیورو اور اکادمیاں ذیلی کاموں کو اس کا اصل کام سمجھتی ہیں۔ ہم 'سنگ و خشت' کے لیے مرے مٹتے ہیں اور 'حرف و صوت' کو لائق اعتنا تک نہیں سمجھتے۔ کیا مسلمانوں میں کوئی پنڈت آنند نرائن ملّا جیسا موجود ہے جو ان کی طرح یہ کہہ سکے:

"میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اپنی مادری زبان نہیں چھوڑ سکتا۔"

اردو کے بارے میں میرے تلخ لہجے سے بعض دوستوں کو یہ شبہ ہوا کہ میں اپنی سیکولرزم کی ڈگر سے ہٹ گیا ہوں۔ میں بہ بانگِ دہل اعلان کرتا ہوں کہ میں نہ تو فرقہ وارانہ ذہنیت رکھتا ہوں اور نہ مولویانہ ذہن۔ میں مُلّا ہوں لیکن پنڈت آنند نرائن جیسا اُردو کا مُلّا۔ میں نے جب اپنے اداریوں کے مجموعے "اردو کا المیہ" کا انتساب ان الفاظ میں کیا:

"فریدہ، نادرہ، شاہدہ، زیبا
اور اُن جیسی لاکھوں اردو کی بیٹیوں کے نام جو اپنی مادری
زبان سے محروم کر دی گئی ہیں۔"

تو میرے دوست اور اردو کے قدیم خدمت گزار سری نواس لاہوٹی نے اشارۃً کہا کہ آجکل آپ بہت تلخ نوا ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا کسی بھی جماعت کے لیے "زبان کشی" ہر قسم کی "کشی" سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس طرح آپ ایک نسل کو گونگی بہری بنا دیتے ہیں۔ یہ ہماری بے بسی کی انتہا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دے سکتے۔ ہم انگریزی اور ہندی سیکھنے کے خلاف نہیں لیکن یہ دونوں مادری زبانیں نہیں ہیں۔ مادری زبان میں اپنے بچوں کو تعلیم دینا ہمارا دستوری حق ہے۔ اس دستوری حق کو قانونی حق میں تبدیل کرنا ضروری ہے۔

اردو کے سلسلے میں جو ناانصافی اِس ملک میں ہو رہی ہے اُس نے میری قوم پرستی کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ نہ میرے حق میں مفید ہے اور نہ میرے وطن کے حق میں۔ میں اسے ہندی والوں کی کم نظری اور تھڑدلی سمجھتا ہوں کہ وہ ہندی کی ترویج کے لیے "اردو کُشی" کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انھیں ابھی تک غالباً اپنی زبان پر مکمل بھروسہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ "اُردی" (اُردو + ھندی) جنوبی ایشیا میں لسانی ابلاغ کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکی ہے جس کی تگ و تاز پاکستان (پاکستان و ہند) تک محدود نہیں بلکہ وہ برِّصغیر کی حدود سے باہر نکل کر "سنگاپور" اور عدن اور پورٹ سعید تک پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک لسانی "دمومُنہی" ہے جس کے دونوں روپوں کا برقرار رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ یہ دنیا کی پانچویں عالمی زبان کی حیثیت سے اپنا مقام لے سکے۔

دراصل ہندی والے صرف اُردو سے خائف نہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں۔ تامل، ملیالم، تلگو، مراٹھی، بنگالی، پنجابی وغیرہ کی بڑھتی ہوئی یلغار سے بھی لرزاں و ترساں ہیں۔ اِن سے تو زور نہیں چلتا، بے چاری اردو کے کان اینٹھنے لگتے ہیں۔ کاش وہ تاریخ عالم کے اِس سبق سے آشنا ہوتے!

ع خدا اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

تیرھواں باب

جامعہ ملیہ اسلامیہ (۲)

(۷۳ تا ۱۹۷۸ء)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مدرسۂ ثانوی کا ایک فرار شدہ طالب علم جب چالیس سال کے طویل وقفے کے بعد ۳ رنومبر ۱۹۷۳ء کو اس کے سربراہ کی حیثیت سے وہاں پہنچا تو اُس کے کچھ عجیب طرح کے ملے جلے جذبات تھے۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ جس کرسی پر میں وہ بیٹھ رہا تھا اس پر اس کے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۲۶ تا ۱۹۴۸ء براجمان رہ چکے تھے۔ اِس کرسی تک پہنچانے میں جامعہ ملیہ کی ثلیث کے ایک رکن ڈاکٹر سید عابد حسین کا دستِ غیب تھا۔ وہ میرے بارے میں پروفیسر محمد مجیب کی ۱۹۷۳ء میں مہلک بیماری کے بعد سے سوچ رہے تھے۔ جامعہ ملیہ کے امیرِ جامعہ جسٹس ہدایت اللہ سے خط وکتابت کے ذریعے مجھے متعارف کر رہے تھے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ جسٹس صاحب نے نواب صاحب چھتاری کو سلیکشن کمیٹی کا صدر نامزد کیا ہے تو انھوں نے براہِ راست ان کو بھی لکھا۔ نواب صاحب مجھ سے پہلے سے واقف تھے۔ ان کا ذہن از خود میری جانب کام کر رہا تھا۔ عابد صاحب کی سفارش نے اس کی تصدیق کر دی۔

ایک روز صبح صبح جب نواب صاحب کے چھوٹے صاحبزادے، ابنِ میاں (ابن سعید خاں صاحب)، میرے ہاں اچانک موٹر پر پہنچے تو مجھے تعجب سا ہوا۔ میں نے پوچھا خیریت تو

ہے؟ کہنے لگے نواب صاحب کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ کل جسٹس ہدایت اللہ صاحب کا فون آیا تھا۔ انھوں نے نواب صاحب کو جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر کی انتخاب کمیٹی کے لیے صدر نامزد کیا ہے۔ نواب صاحب نے اسے قبول کر لیا ہے۔ ٹیلیفون کرنے کے فوراً بعد آپ کا نام ان کی زبان پر آیا اور مجھ سے پوچھا کہ وہ کیسے رہیں گے۔ میں نے کہا بہت اچھے رہیں گے لیکن خود ان کی مرضی تو معلوم ہو جائے۔ فرمایا تم ہی یہ کام کرو۔ اس لیے اب آپ کا منشا لینے کے لیے آیا ہوں۔ انتظامی معاملات میری سرشت سے بعید تھے لیکن کچھ نواب صاحب اور عابد صاحب جیسے بزرگوں کی دلچسپی اور کچھ جامعہ ملیہ سے میری قدیم وابستگی، بغیر زیادہ غور کیے' ہاں، کر دی۔ اب مجھے جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر منتخب ہو جانے کا یقین ہو گیا۔

اس سلسلے میں یہاں ایک لطیفہ بیان کرتا چلوں۔ اس کے راوی سید سفارش حسین صاحب تھے جن کو کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کے مزاج میں بڑا درخور تھا۔ اد کھلے میں مقیم ہونے کی وجہ سے وہ اُن کے یہاں ہمہ وقت کے حاضر باش تھے۔ کچھ مشترک علمی دلچسپیوں کی وجہ سے میری بھی ان سے اچھی خاصی ملاقات تھی، اس لیے جب بھی وہ علی گڑھ آتے تو مجھ سے ضرور ملتے۔ ایسی ہی ایک ملاقات میں انھوں نے مجھے روشن علی کے عاشور نامے کی فوٹو نقل عنایت کی تھی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "بھئی ڈاکٹر! آپ کے بارے میں آسمانوں میں مشورے ہو رہے ہیں"۔ میں نے کہا "یعنی چہ"۔ کہنے لگے عابد صاحب اور سیّدین صاحب دونوں کا خیال ہے کہ پروفیسر مجیب کے بعد آپ جامعہ ملیہ آجائیں۔ البتہ زیدی صاحب آپ کے بارے میں کچھ تحفّظاتِ ذہنی رکھتے ہیں۔ ایک دن جب آپ کا تذکرہ اُن سے آیا تو کہنے لگے "میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بڑی صلاحیت کے آدمی ہیں۔ بس یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر یوسف حسین کے بھتیجے ہیں"۔ ڈاکٹر یوسف حسین کی جانب اس اشارہ کا پس منظر یہ تھا کہ جب وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور یوسف صاحب پرو وائس چانسلر، تو دونوں میں شدید اختلاف ہو گیا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ انھوں نے یوسف صاحب سے استعفیٰ طلب کر لیا تھا۔ اس کے بعد سے ان کی رائے یوسف صاحب کے بارے میں اچھی نہیں رہی تھی۔ سفارش صاحب جب اپنی بات کہہ چکے تو میں نے نہایت عاجزانہ انداز میں کہا "سفارش صاحب!

آپ زیدی صاحب کے مقربینِ خاص میں ہیں کیا یہ ممکن نہیں ہوگا کہ ان کے اس اندیشے کے بارے میں میرا جواب ان کے کانوں تک پہنچا دیں"۔ بولے "کیا"؟ میں نے کہا "یہی کہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا بھی بھتیجا ہوں"۔ سفارش صاحب یہ سُن کر بھڑک گئے۔ زیدی صاحب سے جا کر کہا میں نے پوچھا "زیدی صاحب کا جواب؟" کہنے لگے "لاجواب"!

ہاں، تو ۳۰ نومبر ۱۹۷۳ء کی دوپہر جب میں جامعہ ملیہ پہنچا تو یادوں کا ایک ہجوم تھا، میری رہائش کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کا ذاتی مکان کرائے پر لے لیا گیا تھا، اس لیے یادوں کا ہجوم اور بڑھ گیا۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی اور جامعہ میں آشنا چہروں کی تلاش کی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین سامنے کے مکان میں مقیم تھے۔ اُن کے یہاں ایک سے زائد بار حاضری دی اور "نیک وبد" سمجھا۔ میرے اسکول کے استاد اور دارالاقامہ کے نگراں، ارشاد الحق صاحب حیات تھے لیکن بسترِ مرگ پر۔ ان کے یہاں حاضری دی۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور اپنی اس نیت کا اظہار کیا کہ میں کسی دن ان کے یہاں آکر کھانا کھاؤں۔ میں نے کہا "آپ اچھے ہو جائیے، کھانے کے بہت سے مواقع نکلتے رہیں گے"! لیکن ایسا نہ ہو سکا اور وہ جلد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ابتدائی اسکول کے سابق استاد عبدالغفار مدھولی صاحب کے یہاں گیا۔ وہ دمے کے پُرانے مریض تھے لیکن اردو پڑھانے کے اپنے تعلیمی تجربات سے اب تک دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ دفتر میں اپنے پُرانے ساتھیوں میں سے شعیب الرحمٰن صاحب اور عبداللطیف اعظمی صاحب کو پایا۔ شعیب الرحمٰن صاحب، ارشاد الحق صاحب کے بھانجے تھے اور میرے زمانے میں خاکسار منزل کے ایک کمرے میں خاندان کے چند اور بچا پیچ، کے ساتھ ایک بُوا کی نگرانی میں رہتے تھے، میں انھیں اس وقت سے جانتا تھا۔ اس وقت وہ جامعہ ملیہ کے رجسٹرار تھے۔ عبداللطیف اعظمی صاحب شیخ الجامعہ کے سکریٹری کی حیثیت سے پروفیسر محمد مجیب سے مجھے ایک طرح کے 'وِرثہ' میں ملے تھے۔ جامعہ ملیہ ہی کی پیداوار تھے اور ان سے بھی میری پُرانی واقفیت تھی۔ اسمٰعیل خاں صاحب سے ملاقات ہوئی جو میرے

اسکول کے ساتھیوں میں تھے اور اس وقت ٹیچرز ٹریننگ کالج میں استاد تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی آزاد رسول صاحب سے بھی میں اسی وقت سے واقف تھا۔ اب وہ مدرسۂ ابتدائی کے نگراں تھے لیکن کسی اور ہی عالم میں رہتے۔ بچوں کی تربیت سے زیادہ ان کا رُجحان تزکیۂ نفس کی جانب تھا۔ اُنھوں نے ٹین کا ایک شیڈ ڈال کر اسے محمد علی ہال کا نام دے دیا تھا۔ جب جامعہ ملیہ کی جامع مسجد کی تعمیر مکمل ہوگئی اور اس کے لیے مدرسہ ابتدائی کی جانب راستے کی ضرورت ہوئی تو اس میں محمد علی ہال آڑے آیا۔ میں نے اس شیڈ کو ہٹانا چاہا تو انھوں نے بہت واویلا مچایا، فتویٰ دیا کہ شیخ الجامعہ صاحب ایک مسجد کو ڈھا رہے ہیں۔ حالاں کہ صورت حال یہ تھی کہ اس ہال میں نماز بھی ہوتی تھی اور ڈرامے بھی کھیلے جاتے تھے۔ اس لیے میں نے اسے محض خدا کا گھر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ میرا خیال تھا اب جب کہ خدا کا بڑا گھر بن گیا ہے اس کی راہ میں جو بھی رکاوٹ ہو اسے ہٹا دینا چاہیے۔ چنانچہ احتجاج اور فتوے کے باوجود کہ دم وشد اور بچوں کے لیے بڑی مسجد کا راستہ کھل گیا۔ دفتر میں سابقہ بتّو دفتری سے پڑا جو ذاکر صاحب کے زمانے سے شیخ الجامعہ کی پیشی میں تھے لیکن جن کی دلچسپی دفتر کے باہر انّا جائے کی دکان میں زیادہ رہتی تھی۔ پیرانہ سالی کے تمام آثار نمایاں ہونے کے باوجود وہ نہ ریٹائر ہونے پر مُصر تھے۔ چوں کہ ان کی تاریخ پیدائش کا کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں تھا اس لیے انھیں، اسی قسم کے چند اور درجۂ چہارم کے ملازمین کے ساتھ، طبی معائنہ کے سپرد کیا گیا، اور جب ڈاکٹر کی رپورٹ پر انھیں خاصی مہلت دینے کے بعد ریٹائرڈ کیا گیا تو یہ کہتے ہوئے پائے گئے "جناب، جامعہ سے جو نکل گیا وہ کچھ نہ کچھ بن گیا۔ ذاکر صاحب ہی کو دیکھ لیجیے۔ ہم نے بھی اگر جامعہ چھوڑ دی ہوتی تو آج کچھ بن گئے ہوتے"۔ اسی قسم کے 'جامعی' سے سابقہ پڑنے کے بعد ہی رشید احمد صدیقی صاحب نے کہیں لکھا ہے "جب بھی میں جامعہ جاتا ہوں تو مجھے جس قدر اس کے شیخ الجامعہ کا احترام کرنا پڑتا ہے، اسی قدر اُن کے چپراسی کا۔ اس لیے کہ دونوں خادمِ ملّت ہیں"۔

شیخ الجامعہ کی کرسی پر جم کر بیٹھنے کے بعد میں اکثر سوچتا تھا کہ چالیس سال کے عرصے میں جامعہ کیا سے کیا ہوگئی ہے اور میں خود کتنا بدل چکا تھا۔ اسی زمانے

میں میں نے عبدالغفار مدہولی صاحب کی خود نوشت "اک معلّم کی زندگی" کا دوبارہ مطالعہ کیا۔ اس پر پروفیسر مجیب کا مختصر سا پیش لفظ تھا جسے بغور دیکھا۔ مجیب صاحب نے اس میں نہایت ایمانداری سے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے خود کو جامعہ کے مقاصد اور اندازِ نظر سے ہم آہنگ نہ پاتے ہوئے بھی ع حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم' پر عمل کیا ہے۔ اِس کی شہادت ان کے صاحبزادے پروفیسر محمد امین نے بھی اِن الفاظ میں دی ہے :

> "اُن کو اس سے مطلب نہ تھا کہ قوم کی خدمت کریں۔ ان کو اصلیت میں اپنے آپ کو مُصیبت میں ڈالنا تھا جس کو جھیلنے سے ان کو نفسیاتی تسکین ملے۔ یہ فلسفہ بغیر حضرت عیسٰی کی زندگی اور دستووسکی کے خیالات کے گہرے مطالعے کے، مشکل سے سمجھ میں آئے گا۔"
>
> (جامعہ، مجیب نمبر)

یہ امر واقعہ بھی ہے کہ اس ادارے سے زیادہ گہری وابستگی رکھنے والی شخصیتوں ۔یعنی ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین نے اُس کا دامن چھوڑ کر اپنے عمل کے لیے وسیع تر جولاں گاہیں تلاش کرلی تھیں، لیکن اودھ کا یہ 'شیخ'، اور جاگیردارانہ مزاج سے متصف یہ مُنحنی انسان 'گلِ محمد' کی طرح قطب بنا جامعہ میں آخر وقت تک ڈٹا رہا۔ جامعہ ملیہ کا ماحول پروفیسر مجیب کے لیے کئی لحاظ سے اجنبی تھا۔ ایک تو ان کے ذہن کی، جواہر لال نہرو کے ذہن کی طرح 'لامذہبیت'، میں پرورش ہوئی تھی، جب کہ جامعہ ملیہ پر مولانا محمد علی کی اسلامیت کا ٹھپّہ لگا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب اور عابد صاحب، اِس اعتبار سے محمد علی نہیں تھے لیکن دونوں آزاد خیال ہوتے ہوئے، اسلامیت کی چلمن کے پسِ پشت رہتے تھے۔ مجیب صاحب اتنا بھی نہ کر سکے۔ ان کے مذہبی افکار اور ان کی اخلاقیات جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی فضا سے بالکل مختلف تھے۔ البتہ امارت کی آن بان کا تقاضا یہی تھا کہ ؎

اُس فتنہ خو کے در سے نہ اُٹھیں گے اب اسدؔ
اِس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

مسلم یونیورسٹی اگر مسلمانوں کا 'گڑھ' رہا ہے تو جامعہ ملّیہ بھی ان کا 'نگر' ہے۔ قوم پرستی جس کی لہر پر جامعہ ملّیہ وجود میں آئی تھی، وہ بھی اس کی اسلامیت کو نہ دبا سکی۔ اس

اعتبار سے دونوں کے مسائل یکساں ہیں، یعنی ذہین اور محنتی طلبہ کی کمی اور روشن خیال اساتذہ کا فقدان۔ دونوں جگہ واویلا ہوتا ہے کہ اغیار چھائے جا رہے ہیں۔ سائنس، انجینئرنگ اور ایجوکیشن کی فیکلٹیوں میں غیر مسلم طلبہ کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ علی گڑھ کے میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں ہر قسم کی تدابیر کے باوجود غیر مسلم طلبہ کی تعداد کو بڑھنے سے روکنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اعلیٰ سطح پر یہ گھٹ کر غیر مسلم بن جاتا ہے اور اسی نسبت سے اردو کی حیثیت بطور ذریعۂ تعلیم کمزور ہو جاتی ہے۔ اردو ذریعۂ تعلیم جامعہ کے اغراض و مقاصد کا ایک اہم ستون تھا۔ علی گڑھ میں اردو کی جانب سے اغماز سرسید کے آخری دور سے شروع ہو گیا تھا۔ جامعہ کا قیام جن بنیادوں پر عمل میں آیا تھا وہ بھی آزادی ملنے کے فوراً بعد مسمار ہونے لگیں۔ ان دونوں اداروں میں اسلام اور اسلامیت کی خدمت کی لب بہت کی جاتی ہے مگر ان کے اصلی کردار کو صرف اردو ذریعۂ تعلیم کے وسیلے سے بچایا جا سکتا تھا لیکن اس کے لیے دونوں اداروں میں قوت ارادی کمزور ہو چکی ہے اور ہم اس کے لیے طرح طرح کی تاویلیں پیش کرتے رہتے ہیں۔ روزی روٹی کا حوالہ دیتے ہیں اس لیے کہ ہم اردو کی آئینی حیثیت کو ابھی تک نہیں منوا سکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آئین کی رو سے ہم سرکاری امداد سے چلنے والے اداروں کو فرقہ وارانہ خطوط پر ترقی نہیں دے سکتے لیکن کون سے آئین میں لکھا ہے کہ ہم لسانی اور مادری زبان کی بنیادوں پر تعلیمی ادارے قائم نہیں کر سکتے۔

جب میں جامعہ ملیہ پہنچا تو میرے دماغ میں یہ خیالات گھوم رہے تھے۔ اسکولوں کی جانب سے قدرے اطمینان تھا کہ ان میں جامعہ کی روایات باقی تھیں، اور اردو ذریعۂ تعلیم تھی، لیکن کالج کی سطح پر جامعہ کا قوام بالکل بگڑ چکا تھا۔ ہر سطح پر اردو کے ساتھ ہندی ذریعۂ تعلیم کی پخ لگی ہوئی تھی۔ چوں کہ کالج کے درجات میں غیر مسلم طلبہ کا ہجوم تھا اس لیے یہاں بے بسی تھی۔ اردو ذریعۂ تعلیم کو ۱۹۴۷ء کی دہشت انگیزی میں ختم کر کے ہم نے ہندی کے لیے دہانہ خود کھول دیا تھا۔ حالاں کہ جامعہ جیسے اداروں میں ہندی کا مقام انگریزی جیسا ہونا چاہیے تھا یعنی ایک اہم زبان کا، جو نہایت اعلیٰ معیار سے سکھائی

بنائے، ذریعۂ تعلیم کا ہرگز نہیں۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم رو بہ زوال تھا۔ اس کی جگہ بھی اردو کو لینی چاہیئے تھی۔

اردو ایم۔اے کھل چکا تھا لیکن کس مپرسی کے عالم میں تھا۔ اس کے صدرِ شعبہ ریڈر کے گریڈ میں تھے۔ اساتذہ کی تعداد اور استعداد بھی کچھ یوں ہی سی تھی۔ اتفاق سے پہلے ہی کنووکیشن میں یو۔ جی۔ سی۔ کے چیئرمین مسٹر جان کنووکیشن کا خطبہ پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے اپنے خطبے میں جامعہ کی توسیع کی جانب جو اشارے کیے، اس میں اس بات پر زور دیا کہ یہاں کا شعبۂ اردو ملک میں سب سے ممتاز ہونا چاہیئے، اس لیے کہ اردو زبان کی تدریس و ترویج جامعہ ملّیہ کی اساس میں ہے۔ وہ کیرالا کے ایک عیسائی قوم پرست تھے اور جامعہ جیسے قومی اداروں کی تاریخ سے بخوبی واقف تھے۔ بہار سے تشریف لائے تھے وہاں ڈاکٹر ذاکر حسین سے بھی ان کا تعلق رہا تھا۔ مجھے اُن کے خطبے سے اشارہ مل گیا۔ اس لیے چند ہفتے بعد ہی یو۔ جی۔ سی کے دفتر میں حاضر ہوا اور جامعہ کے لیے اردو کی پروفیسری کا تقاضا کیا۔ اس سلسلے میں ان کی ہمدردی دیکھیے کہ فوراً نائب چیئرمین ڈاکٹر ستیش چندر کو بلایا اور ان کے سامنے جامعہ کے لیے اردو کی پروفیسری کی منظوری دے دی۔ یہ کام جس قدر آسانی سے ہو گیا، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں خوش خوش واپس لوٹا اور سب سے پہلے یہ خوش خبری عابد صاحب کو سنائی۔ اب ہم دونوں کو اس جگہ کے لیے ایک فعّال شخص کی تلاش ہوئی جو جامعہ کے شعبۂ اردو کو ملک میں ایک ممتاز جگہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس لیے کہ اس وقت کے ریڈر اور صدر شعبہ پڑھے لکھے انسان ہونے کے باوجود یہ صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ کافی غور و خوض کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پر نظر پڑی جو اس وقت دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر تھے لیکن متنازعہ فیہ شخصیت کے مالک تھے۔ پروفیسر مجیب نے اس جگہ کے لیے ڈاکٹر گیان چند کو بھی امید دلا رکھی تھی چوں کہ جامعہ کے شعبۂ ہندی کے صدر ایک مسلمان تھے، اس لیے ہمارے لیے یہ خیال بھی دلفریبی رکھتا تھا کہ اس طرح اردو کی سیکولر حیثیت زیادہ مضبوط ہوگی، اگر جامعہ جیسے قومی ادارے میں اردو کا سربراہ ایک ہندو ہو۔ ڈاکٹر گیان چند کا نام بھی زیرِ غور رہا، لیکن

علمی صلاحیت رکھنے کے باوجود انھیں اردو کے خُلقیہ (Ethos) کی گوں کا نہ پایا۔ ڈاکٹر محمد حسن بھی اُمیدوار تھے لیکن ان کے بائیں بازو سے انتہائی شغف اور "جوکھٹے" کی فکر کو جامعہ کے ماحول کے لیے مناسب نہیں پایا۔ لہٰذا اوٹ پلٹ کر نظر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہی پر جمی اُن کی اور متنازع فیہ شخصیت کے باوجود۔ ڈاکٹر محمد حسن اس ترجیح پر سخت شاکی ہوئے اور اس کے بعد مجھے پہچاننا چھوڑ دیا۔ میں اِس قسم کی آزادی اپنے دوستوں کو ایک یا دو بار سے زیادہ نہیں دیتا۔ میرے ان کے پُرانے مراسم تھے۔ دہلی یونیورسٹی میں ریڈری کی اسامی پر ان کا تقرر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے بہت سے تحفظاتِ ذہنی کے ساتھ میری ہی سفارش اور ذمہ داری پر کیا تھا۔ اب جو ان کی یہ شانِ بے نیازی دیکھی تو میں بھی خدا بن بیٹھا اور میں نے ان کے وجود ہی کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ یہ میرے ردِّ عمل ہی کا شاید اثر تھا کہ عرصے کے بعد ان کا ایک خط آیا جس میں کچھ شکایت اور کچھ اپنے رویّہ پر شرمندگی تھی وہ چاہتے تھے کہ راہ و رسم کا دروازہ پھر کھل جائے لیکن یہ اس سے زیادہ نہ کھل سکا کہ ہم سر اور ہاتھ کی ہلکی سی جُنبش کے ساتھ ایک دوسرے کو پہچاننے لگے۔

نارنگ صاحب ایک نہایت ذہین انسان ہیں، طلاقتِ لسانی کے ماہر قلم کے قلمکار اور فعال شخصیت کے مالک۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ بلوچستان سے ہجرت کر کے واردِ دہلی ہوئے اور یہیں انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمّل کی۔ بلوچستان میں ان کا ماحول سرتاسر مسلمانوں کا تھا جس کا اثر تاحال ان کی شخصیت سے جھلکتا ہے۔ انھوں نے آتے ہی جامعہ کے شعبۂ اردو میں جان سی ڈال دی۔ ایسے ایسے سیمنار کرائے کہ باید و شاید ملک میں ہر طرف ان کی دھوم مچ گئی۔ اسی زمانے میں مَیں نے اوکھلا روڈ پر جامعہ کالج کے سامنے ایک کوٹھی خرید کر شعبۂ اردو کو دی۔ اس کی تزئین میں انھوں نے اپنا سارا سلیقہ دکھا دیا۔ ہر طرف ان کے انہماک اور کام کا چرچا تھا بجز ایک چھوٹے سے گروہ کے جس کا تعلق بائیں بازو سے تھا اور جو نارنگ کی رسوائی پر شروع سے تُلا ہوا تھا۔ جامعہ کی دیواروں پر لکھا گیا کہ وہ R.A.W کے ایجنٹ ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی کے حوالے سے کردار کُشی کی گئی۔ حالاں کہ ان میں سے اکثر کی ذاتی زندگی اُن سے بدتر تھی۔ اور جب دیکھا کہ اس پروپیگنڈے کا شیخ الجامعہ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو پھر شیخ الجامعہ کو

ہدف بنایا جانے لگا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نارنگ صاحب کے ایک استقبالیہ میں میں نے ان کو جامعہ میں خوش آمدید کہتے ہوئے کہا تھا "نارنگ جامعہ کے لیے اور جامعہ نارنگ صاحب کے لیے، ایک چیلنج ہیں۔ دیکھیے دونوں ایک دوسرے سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں"۔ آج اپنا وہ قول مجھے رہ رہ کر یاد آرہا تھا۔ بائیں بازو کے گروہ کے سرغنہ کالج آف ایجوکیشن کے پرنسپل ڈاکٹر سلامت اللہ تھے جو خود وائس چانسلری کے امیدوار تھے۔ مجھے شروع سے ان سے بھی نبٹنا پڑا۔ ابتدا میں مجھے جامعہ کے وسیع حلقے کی تائید حاصل رہی۔ اس لیے یہ گروہ سوائے غلط پروپیگنڈے کے اور کچھ نہ کرسکا۔ لیکن ۷۷ء میں نارنگ صاحب سے ایک بڑی چوک ہوگئی جس کا تذکرہ میں بعد کو کروں گا، پہلے درجہ چہارم کے ملازمین کی سرگرمیوں کا حال بیان کردوں۔ ان کی ایسوسی ایشن پر ایک کلرک   صاحب نے قبضہ کر رکھا تھا، جو اس کے فنڈ پر صبح سے شام تک سگرٹوں کا دھواں اڑاتے پھرتے اور ٹیکسیوں پر سوار وزارت تعلیم کے دفتر کے چکر لگاتے رہتے۔ میں نے اپنی عمر میں اُن سے چلتر انسان نہیں دیکھا۔ انھیں اپنی لیڈری کو قائم رکھنے کے لیے بہت سے گُر آتے تھے۔ شروع شروع میں میں نے 'جامعہ اسپرٹ' میں ان ملازمین کے مسائل کو ہمدردی سے حل کرنے کی کوشش کی۔ جامعہ کے محدود وسائل کے اندر ان کے جائز مطالبات کو پورا کیا۔ جو مانگیں پوری نہ کرسکا ان کے لیے یو۔جی۔سی۔ کو سفارشی خطوط لکھے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کچھ ہی دنوں کے بعد ایک روز پھر شیخ الجامعہ کے دفتر کے باہر نعروں کا شور سنائی دیا۔ معلوم ہوا کہ   اپنے گرگوں کے ساتھ ہنگامہ آرا ہیں اور مجھ سے ملنے کے خواہش مند۔ ان سے کہا گیا کہ صرف ۵، ۶ اراکین پر مشتمل ایک وفد شیخ الجامعہ کے دفتر میں ملنے کے لیے آسکتا ہے۔   صاحب مسکراتے ہوئے تشریف لائے۔ انھیں آداب مجلس ازبر تھے۔ اس لیے تلخی کلام کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ انھوں نے ایک بار پھر اپنی مانگوں کو نمبر وار دہرایا۔ میں نے کہا میں آپ کی پندرہ مانگوں میں دس پوری کرچکا ہوں باقی پانچ کے لیے یو۔جی۔سی۔ اور وزارت تعلیم کو لکھ چکا ہوں۔ اب کیا شکایت رہ گئی ہے۔ کہنے لگے شیخ الجامعہ صاحب اب بھی ہماری پانچ نہیں، پندرہ مانگیں ہیں۔ میں نے کہا "یہ کیونکر؟"

کہا کہ دس نئی مانگیں شامل کر کے پندرہ کی لسٹ پھر پوری کر دی گئی ہے۔ میں نے کہا "بہت خوب! یہ تو شیطان کی آنت کی طرح کبھی بھی ختم نہیں ہوں گی" ہنس کر بولے "شیخ الجامعہ صاحب! ہمارا کام ہے مانگیں پیدا کرنا اور آپ کا کام ہے انھیں پورا کرنا" جس دن یہ ختم ہو جائیں گی اس دن ہماری لیڈری بھی ختم ہو جائے گی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سکتے میں آ گیا لیکن بہت جلد سمجھ گیا اور اس کے بعد میں نے "جامعہ اسپرٹ" میں مسائل حل کرنے کے فلسفہ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

اب میرے اور درجۂ چہارم کے ملازمین کے درمیان زور آزمائی کا آغاز ہو گیا۔ میں نے مجلس منتظمہ میں درجۂ چہارم کے ملازمین کے آئین میں تبدیلیاں کرادیں۔ یہ دفعہ داخل کرادی کہ ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کا درجۂ چہارم کے ملازمین سے ہونا ضروری ہے۔ اس طرح صاحب کی لیڈری کو ختم کر دیا۔ ان کو بامصرف بنانے اور مصروف رکھنے کے لیے ان کا تبادلہ کر دیا۔ لیکن شورش کا سلسلہ جاری رہا اور اب وہ زور سے ڈوریاں کھینچ کر کٹ پتلیوں کا تماشا کرنے لگے۔ ملک کی بدقسمتی اور وائس چانسلروں کی خوش قسمتی سے ۱۹۷۵ء میں اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کا اعلان کیا۔ اب ہر قسم کے احتجاجی کھیل تماشے بند تھے۔ ایک دو بار ان لوگوں نے کروٹ لینے کی کوشش کی تو اوکھلے کے تھانے دار نے بلا کر دھمکا دیا اس کے بعد چوہوں کی طرح سب بلوں میں گھس گئے۔ اگلے دو سال امن سے گزر گئے۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں اچانک ایمرجنسی ختم کر دی گئی۔ دوسرے ہی روز شیخ الجامعہ کے دفتر کے سامنے نعرہ بازی ہو رہی تھی، اس بار انتقامی جذبے کے ساتھ!

اب میں "واقعۂ نارنگ" کی جانب رجوع کرتا ہوں جس کا سرا اٹھا کر چھوڑ دیا تھا۔ نارنگ صاحب کے بارے میں لکھ چکا ہوں کہ انھیں ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت دوسرے بعض اچھے اساتذۂ اردو پر ترجیح دے کر جامعہ ملیہ لایا گیا تھا۔ ہم لوگوں کو یہ بھی علم تھا کہ وہ ایک متنازعہ فیہ شخصیت رہے ہیں۔ وہ ایک حوصلہ مند مگر انسان ہیں۔ طبیعت میں خود پسندی اور شدت ہے۔ یہ مثبت ہوتی ہے تو وہ کارہائے نمایاں کر بیٹھتے ہیں جب منفی ہو جاتی

توجارحانہ انداز اختیار کرلیتی ہے۔

جامعہ میں ایک دو سال تو ان کے اچھے گزرے، صرف بائیں بازو کا گروہ ان کے خلاف پروپیگنڈا کرتا رہا۔ اب اس میں وہ لوگ بھی شریک ہوگئے جو ان کی بے پناہ توانائی اور فعالیت سے خائف تھے۔ جامعہ کے اساتذہ میں ایک طبقہ نااہلوں کا ایسا بھی تھا جو نہ خود کام کرنا چاہتا تھا نہ کسی کو کام کرنے دینے کا قائل تھا۔ ان کی قوت ان کی گروہ بندی میں تھی۔ چنانچہ عام تائید حاصل کرنے کے لیے انھوں نے نارنگ صاحب پر اب فرقہ داریت کا الزام لگانا شروع کردیا۔ میں ذاتی علم کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ نارنگ صاحب فرقہ وارانہ ذہن نہیں رکھتے۔ لیکن جب دیگر اساتذہ نے ان کے خلاف اس حربے کو استعمال کرنا چاہا تو پھر انھوں نے بھی اس کے استعمال میں دریغ نہیں کیا۔ جامعہ کالج میں ہندو طلبہ کا تعلق بیشتر سماج کے ان طبقات سے تھا جہاں فرقہ داریت کے جذبات عام تھے۔ وہ جامعہ کی روایات سے بھی واقف نہیں تھے، نہ اس کے خُلقیہ سے۔ انھیں میں ایک شورہ پشت نوجوان   تھا جس کا تعلق پاس پڑوس کے ایک گاؤں سے تھا۔ میں اُسے شورہ پشت اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ ہمیشہ جامعہ کو بدنام کرنے کے درپے رہتا۔ ایک بار اُس نے سیڑھیاں لگا کر جامعہ کالج کی تمام عمارتوں پر نعرے لکھ دیئے تھے۔ جب میں نے اس سے باز پرس کی تو ہنس کر کہا "شیخ الجامعہ صاحب ان عمارتوں پر کئی سال سے قلعی اور رنگ نہیں ہوا ہے۔ چاہتا ہوں کہ اسی طرح ہو جائے!" خیر تو نارنگ صاحب نے سیاست کا جواب سیاست سے دینے کے لیے اُس سے اور اُس جیسے چند طالب علموں سے ربط ضبط پیدا کیا اور جامعہ میں "مسلم فرقہ داریت" کے نقطے پر دونوں ہم رائے ہوگئے۔ اس شورہ پشت نے اس کی اطلاع   کے شعبے کے (جہاں وہ طالب علم تھا) ایک مسلمان استاد   صاحب کو دی جو نارنگ صاحب کی تاک میں تھے۔ دونوں میں سانٹھ گانٹھ ہوئی۔ انھوں نے اسے امتحان میں بہت اونچے نمبر دینے کا وعدہ کیا اور اس نے نارنگ صاحب کی گفتگو کو ٹیپ کرنے کی پیش کش کی۔ چنانچہ اسے ایک نہایت اثر پذیر

ٹیپ ریکارڈر فراہم کیا گیا۔ اس نے پلان کے مطابق نارنگ صاحب کو ٹیلیفون کیا۔ گفتگو کا سلسلہ جامعہ ملیہ سے شروع ہوا اور یہاں ہندو طالب علموں سے جو تعصب برتا جاتا ہے اس سے ہوتا ہوا بعض اشخاص تک جا پہنچا۔ جن کے بارے میں اس نے اس انداز سے سوالات کیے کہ نارنگ صاحب کھل گئے۔ ٹیلیفون پر گفتگو کا یہ سلسلہ تقریباً آدھ گھنٹے چلتا رہا اور ٹیپ ہوتا رہا۔ نارنگ صاحب کو یہ سان وگمان بھی نہ ہوا کہ میری صدا بندی کی جا رہی ہے۔ غرض کہ اس نے اپنے سوالات سے ان سے ایسے جوابات حاصل کر لیے جن سے ان کے دل کی بات کا پتہ چلتا تھا۔ یہ ٹیپ اس نے، اس امید میں کہ اب تو مجھے بی۔ اے۔ میں فرسٹ کلاس مل ہی جائے گا، اپنے کے استاد کو لا کر دیا۔ وہ دوسرے دن فاتحانہ انداز میں میرے مکان پر آئے اور بولے "شیخ الجامعہ صاحب! میں آپ کو ایک ٹیپ سنانا چاہتا ہوں" ٹیپ ریکارڈر ان کے ساتھ تھا۔ میں نے سنا تو حیرت میں رہ گیا۔ لیکن گولی بندوق سے نکل چکی تھی۔ اس کے بعد وہ ٹیپ جگہ جگہ سنایا گیا۔ ٹیپ سے مزید ٹیپ بنائے گئے اور اب وہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ بڑے بڑے مجمعوں کو سنایا جانے لگا۔ مجھ سے مانگ کی گئی کہ مجلس عاملہ کا خصوصی جلسہ طلب کر کے نارنگ صاحب کو فوری طور پر معطل کیا جائے۔ مجلس عاملہ کے اراکین نے بھی نارنگ صاحب کا ٹیپ سنا۔ میں نے تجویز کیا کہ معطل کرنے کے بجائے عاملہ یک نفری تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دے۔ اس لیے واقعہ کا ثبوت تو آپ لوگوں کے پاس محفوظ ہے، نارنگ صاحب برسرِ کار رہتے ہوئے، اس پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ لیکن میری اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا اور اب ایجی ٹیشن کی رفتار تیز تر کر دی گئی۔ میں اپنی تجویز پر اڑا رہا اور کہتا رہا کہ جامعہ برادری اس سے قبل جامعہ کی عمارتوں پر جو کچھ ان کے بارے میں لکھتی رہی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ سخت تھا جو کچھ کہ نارنگ صاحب نے جامعہ کے بعض اصحاب کے بارے میں ٹیلیفون پر کہا ہے۔

بہر حال ہنگامہ آرائی بڑھتی رہی اور اب ہمہ وقتی سیاست بازوں نے اس کا رُخ، نارنگ صاحب کے بجائے میری جانب پھیر دیا۔ صدورِ شعبہ کا ایک خفیہ جلسہ ہوا جس میں میرے خلاف عدمِ اعتماد کا میمورنڈم تیار کیا گیا اور وہ اشوکا ہوٹل جا کر جسٹس

ہدایت اللہ امیر جامعہ کی خدمت میں پیش کیا، جو اتفاق سے اس وقت دہلی آئے ہوئے تھے۔ مجھے اس وقت اس کا علم نہ ہوسکا۔ البتہ کچھ روز کے بعد جب میرا بمبئی جانا ہوا اور امیر جامعہ کے مکان پر "تعظیمی ملاقات" کے لیے گیا تو انھوں نے مجھے اپنے دفتر میں بُلا لیا۔ جوں ہی میں سامنے کی کرسی پر بیٹھا انھوں نے دراز سے ایک فائل نکال کر دی اور کہا "آپ جب تک اس پر نظر ڈالیے، میں زیرِ قلم تحریر کو ختم کرلوں"۔ یہ وہی میمورنڈم تھا جو صدورِ شعبہ نے اکھیل شوکا ہوٹل میں دیا تھا۔ اس میں "واقعۂ نارنگ" کی تفصیل دینے کے بعد آخر میں یہ جملہ تھا "ہم لوگ شیخ الجامعہ پر اپنا اعتماد کھو چکے ہیں"۔ نیچے دستخط دیکھے تو نام بنام تھے۔ صرف میرِ کارواں، یعنی پرنسپل جامعہ کالج ضیاء الحسن فاروقی صاحب کے نہیں تھے جنھوں نے امیر جامعہ تک اساتذہ کی رہبری کی تھی۔ ایک دو صدورِ شعبہ کے بھی نہیں تھے۔ امیرِ جامعہ جب اپنے کام سے فارغ ہوگئے تو میں نے ان سے اس مسئلے پر گفتگو کرنی چاہی۔ انھوں نے اغماز کیا اور میمورنڈم کو اس لائق تک نہیں سمجھا کہ مجھ سے تفصیلات تک پوچھتے اتنے میں بھبھکتی ہوئی کافی کے دو پیالے آگئے اور ہم لوگ اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔

جسٹس ہدایت اللہ کا مجھ پر اور میرا ان پر جو اعتماد تھا وہ اور بڑھ گیا۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ پونے پانچ سال کے عرصے میں، جو میں نے ان کے ساتھ گزارا، ایک بار بھی انھوں نے میرے کام میں مداخلت نہیں کی۔ حالاں کہ آجکل تو چانسلروں کا یہ معمول ہوگیا ہے کہ وائس چانسلر کی نکیل اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں "جسٹس" تھے جو معاملات سے خود کو ایک معروضی بلندی پر رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ امیر جامعہ، شیخ الجامعہ کی مدد کے لیے ہوتا ہے نہ کہ اس کے کاموں میں روڑے اٹکانے کے لیے۔

نارنگ صاحب کے خلاف جامعہ میں تحریک جب کسی طرح ختم ہوتی نظر نہ آئی تو مجھے پولیس کے مشورے پر تین اساتذہ اور ایک طالب علم کے مچلکوں کے لیے اجازت دینی پڑی۔ اس کے بعد خدا خدا کرکے دن رات کے وہ میلے ختم ہوئے جہاں ٹیپ بجا کر نارنگ صاحب کے خلاف جذبات کو بھڑکایا جاتا تھا۔ واقعۂ نارنگ پر سب سے اچھا تبصرہ امیر جامعہ ہی نے کیا۔ ایک ملاقات میں کہنے لگے "مسعود صاحب! یہ پروفیسر صاحبان کتنے عقل مند لوگ

ہوتے ہیں کہ طالب علموں سے آدھ آدھ گھنٹہ ٹیلیفون پر بات کرتے ہیں اور ان کا عندیہ نہیں سمجھ پاتے ہ"

ہنگامہ آرائی کی شکل تو ختم ہو گئی لیکن مہلکوں کی وجہ سے میرے خلاف تحریک خفیہ انداز میں چلتی رہی۔ میں بھی اب جامعہ سے بددل ہو چکا تھا۔ جون ۷۷ء میں تو میں نے تقریباً طے سا کر لیا تھا کہ مجھے اپنی پروفیسری پر علی گڑھ واپس چلا جانا چاہیے، جس کا تذکرہ میں نے اپنے سیکریٹری عبداللطیف اعظمی صاحب سے کیا بھی تھا۔ لیکن جسٹس ہدایت اللہ صاحب کے اصرار پر اپنا یہ ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔ مجھے سب سے زیادہ ملال اس بات کا تھا کہ جن شاخوں پر آشیانہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ کچھ لوگ جو چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے تھے، بے جھجک سامنے آ گئے۔ بعض نے طلبہ کو جھڑ کا نا اپنا پیشہ سا بنا لیا۔ چنانچہ جب ایک بار طلبہ کا ہجوم نعرے مارتا ہوا میری رہائش گاہ کی جانب بڑھا تو یہ ان کے ساتھ تھے۔ جامعہ کے استادوں میں بعض

مجھے ان سب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے باوجود جامعہ کے اساتذہ اور اہلکاروں کا پرخلوص اور سمجھدار طبقہ میرے ساتھ رہا۔ انھیں کی مدد سے میں جامعہ کو اس پر آشوب دور سے نکال سکا۔

میں نے نہ صرف شعبۂ اردو کی از سر نو تنظیم کی بلکہ بعض حضرات نے 'اسکولوں' کے نام پر جو چھوٹی چھوٹی جاگیریں بنا رکھی تھیں انھیں توڑ کر فیکلٹی سسٹم جاری کیا۔ اس سے بعض مفاد پرستوں پر زد پڑی۔ انھیں میں سے ایک صاحب' جن کی پہنچ وزارت تعلیم تک تھی' اس کے ڈائریکٹر تک پہنچ گئے' اور ان کے کان بھر دیئے۔ چنانچہ شری انل بوردیا، جو اب تک ہماری جانب نرم گوشہ رکھتے تھے اور جامعہ کی مجلس عاملہ کے نامزد سرکاری رکن تھے، اللہ کے بھروسے میں آ کر میری تعلیمی اصلاح کی مخالفت کرنے لگے۔ چوں کہ اس معاملے میں مجلس کی اکثریت نے میرا ساتھ دیا اس لیے اس وقت تو دال نہ گلی لیکن آئندہ چل کر جامعہ کے ہر کام میں روڑے اٹکانا ان کا معمول سا ہو گیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ بیوروکریسی اپنی ہمہ دانی کے زعم میں کس طرح تعلیمی اداروں کا ناک میں دم کر سکتی ہے، خاص کر

اگران کے سربراہوں کی سیاسی پہنچ وزیر تعلیم تک نہ ہو، اس سے قبل میرا ٹکراؤ، نورالحسن صاحب کے دورانِ وزارت میں ڈائریکٹر شری چنکارا سے ہو چکا تھا، اور مجھے سید حامد حسین اور کرنل بشیر حسین زیدی کے ساتھ ان کی شکایت کرنے کے لیے ان کے بنگلے پر جانا پڑا تھا۔ نورالحسن صاحب نے ہماری شکایتیں سن کر جہاں بہت سی باتیں کیں ایک دلچسپ بات یہ بھی کہی تھی کہ مقابلہ پٹھان کا پٹھان سے ہے صرف مسلم اور ہندو پٹھان کا فرق ہے۔ اشارہ تھا میرے پٹھان ہونے کی طرف اور شری چنکارا کے صوبہ سرحد سے آئے ہوئے شرنارتھی ہونے کی جانب۔ جب شری چنکارا ریٹائرڈ ہو گئے تو امیر جامعہ نے بھی سانس لے کر کہا:

"چلئے جامعہ کا چنکارا سے چھٹکارا ہو گیا۔"

میری وائس چانسلری کا آخری نصف سال، یعنی ۱۹۷۸ء کا نصف اول زیادہ پر آشوب تھا۔ اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر علی محمد خسرو صاحب نے بڑی اچھی بات کہی تھی۔ اُن کے خیال میں ہر وائس چانسلر کے پہلے ایک دو سال ہنی مون کے ہوتے ہیں۔ تیسرے سال سے خانگی زندگی کی سی کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی ہے جو آخری سال میں شورش بن جاتی ہے۔ میں اب اپنی وائس چانسلری کے آخری سال سے گزر رہا تھا، ایمرجنسی ختم ہو چکی تھی۔ شر پسند اساتذہ اور درجۂ چہارم کے ملازمین دونوں مخالفت کے پلیٹ فارم پر یکجا ہو گئے تھے۔ چلتے چلتے میں نے امیر جامعہ کو خط لکھ کر، آئین کی ایک دفعہ سے فائدہ اٹھا کر جامعہ پر انکوائری بٹھا دی۔ اس کے لیے میں نے شبانہ روز محنت کر کے اپنے معتمد علیہ اسسٹنٹ شعیب احمد خاں کی مدد سے اساتذہ کی ذاتی فائلوں کا مطالعہ کیا اور فرداً فرداً مواد جمع کیا۔ ان دفینوں سے عجیب عجیب خزینے برآمد ہوئے۔ کسی نے فائل سے ہائی اسکول کا سارٹیفکٹ غائب کرا کے اپنی تاریخ پیدائش بدلوا دی تھی۔ وہ استاد ایسے ملے جو ۱۹۱۹ سال سے پی۔ ایچ۔ ڈی میں نام کا اندراج کرائے ہوئے تھے اور ان کے قلم سے تاحال چند صفحات تک برآمد نہیں ہوئے تھے۔ ایک صاحب ہائی اسکول تا ایم۔ اے تھرڈ ڈیژن سے سرفراز تھے لیکن پروفیسر بنے بیٹھے تھے وغیرہ وغیرہ۔

جسٹس ہدایت اللہ صاحب نے سپریم کورٹ کے ایک جج مرتضیٰ فضل علی صاحب

کو انکوائری کے لیے مقرر کیا۔ ان کی کوٹھی پر میرے اور متعلقہ حضرات کے بیانات لیے گئے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ سپریم کورٹ کا جج بھی 'آدمی' ہوتا ہے! آخر آخر میں انھوں نے انکوائری سے یہ کہہ کر کنارہ کشی کر لی کہ میں برسرکار جج ہوں اس لیے فیصلہ نہیں دے سکتا۔ ہدایت اللہ صاحب نے ان کے بعد سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس ایم ایم بیگ صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس کام کا تکملہ کر دیں۔ ظاہر ہے ان کو انکوائری کا جو مواد دیا گیا تھا اس کی روشنی میں وہ اپنی رائے دے سکتے تھے۔ تاہم انھوں نے بعض حضرات کو سرزنش کی اور بعض کی غلط کاریوں کو نمایاں کیا۔

ان تمام کاموں میں ۱۹۷۸ء کا نصف سال گزر گیا۔ میری وائس چانسلری کی پنج سالہ مدت ۳۰ نومبر ۱۹۷۸ء کو ختم ہو رہی تھی۔ لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ ۱۵ اگست میرے لیے بھی یوم آزادی ہوگا اور میں دو سال کے بعد تقرر پر مسلم یونیورسٹی چلا جاؤں گا۔ میں نے اس عندیے سے امیر جامعہ کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں ایسا نہ کروں، اور کم از کم اپنی باقی ماندہ مدت پوری کر لوں۔ اس کے لیے انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر علی محمد خسرو کو لکھا یا ٹیلیفون پر بات کی۔ خسرو صاحب نے اس کی فوراً اجازت دے دی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں امیر جامعہ کی خواہش پوری نہ کر سکا اور ۱۵ اگست کی تاریخ کو آگے نہ بڑھا سکا۔

اس سے کچھ پہلے جامعہ کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ تھا جو حالات کے پیشِ نظر میری رہائش گاہ ہی پر رکھا گیا تھا۔ اس میں جسٹس بیگ کی رپورٹ پیش ہونا تھی۔ جامعہ میں مشہور ہو گیا تھا کہ کئی اساتذہ کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ ان اساتذہ نے اس خوف و تردّد کے پیشِ نظر میری رہائش گاہ کے سامنے ایک مظاہرے کی تنظیم کی۔ پولیس کا انتظام تھا اس لیے احاطے میں داخل ہونے کی کسی نے ہمت نہیں کی۔ برآمدے سے ہم مظاہرین کو دیکھتے رہے۔ عجب عجب چہرے نظر آئے وہ بھی جو کچھ عرصہ پہلے تک میرے ساتھ سائے کی طرح چلتے تھے، وہ بھی جن کے بارے میں مجھے کہنا پڑا "تو بھی اے بروٹس!"

مجلسِ منتظمہ کے جلسے میں وزارتِ تعلیم کے نمائندے شری پنڈتا نے میری خدمات اور ان اقدام کو سراہتے ہوئے جو میں نے پچھلے چند سالوں میں جامعہ کے نظم و ضبط کے سلسلے میں کئے تھے، ایک تحسینی ریزولیوشن پیش کیا جو اتفاق رائے سے منظور ہوا۔ جسٹس بیگ کی سفارشات پر غور کیا گیا اور انھیں یہ کہہ کر ملتوی کر دیا گیا کہ چوں کہ وائس چانسلر جامعہ کی ملازمت سے سبک دوش ہو رہے ہیں اس لیئے ان پر پھر کبھی غور کیا جائے۔ اس کے بعد وہ جامعہ کے سرد خانے میں چلی گئیں۔

جامعہ ملیہ کے دوران قیام جہاں اور بہت سے فائدے ہوئے۔ مجھے بیرونِ ملک سفر کرنے کے کئی مواقع بھی ملے۔ ان میں سعودی عرب کے دو سفر یادگار ہیں۔ پہلا سفر میں نے ۱۹۷۶ء میں سرکاری حج ڈیلیگیشن کے رکن کی حیثیت سے کیا تھا۔ ڈاکٹر سید محمد، جو اس وقت محکمۂ قانون میں ریاستی وزیر کے عہدہ پر فائز تھے اس کے لیڈر تھے۔ ان کے ہمراہ ان کی دوسری نوجوان بیگم تھیں۔ اسکی ایک رکن آسام کی وزیر بیگم انورہ تیمور تھیں

ڈاکٹر سید محمد بہت خلیق مگر تند مزاج کے انسان تھے۔ جدّہ پہنچتے ہی ان کا اختلاف ہندوستانی سفیر قریشی صاحب سے ہو گیا، جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ سفیر صاحب کو اپنے آئی۔سی۔ایس ہونے کا زعم تھا اور سید محمد صاحب کو اپنی وزارت کا۔ کسی وجہ سے وہ میرا بڑا خیال کرتے تھے اس لیے اپنے دل کی بات مجھ سے کہہ دیتے تھے۔ اِدھر ہندوستانی سفارت خانے میں ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کے چھوٹے بھائی انعام الرحمٰن تھے جو سفیر صاحب کے بہت قریب تھے۔ میری ان سے پرانی واقفیت تھی۔ چنانچہ ہر روز ہم ایک دوسرے سے مشورہ کرتے اور کوشش کرتے کہ باہم ہندوستان دونوں میں ٹکراؤ کی نوبت نہ آنے پائے۔

مکّہ مکرّمہ میں وفد کے قیام کے لیئے قریب کے ایک فندق (ہوٹل) میں ہمارا

ریزرویشن تھا۔ کھانا بہت مہنگا تھا جس کے لیے ہمیں سرکاری طور پر جو بھتہ دیا جاتا تھا وہ سخت ناکافی تھا۔ آخر میں ہمیں سیدنا طاہر سیف الدین کے رباط کی فیاضی پر گذر بسر کرنا پڑا جہاں سے دونوں وقت کھانا مفت آجاتا تھا۔

اب حج کا ہنگام آگیا۔ نہ صرف حرم کے اندر بلکہ شہر مکہ میں حاجیوں کی وہ ریل پیل تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ شام کو سوق اللیل میں داد و ستد کا وہ بازار گرم ہوتا کہ معلوم ہوتا تھا حج کا اصل مقصد تجارت ہے۔ حرم کے پاس ایک پیلے رنگ کی دو منزلہ عمارت تھی جس میں اوقاف کا دفتر تھا۔ اس پر پتھر کی تختی پر کندہ تھا کہ یہ جائے پیدائش حضرت محمدؐ کی ہے۔ مجھے 'وہابیت' کا یہ رویہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی۔ کہاں سرکار مدینہ کا مولد اور کہاں یہ سرکاری دفتر۔ آخر ہمارا ایمان اتنا کمزور تو نہیں کہ ہم مولد رسول کی پرستش کرنے لگیں۔ مکہ کا وہ قبرستان جا کر دیکھا جہاں حضرت خدیجہ اور دوسرے اکابرینِ امت دفن تھے۔ سب ہموار اور بے نشان۔ طوافِ کعبہ کے لیے حرم شریف میں داخل ہوا تو دیدکے پروانوں کا وہ ہجوم کہ اللہ کی پناہ۔ ہر شخص مصروفِ طواف تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ افریقہ اور الجیریا کے دیو قامت قوی ہیکل سورما عورتوں اور ضعیفوں کے پاؤں کچلتے ہوئے ایسے نکل جاتے تھے کہ دنیا و مافیہا کی خبر تک نہ ہوتی۔ طوافِ کعبہ کرنے کے بعد ہر شخص کا ہدف حجرِ اسود کا بوسہ تھا۔ کعبے کی سیڑھیوں پر غلاف کا سرا پکڑے ایک حاجب بیٹھا رہتا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ بند مٹھی اس کی طرف بڑھاتے ہیں۔ کچھ دست بدست منتقل ہو جاتا۔ اور وہ اس مومن کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کو اپنے ہاتھ سے ہٹاتا ہوا ایک لمحے کے لیے اس کے لب سنگِ اسود تک پہنچا دیتا، جو کثرتِ بوسہ سے اب ایک کاسہ سا بن گیا ہے۔ میں نے یہ صورت دیکھی تو الٹے پاؤں پھر آیا، درِ کعبہ وا نہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ جو تماشا دیکھا اس کے باعث۔ دوسرے روز میں نے عبداللطیف اعظمی صاحب کو دہلی خط میں لکھا:

تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی

مختلف زمانوں میں حرم کی توسیع ہوتی رہی ہے۔ سعودیوں نے اسے اطالوی سنگِ مرمر سے لیس سا دیا ہے۔ معلوم نہیں اقبال کے یہاں یہ ردِّ عمل کیوں کر ہوا، اس لیے کہ وہ باوجود نیت زیارت کعبہ سے مشرف نہیں ہوئے تھے ۔

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے
میرے لیئے مٹی کا حرم اور بنا دو!

میں نے قیامِ مکّہ کے چند روز دروں بینی میں گزارے میری آنکھیں اب اندر کی طرف کھل رہی تھیں حرم کی مسجد میں اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ گھنٹوں خاموش بیٹھا رہتا۔ حرم کے آس پاس کے دوکانداروں کو دیکھتا جو دکانوں پر صرف ایک جال لگا کر نماز ادا کرنے یہاں آتے تھے۔ وہ رف فرض پڑھتے تھے اور اس تیزی سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا بس ٹکریں لگا رہے ہیں۔ انھیں الفاظ بُدبُدانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ غالباً نماز کے الفاظ اور آیات کی سطریں پوری کی پوری اُن کے تصوّر میں آجاتی ہوں گی اس لیئے لفظ لفظ پر قدم رکھ کر چلنا اس قدر مختصر مدت میں محال تھا۔ مجھے اس پر بھی تعجب ہوتا کہ محض ایک جال کے ذریعے بیرونی مصنوعات سے بھری ہوئی یہ دکانیں اغیار کی دست برد سے کیوں کر محفوظ رہ جاتی ہیں؟ جب کہ خود میری نیت ڈانواں ڈول ہو جاتی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ 'عمل' تک نوبت نہیں پہنچی ورنہ دست بریدہ ہندوستان پہنچتا کہ اسلام میں سارق کی سزا یہی ہے۔ اسی لیئے کہا جاتا ہے سعودی عرب کی سڑکوں پر آپ سونا اُچھالتے ہوئے چل سکتے ہیں۔

حج اور اس کے دیگر مناسک سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ 'دیارِ حبیب' یعنی مدینے کے لیئے روانہ ہوئے۔ اس وقت سعودی عرب کی شاہراہوں کا صحیح اندازہ ہوا۔ ان پر کم رفتاری سے موٹر چلانا خطرناک ہے۔ سڑکیں ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کالی ربر کو پگھلا کر بچھا دیا گیا ہے۔ میلوں چلے جائیے جھٹکا نہیں لگتا۔ مدینے کو مکّے سے زیادہ پُرسکون، فرحت بخش اور سرسبز پایا۔ گنبدِ خضریٰ کی جھلک ہر طرف باغات و سبزہ زاروں میں نظر آئی جس جالی کو پکڑ کر دعا مانگنے کی خواہش ہر حاجی کو ہوتی ہے وہاں حاجبوں کا پہرہ پایا۔ کسی نے بتایا کہ فجر کی نماز سے پہلے پہنچ جائیے تو جالی کے قریب آیا جا سکتا ہے۔ ایک صبح ایسے ہی لمحے میں اندر کی جھلک دیکھی۔ تین قبریں ہیں جن پر سائبان لگے ہیں۔ ایک آں حضرت، دوسرے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور تیسری حضرت عمرؓ کی۔ دوسرے لمحے حاجب سر پر تھا اور میں دور کھڑا ہوا تھا۔ وہابی دست برد سے بس یہی تین قبریں رہ گئی ہیں۔ پاتنس کے ہوٹل کی چھت سے

جنت البقیع کا نظارہ کیا (ہوٹل والے کو ۵ ریال دے کر) وہاں بھی ہر طرف سپاٹ میدان نظر آیا۔ عقیدت مند ہاتھ میں کچھ پتھر چھپا کر لے جاتے ہیں اور حضرت فاطمہ اور دوسرے اہل خاندانِ رسول کی قبروں کی نشاندہی انھیں رکھ کر کرتے رہتے ہیں۔ یہی حال غزوۂ بدر کے شہیدوں کے قبرستان کا ہے جو راستے میں دیکھا۔ سب سے زیادہ متاثر ہوا اس پہاڑ اور دَرّہ کو دیکھ کر جہاں سے حملہ کر کے حضرت خالد بن ولید نے جنگ کا نقشہ بدل دیا تھا۔ مدینہ میں عبدالملک صاحب جامعی سے ملاقات ہوئی۔ وہ عرصے سے وہیں آباد ہو گئے تھے اور اس وقت ابتدائی مدارس کے انسپکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ وہ مجھے اپنی موٹر نما کسی چیز میں بٹھا کر "بیر عثمان" لے گئے۔ یہ وہ کنواں تھا جو حضرت عثمان نے یہودیوں سے خرید کر رفاہِ عام کے لیۓ وقف کر دیا تھا۔ مدینہ کی ہر ہر گلی اور نخلستان پر تاریخِ اسلام کے نقش کندہ ہیں۔

سودی عرب کا میرا دوسرا سفر ۱۹۷۷ء میں پیش آیا۔ یہ عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنس کے سلسلے میں ہوا تھا۔ میرے ہم سفر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر علی محمد خسرو تھے۔ وہ بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انھوں نے بڑی ڈھیل کی وائس چانسلری کی ہے۔ لیکن ان کے دردِ دل کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "مسعود صاحب! جب میری موٹر کٹ میلے سے اُتر کر دہلی کا رُخ کرتی ہے تو میرے اعصاب میں سکون کی سی کیفیت آجاتی ہے لیکن جب دہلی سے آتے ہوئے یہ کٹ میلے پر چڑھنا شروع کرتی ہے تو اعصابی تشنج پھر شروع ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا "ہر وائس چانسلر کا یہی مقدر ہے۔ میرے سلسلے میں کٹ میلے پر یہ عمل برعکس انداز میں ہوتا ہے۔"

پاکستان سے کافی حضرات اس میں شرکت کرنے آئے تھے جن میں میرے شاگرد اور دوست کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر احسان رشید بھی تھے۔ احسان رشید علی گڑھ میں بھی ایک انجمن ساز شخصیت کے مالک تھے اور یہاں بھی ویسا ہی پایا۔ ہمارے قیام و طعام کا انتظام اس بڑے انٹرنیشنل ہوٹل میں تھا جو حدودِ مکہ سے باہر ایک بڑے عربی خیمے کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ ایسے تمام اجتماع جن میں غیر مسلم بھی شریک ہوں اسی ہوٹل میں منعقد کیۓ جاتے ہیں اس لیۓ کہ حدودِ حرم میں ان کے لیۓ قدم رکھنا ممنوع

ہے۔ اس قسم کی تخصیص کا تجربہ مجھے جنوبی ہند کے ایک مندر میں ہوا تھا۔ جہاں لسانیات کے سمر اسکول کا ایک گروہ جب پہنچا تو مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے مندر میں جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ اب جب کہ صورت مکہ میں دیکھی تو اطمینان ہوا کہ اس اعتبار سے کعبہ و کاشی یکساں ہیں، اس لیئے شکایت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا، کانفرنس کے پہلے ہی سیشن میں تعلیم کے اسلامی خطوط کا تعین کر دیا گیا اس طرح کہ مسلم طبیعیات، مسلم نباتیات، مسلم جغرافیہ غرض کہ ہر علم کی تدریس کس طرح اسلامی نقطۂ نظر سے کی جائے۔ میری عقل میں شروع سے یہ منطق نہیں آئی۔ اس لیئے اس قضیہ کے صغریٰ و کبریٰ کو کیا سمجھتا۔ میں نے مسلم اقلیتی ممالک کی سب کمیٹی کا رکن ہونا منظور کیا۔ وہاں بحث و مباحثہ کے دوران سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ ایسے ممالک میں جہاں کی اکثریت غیر مسلم ہے مسلم سائنس اور مسلم آرٹس کے کیا معنیٰ ہوں گے۔ میں نے بحث کے دوران اپنے ساتھیوں کو ہندوستان جیسے ممالک کے سیکولر تعلیم کے خطوط اور ان میں اسلامی عناصر کی آمیزش کے امکانات کی جانب اشارہ کیا، لیکن مسلم ذہن جب ہٹ دھرمی پر اتر آتا ہے تو پھر نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ مباحثہ، مجادلہ کی صورت اختیار کر لیتا اگر خرطوم (سوڈان) یونیورسٹی کے وائس چانسلر، جو ہندوستان ہو آئے تھے، اس کمیٹی کے صدر نہ ہوتے اور میرے نقطۂ نظر کی حمایت نہ کرتے۔

اس سے بدحظ ہو کر میں نے اپنی تمام تر توجہ لذتِ کام و دہن کی جانب مبذول کر دی جس کے اس ہوٹل میں سارے سامان تھے۔ عرب گوشت بے دریغ کھاتا ہے اور اس سے زیادہ ضائع کرتا ہے۔ کانٹے چمچے پر اپنی انگلیوں کو ترجیح دیتا جنھیں سنّت کے طور پر بعد کو چاٹتا ہے۔ یہاں دنبے کے پیٹ سے بھنا ہوا مرغ برآمد ہوتا۔ مجھے تلاش رہی کہ یا خدا کہیں اونٹ کے شکم سے بھنا ہوا دنبا نکل آئے۔

جامعہ کی وائس چانسلری ہی کے دوران مجھے ایک تعلیمی کانفرنس میں قاہرہ جانے کا بھی موقع ملا۔ یہاں بھی خسرو صاحب میرے ہم سفر تھے۔ اس کانفرنس پر الازہر والے چھائے ہوئے تھے جس کے شیخ کچھ عرصے پہلے جامعہ ملیہ آچکے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اسکالر آدمی

تھے۔ جتنی دیر جامعہ میں رہے عربی مخطوطات کا مطالعہ کرتے رہے اور اپنے کام کی ایک دو چیزیں دریافت کرلیں۔ مصری عربوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ قوم ہے۔ وہاں قدیم اسکالرشپ کے بھی نمونے ملتے ہیں اور جدید کے بھی۔ قدیم و جدید کے فرق کو بھی وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں اور دونوں کی اپنے اپنے مقام پر اہمیت کو بھی جانتے ہیں۔

مصر میں دریائے نیل (جس کے درمیان ہمارا ہوٹل میری دان تھا) کے حسن کے کے علاوہ صحرا کے ان دیو ہیکل پاسبانوں کو بھی دیکھا جنھیں اہرام مصر کہتے ہیں۔ ابوالہول کو واقعی 'ہول' کا باپ پایا۔ قدیم مصری ذہن کس بڑے پیمانے پر اشیاء کو متصور اور پھر ان کی تجسیم کرسکتا تھا، یہ دیکھ کر ہول اور حیرت دونوں ہوئے۔ حسنِ قلو پطرہ کی تلاش ہوئی تو مصر کے بازاروں میں کچھ نقش و نگار ملے۔ رودِ نیل کی دلکشی اب بھی باقی ہے۔

جامعہ کے پونے پانچ سال کے قیام پر جب غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا کھویا کیا پایا، تو ذاتی طور پر کھونے کا پلا کچھ بھاری نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر میرے ذہن کی افتاد انتظامی کے بجائے تعلیمی ہے۔ تعلیمی مصروفیات میں مجھے خوشی زیادہ ملتی ہے۔ اِسی لیے علی گڑھ کے طویل قیام میں، ابتدا میں وارڈن رہنے کے بعد میں نے کبھی کوئی دوسرا عہدہ قبول نہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے مجھے سرسید ہال کے پرووسٹ کے عہدہ کی پیشکش کی تھی۔ میں نے اس سے بھی معذرت کرلی تھی۔ لیکن جب عابد صاحب اور دیگر بزرگوں نے مجھے جامعہ چلے آنے کو کہا تو اسے میں نے بخوشی منظور کرلیا۔ اس کی وجہ کرسی کی ہوس نہیں بلکہ اس ادارے سے وہ محبت تھی جو اسکول کے دنوں سے میرے قلب میں جاگزیں تھی۔ چنانچہ میں نے اس جذبہ کا اظہار جامعہ پہنچ کر پہلی تقریر میں اس طرح کیا تھا کہ "لوگ اوکھلی میں سر دیتے ہیں میں نے اوکھلے میں سر دیا ہے"۔ اس اسپرٹ کے ساتھ میں جامعہ پہنچا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وائس چانسلری کی ذمہ داریوں کے ساتھ مجھے علمی و تحقیقی کاموں کے لیے فرصت نہیں ملے گی۔ حالاں کہ پروفیسر محمد مجیب مشورہ مجھے یہی تھا کہ میں اپنا

علمی کام جاری رکھوں، انتظامی معاملات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جامعہ پہنچ کر مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ تصنیف کا قلم رکھ کر دستخطوں کے قلم پر اکتفا کرنا ہوگا۔ جامعہ کے میرے پونے پانچ سال اِس لیے علمی اعتبار سے "بنجر" رہے کہ سوائے چند خطبات اور مضامین کے اور کچھ نہ لکھ سکا حالاں کہ حیدرآباد کے چھ سالہ قیام اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کی ۵ سالہ لسانیات کی پروفیسری کے دوران میں نے علمی و تحقیقی کام خاصا کیا تھا۔ اب دفتر، کار اور بنگلے کی سہولت تھی۔ پانچ اسٹار ہوٹلوں میں سرکاری ضیافتوں میں شرکت، اونچی کرسی والوں سے ملاقاتیں، یہ سب کچھ تو تھا لیکن ہمیشہ یہ احساس رہا کہ میاں مسعود! نہ یہ تمہارا صحیح مقام ہے اور نہ منصب۔ بعینہٖ جس طرح آل انڈیا ریڈیو کی چھ مہینے کی سروس کرنے کے بعد محسوس ہوا تھا۔ چنانچہ جیسا کہ کہیں ذکر کر چکا ہوں میں نے ایک سال قبل استعفا دے کر علی گڑھ چلے جانے کے بارے میں سوچ لیا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے شری اَنل بورڈیا (جو اس وقت وزارتِ تعلیم میں ڈائریکٹر تھے) اور شری چھابڑا کا (سکریٹری یو۔ جی۔ سی) کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ کے سرکاری نامزد کردہ رکن کی حیثیت سے وائس چانسلر علی محمد خسرو کی میری بازملازمت کی تجویز میں پخ لگادی اور میں جاتے جاتے رُک گیا۔ بعد کو جب میں نے شری چھابڑا سے اس کی ہنس کر شکایت کی تو انھوں نے اس کی ساری ذمہ داری اَنل بورڈیا پر ڈال دی۔ مجھے یاد آگیا کہ جب وہ جامعہ ملیہ کی مجلسِ عاملہ کے سرکاری رکن تھے تو ایک مسئلہ پر میرا اُن سے اختلاف ہو گیا تھا۔ میں اس واقعہ کو بھول گیا تھا لیکن انھیں یاد رہا!

جامعہ پہنچ کر میرا خیال تھا کہ اس کے ایک قدیم طالب کی حیثیت سے اور میرے خاندان سے اُس کا جو تعلق رہا ہے اس بنا پر، ڈاکٹر سید عابد حسین کی خواہش اور رشید احمد صدیقی صاحب کی دُعاؤں کے ساتھ میں اِس اِدارے کی روحِ گُم شدہ کو واپس لاسکوں گا۔ چنانچہ جاتے ہی میں نے اس کے شعبۂ اردو میں پروفیسری کی اسامی قائم کرائی، اور اس کے لیے علاحدہ سے عمارت خریدی۔ بعد کو جب کالجوں کا نظام ختم ہو گیا اور ان کی جگہ مختلف فیکلٹیوں نے لے لی تو میں نے خاص طور پر عربی، فارسی اور اسلامیات کا ایک مرکز قائم کیا تاکہ جامعہ اپنے ماضی سے وابستہ رہ سکے۔ جامعہ کے سوشل ورک کی حیثیت کے پیشِ نظر

سوشل ورک اسکول کے "رجواڑے" کو ختم کر کے سوشل سائنز کی فیکلٹی میں تبدیل کیا۔ اور شعبۂ نفسیات کا اس میں اضافہ کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ کھلا کہ بیشتر اساتذہ کا نہ جامعہ اسپرٹ سے کوئی تعلق تھا اور اس کے اسلامی ادارہ ہونے سے غالب کے بقول نفسا نفسی کا عالم تھا سہ

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

چنانچہ عجب عجب طرح کے اتحاد باہمی پائے الٹے سیدھے کا، دیندار دنیا دار کا۔ علمی اقدار یا محبت جامعہ سے کسی کو سروکار نہیں تھا۔ اپنی چودھراہٹ قائم رکھنا ضروری تھی، جامعہ چاہے بھاڑ میں جائے۔ پھر قربانی کے بکرے کے طور پر وائس چانسلر تو ہمیشہ موجود ہی رہتا ہے۔ پروفیسر مجیب کے زمانے میں جو ڈھیل مل گئی تھی، اس کا جاری رہنا ضروری تھا۔ غالباً انھوں نے ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر آخری زمانے میں جامعہ کی توسیع میں دلچسپی چھوڑ دی تھی اور اپنا سارا وقت اپنی علمی یا دوسری ذاتی مصروفیات میں صرف کرتے تھے۔

جامعہ کے اساتذہ میں بہت بڑی تعداد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسترد کردہ نااہلوں کی تھی۔ ان میں فرسٹ کلاس کیریر کے لوگ بہت کم تھے۔ ان میں سے بیشتر ریڈر اور صدر شعبہ کے منصب پر مجیب صاحب کے زمانے میں فائز ہو چکے تھے اور بغیر کسی علمی کام کے جامعہ کی توسیع کے ساتھ ساتھ پروفیسری کے خواب دیکھ رہے تھے۔ چوں کہ بیشتر مضامین میں پوسٹ گریجوئٹ کلاسیں نہیں کھلی تھیں اس لیے ان میں سے اکثر کو ایم اے کلاسیں پڑھانے یا تحقیقی کام کرانے کا ایک دن کا بھی تجربہ نہیں تھا۔ تاہم جامعہ کالج کے پرنسپل، انتخابی کمیٹیوں میں یہ کہہ کر ان کی سفارش کرتے کہ اگر ان کو ایم۔ اے پڑھانے کا تجربہ نہیں ہے تو اس کی ذمہ داری جامعہ پر ہے جس نے ان کو اس کام کا موقع فراہم نہیں کیا؟ گویا جامعہ کے باہر بھی ایسے امیدوار موجود نہیں تھے! اسی الٹی منطق سے ایک صاحب کو جو الف سے لے کر ی تک تھرڈ کلاس تھے پروفیسر بنا دیا گیا اور سیکنڈ کلاس

رکھنے والے تو سبھی لوگ پروفیسر بن گئے، لیکن میرے جامعہ چھوڑنے کے بعد۔

جب اُن بزرگوں اور رفیقوں کو یاد کرتا ہوں جن کے ساتھ یا جن کے درمیان رہ کر میں نے جامعہ چلائی تو ڈاکٹر سیّد عابد حسین کے علاوہ دو نام فوراً ذہن میں آتے ہیں۔ ایک امیرِ جامعہ جسٹس ہدایت اللہ صاحب کا اور دوسرے اعزازی خازن مدحت کامل قدوائی صاحب کا۔ ہدایت اللہ صاحب کی جانب سے مجھے ہر موقع پر تائید ملی، اس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ ان کی عدمِ مداخلت کی پالیسی کا سرچشمہ ان کا عرصہ تک کرسئ عدالت پر فائز رہنا تھا جامعہ ان کے نقشۂ حیات میں ایک چھوٹا سا مقام رکھتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ خود اس مرتبہ کے لیئے راضی نہیں تھے لیکن اپنی رفیقۂ حیات کے مشورے پر بادلِ ناخواستہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال کے بعد ۱۹۶۹ء میں قبول کر لیا تھا۔ اس لیئے انھیں جامعہ کے معاملات سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس بات سے ہوا کہ جب کبھی میں نے جامعہ کی توسیع کے سلسلے میں امداد چاہی تو کہا "میں وزیرِاعظم کی سطح پر تو بات کر سکتا ہوں لیکن وزیرِ تعلیم یا یو۔ جی۔ سی کے چیرمین وغیرہ سے وائس چانسلر نبٹے تو بہتر ہے"۔ بڑی مشکل سے میں نے ایک بار جامعہ کے معاملات کے سلسلے میں۔ یو۔ جی۔ سی کے چیرمین پروفیسر ستیش چندر اور سکریٹری شری چھابڑا کو اُن کے اشوکا ہوٹل کے 'سوئٹ' میں چائے پر مدعو کیا تھا، اور میں نے دیکھا اس ملاقات کے بعد کئی معاملات کا تصفیہ جلد ہو گیا۔ لیکن وہ اس قسم کی بھی ملاقاتوں کے لیئے آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ البتہ میری وائس چانسلری کے دوران وہ پہلے اندرا گاندھی اور دوسرے سال، جنتا کے برسرِ اقتدار آجانے کے بعد شری مرارجی ڈیسائی کو کنونشن کو بلانے کے لیے ع معشوق ما بہ شیوۂ ہر کس برابر است کے مصداق جب اندرا جی آئیں تو ع ان کے ہر گام پہ وہ نامِ خدا کہتے تھے۔ عالم یہ تھا کہ جب کنونشن کا جلوس پنڈال میں داخل ہوا تو اس کی سربراہی امیرِ جامعہ کی حیثیت سے ہدایت اللہ صاحب کر رہے تھے اور میں وائس چانسلر کی حیثیت سے معزز مہمان کے ساتھ تھا۔ ہدایت اللہ صاحب ہر بار یخ

قدم کے بعد جب فرش کا جوڑ آتا مڑتے اور اندرا جی سے کہتے: "احتیاط سے قدم رکھئے گا" جب یہ انتباہ دو تین بار ہو گیا تو اندرا جی سے نہ رہا گیا اور مجھ سے آہستہ سے کہا "ان سے کہیئے کہ وہ مجھ سے زیادہ اپنی فکر کریں"۔ یہ امر واقعہ بھی ہے کہ اندرا جی سے زیادہ وہ ڈگمگ ڈگمگ چل رہے تھے کنونشن کے خطبے اور میرے استقبالیہ کے بعد بھی ایک لطیفہ ہوا۔ ہم دونوں نے عرض مدعا اور جواب عرض مدعا میں اردو اشعار کا استعمال بے تحاشا کیا۔ دوسرے روز اخباروں میں نکلا کہ جامعہ کے کنونشن میں شیخ الجامعہ اور وزیر اعظم کے درمیان شعر بازی رہی۔ اس کے بعد وزیر اعظم کی جانب سے داد دہش کے اعلان کی باری آئی تو ہدایت اللہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ دس لاکھ کا اعلان کروا دیجیے یہ میری ناتجربے کاری سمجھئے کہ میں وزیرِ اعظم کا منہ دیکھنے لگا اور انھوں نے فوراً کہا اس قدر میں کہاں سے دوں گی۔ اس کے بعد پرچے پر ۵ لاکھ لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ چنانچہ گھاٹے کا سودا رہا۔

مرارجی ڈیسائی کنونشن ایڈریس دینے آئے تو ایسا معلوم ہوا کہ ہدایت اللہ صاحب ان سے بھی اتنے ہی قریب ہیں جتنے کہ وہ اندرا جی سے تھے۔ اس کی شاید ایک وجہ ان کا 'بمبئی والا' ہونا اور دوسری وجہ ان کی بیوی کا ایک گجراتی ہندو ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ عالم بالا کی باتیں ہیں۔ اونچی سیاست میں کون کس کے قریب ہوتا ہے یہ ہم جیسے 'ماسٹر' کیا جانیں۔

اس کنونشن میں جامعہ والوں نے وزیر اعظم کو بالکل مختلف پایا۔ لڑکوں میں اس زمانے میں ایجی ٹیشن تھا اس لیے انھوں نے پروگرام بنایا تھا کہ وہ کنونشن میں گڑبڑ کریں گے خفیہ پولیس کو اس کی اطلاع مل گئی تھی۔ چنانچہ ایسے تمام طالب علموں کے پیچھے پولیس کے جوان موجود تھے۔ جوں ہی انھوں نے شور و غل کا آغاز کیا، منہ پر ہاتھ رکھ کر انھیں پکڑ کر باہر لے گئے جہاں خدمت کے لیے پولیس کی لاریاں کھڑی ہوئی تھیں۔ بس ایسا معلوم ہوا کہ ایک حرکت مذبوحی ہوئی اور ختم ہو گئی۔ مرارجی ڈیسائی نے اندازہ کر لیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے سختی سے ڈانٹا اور کہا جس تعلیمی ادارہ کے طالب علموں کو آدابِ معاشرت نہ آتے ہوں ان اداروں کو بند کر دینا چاہیئے جیسا کہ میں نے چانسلر کی حیثیت سے ودیا پیٹھ (گجرات) کو کیا ہے۔ ہماری یادوں میں پچھلا کنونشن تازہ تھا۔ جب اندرا جی آئی تھیں اور جامعہ کو پانچ لاکھ روپے کی خطیر رقم کا عطیہ دیا تھا۔ مرارجی بھائی مرتبع

سے فائدہ اٹھا گئے۔ ہمیں مانگنے کی ہمت نہ ہوئی انھیں دینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس کے بعد چائے کے موقع پر بھی وہ بد حظاہی سے رہے۔ صرف سنترے کے ایک گلاس عرق پر اکتفا کیا۔ البتہ جب میں نے ان کے 'پیشاب' کے ذریعے علاج کا تذکرہ کیا (جس کے بارے میں ان کا حال میں کتابچہ شائع ہوا تھا اور میں نے خاص طور پر خرید کر پڑھا تھا) تو ان کے خشک چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

دوسری شخصیت جن کا میرا ساتھ پونے پانچ برس تک رہا، قدوائی خاندان کے ایک فرد مدحت کامل قدوائی تھے۔ وہ مجیب صاحب کے زمانے سے اعزازی خازن کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ سعودی عرب میں ہندوستان کے سفیر رہ چکے تھے اور اب ویسٹ اینڈ میں ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ میرے انتہائی ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ میں یہاں وائس چانسلر کی مدد کے لیے آیا ہوں نہ کہ روڑے اٹکانے کے لیے۔ چنانچہ مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں پڑتا جب میرا ان کا اختلاف ہوا ہو۔ چوں کہ ان کے جامعہ برادری سے تعلقات وسیع تھے اس لیے ان کے ذریعے اکثر انتظامی معاملات سلجھانے میں مدد ملتی تھی۔

میرے سکریٹری عبداللطیف اعظمی بھی ایک 'کردار' تھے وہ مجھے مجیب صاحب سے ورثہ

میں ملے تھے۔ جامعہ والوں کا خیال تھا کہ ہر وائس چانسلر کو انھیں 'بھگتنا' پڑتا ہے۔ اس پر مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا اپنے سکریٹری ایاس مجیبی صاحب کے بارے میں یہ کہنا یاد آجاتا تھا کہ "ہماری تخلیق کا تو واحد مقصد یہ ہے کہ ہم مجیبی صاحب سے نبھائے چلے جائیں"!

خیر میرے سلسلے میں یہ نوبت نہیں آئی۔ چوں کہ میں لطیف صاحب سے پہلے سے واقف تھا اس لیئے وہ دوستی اور احترام کے باریک فرق کو سمجھتے تھے۔ وہ جامعہ کے اُن چند لوگوں میں تھے جن پر میں مکمل اعتماد رکھتا تھا اور جنھوں نے وفاداری کا حق بہ شرطِ استواری نبھایا۔ انھوں نے مجھے بہت سی ناخواستہ بلّیات سے محفوظ رکھا۔ ان کے اسی رویے سے جامعہ برادری کے اکثر حضرات ناراض رہتے تھے۔ چوں کہ وہ اہلِ قلم بھی تھے اور رسالہ جامعہ کا بیشتر کام وہی کیا کرتے تھے۔ میں نے مجلس عاملہ میں ایک ریزولیوشن پیش کر کے انھیں رسالہ جامعہ کا نائب مدیر بنا دیا، جو وہ تاحال ہیں۔ رسالہ جامعہ اب تک انھیں کے دم سے پابندی سے نکل رہا ہے۔

جامعہ کے قیام کے آخری سال میں میں یکم اکتوبر ۷۷ء کو مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے ساٹھ سال کی عمر پہنچنے پر سبک دوش ہو گیا۔ ابھی جامعہ میں میری ملازمت کا تقریباً ایک سال باقی تھا، جس کے ۹ مہینے میں نے مکمل کیئے اور ۱۵ اگست ۷۸ء کو دو سال کی باز ملازمت پر پھر علی گڑھ آگیا۔

اس سال کا ایک اہم واقعہ دسمبر ۷۷ء میں میری بڑی بیٹی فریدہ کی شادی ہے۔ اس نے علی گڑھ سے باٹنی میں فرسٹ کلاس ایم۔ ایس۔ سی۔ کرنے کے بعد جامعہ کے ٹریننگ کالج سے بی ایڈ کر لیا تھا۔ اس کے کئی پیغام آئے۔ بالآخر نسبت ڈاکٹر عبدالرشید سے قرار پائی جو مرکزی سرکار کے شوگر کین انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ میں سائنس داں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ شادی کی رسم بڑی سادگی کے ساتھ ادا کی گئی اور اس کے بعد میری بیوی نے اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رشید بہت سعادت مند نوجوان ہیں۔ مشرقی یو۔پی۔ کے ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ ہیں لیکن حالات کی مجبوری کے تحت انھیں اردو لکھنے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ میں انھیں ان کی اردو 'ندانی' پر اکثر آڑے ہاتھوں لیتا ہوں۔ ایک دن ان سے میں نے اپنے دل کی بات کہدی کہ "اس خطّے کا کوئی مسلمان اگر اردو سے بے بہرہ ہوتا ہے

تو وہ مجھے مسلمان ہی معلوم نہیں ہوتا۔" اقبال سے معذرت کے ساتھ:

ع کافرِ اردو ہوں میں دیکھ مرا ذوق شوق!

میں نے اپنی تعلیمی ملازمت میں بچیوں کے لیے زیادہ پس انداز نہیں کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان کو اعلیٰ تعلیم دلادینا ہی کافی ہوگا۔ لیکن ہندوستانی سماج میں یہی سب کچھ نہیں۔ بہرحال یہ میری بیوی کی کفایت شعاری کی (جو مجھ سے نظر بچاکر کی جاتی تھی) بدولت تھا کہ ہم لوگ اپنی چار بچیوں کے ساتھ تھوڑا بہت کرسکے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے سلسلے میں ہم سے بہت تقاضے بھی نہیں ہوئے۔ لیکن سماجی روابط میں بغیر تقاضے کے بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس کا انتظام میری بیوی نے 'خفیہ کفایت' کے ذریعے کردیا، اس طرح کہ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ میری تنخواہ میں غالب سا کوئی ساہوکار بھی شریک ہوگیا ہے۔

اسی زمانے میں ترقی اردو بورڈ (تم بیورو) سے میرا تعلق گہرا ہوگیا۔ میں ۱۹۷۳ء سے اس کے اردو لغت کے منصوبے میں بحیثیت ایک ایڈیٹر کے اس کی تیسری جلد (د تا س) پر کام کررہا تھا۔ میرے اسسٹنٹ جنیدی صاحب مع ساز و سامان کے علی گڑھ سے منتقل ہوکر میرے ساتھ جامعہ نگر آگئے تھے لیکن ان کی مسلسل علالت اور میری انتظامی مصروفیات کی بنا پر اس میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوسکی۔ جنیدی صاحب کے علی گڑھ واپس چلے جانے کے بعد میں نے مسعود ہاشمی صاحب کا انتخاب کیا۔ وہ صلاحیت کے آدمی ثابت ہوئے اور جب میں ۱۹۷۸ء میں علی گڑھ منتقل ہوگیا تو اس کے بعد بھی کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے "اردو لغات کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے میرے ساتھ پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ جامعہ ملیہ کی مجلسِ تعلیمی نے خصوصی طور پر علی گڑھ منتقل ہوجانے کے بعد بھی مجھے بدستور نگراں رکھا۔ اب اس مقالے پر انھیں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی ہے۔

۱۹۷۳ء ہی سے میں لسانیات کی اصطلاحات کمیٹی کا صدر مقرر کردیا گیا تھا۔ اس عرصے میں علی گڑھ اور جامعہ ملیہ میں اس کے کئی جلسے ہوئے اور وضع شدہ اصطلاحات کا پہلا مسودہ تیار کرلیا گیا۔ پہلے مسودہ کی تیاری میں ڈاکٹر محمد ذاکر اور آخری میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

سے کافی مدد ملی۔ اصطلاحاتِ لسانیات کا یہ کام میری صدارت میں مکمل ہو کر بیورو کی جانب سے شایع ہو چکا ہے۔ اس پر میں نے بڑی محنت کی ہے۔ اس کے اراکین بدلتے رہے لیکن میں شروع سے آخر تک صدر کی حیثیت سے اس کا ذمہ دار رہا۔ ان کو وضع کرتے وقت پہلی بار اندازہ ہوا جب تک ایک طرف اس علم کے تصورات پر عبور نہ ہو اور دوسری طرف ہماری اصطلاحات سازی کے لیئے خاص طور پر عربی زبان کے مادوں سے واقفیت نہ ہو، اُس وقت تک آپ اس کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ اردو اصطلاحات سازی میں نہ تو بول چال کی زبان سے کام چلتا ہے اور نہ سنسکرت کے مادّوں اور تراکیب سے۔ بین الاقوامی اصطلاحات بھی زیادہ ساتھ نہیں دیتی خاص طور پر جب مرکبات سے سابقہ ہو۔

۱۹۷۷ء میں جنتا گورنمنٹ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہر شعبے میں اُلٹ پلٹ کی گئی۔ ترقی اردو بورڈ (بیورو) کی تنظیم بھی از سرِ نو کی گئی یعنی تنخواہ دار ڈائریکٹر کے بجائے حسبِ سابق اعزازی نائب صدر کا عہدہ پھر قائم اس عہدہ پر پہلے جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب عرصے تک کام کر چکے تھے۔ اس روایتِ دیرینہ کے پیشِ نظر ۱۹۷۸ء میں اس پر میرا تقرر ہو گیا لیکن جنتا سرکار کے ہٹتے ہی بیورو کی تنظیم میں تبدیلی کر کے پھر تنخواہ دار ڈائریکٹر کا عہدہ قائم کر دیا گیا۔

جامعہ اردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے پہلی بار میرا انتخاب ۱۹۷۳ء میں ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۶ء - ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۴ء میں مسلسل میرا انتخاب ہوتا رہا۔ اس طرح اس ادارے سے میری وابستگی کے ۱۵ سال پورے ہو چکے ہیں۔ اتنی طویل مدت کے لیئے کوئی دوسرا شخص شیخ الجامعہ نہیں رہا ہے۔ مختلف اوقات میں نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے میرے ساتھ ڈاکٹر عتیق صدیقی (۷۵ تا ۸۰ء) اور پروفیسر عبد العظیم نے (۸۱ تا ۸۶ء) کام کیا۔ اعزازی خازن کی حیثیت سے جنیدی صاحب اور الحاج عبید الرحمٰن خاں شیروانی صاحب (۷۵ تا ۸۵ء) نے کام کیا اور ۸۶ء سے ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ صاحب اس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جامعہ اردو کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے میں نے کیا خدمات انجام دی ہیں، ان کا تفصیلی تذکرہ آگے آئے گا۔

چودھواں باب

علی گڑھ (۵)

(۷۸ تا ۱۹۸۱)

۱۶؍اگست ۱۹۷۸ء کو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی باز ملازمت میں آگیا۔ کچھ عرصے کے بعد لسانیات کے شعبے کے نئے پروفیسر اور صدر میرے پرانے شاگرد ڈاکٹر عبدالعظیم بھی نیویارک سے آگئے۔ اُن کا اس جگہ پہ تقرر میری ہی تحریک پر ہوا تھا، حالاں کہ وہ امریکہ میں صرف عارضی لیکچرر تھے اور انٹرویو کے لیے بھی نہیں آئے تھے۔ اس عہدے کے دعویداروں میں میرے دوسرے شاگرد ڈاکٹر عبدالغفار شکیل بھی تھے، جو میری غیرحاضری میں پانچ سال تک ریڈر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ وہ اوسط درجے کی صلاحیت کے استاد تھے اور اسی وجہ سے عبدالعظیم صاحب کو ترجیح دے کر ڈبل پروموشن کے ذریعے پروفیسر بنادیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ غفار شکیل صاحب اس تبدیلی کو خوش دلی کے ساتھ قبول کریں گے اور میری موجودگی میں دونوں کے تعلقات ہموار رہیں گے۔ لیکن معاملہ برعکس نکلا۔ انھیں علم سے زیادہ اپنی زیادہ عمر پہ ناز تھا۔ چنانچہ اُن کے ذہن پہ 'مظلومیت' کی نفسیات طاری ہوگئی۔ اور انھوں نے نہ صرف شعبے کے کاموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی بلکہ رفقائے شعبہ سے (بہ شمول میرے) ہر قسم کے تعلقات ختم کر لیے۔ طالب علموں کو پڑھانے میں گریز کرتے تو اپنی 'مظلومیت' کی داستان سُنانے لگتے:

یہ دیکھ کر میں بھی کنارہ کش ہو گیا اور اپنے علمی کاموں میں، جو قیام جامعہ ملیہ میں معفر ہو گئے تھے، تیزی کے ساتھ منہمک ہو گیا۔ چنانچہ انھیں چند سالوں میں میں نے روشن علی سہارنپوری کا عاشور نامہ مرتب کر کے شعبے کی جانب سے شائع کیا۔ تدریس کے لیے تاریخ زبان اردو کے علاوہ اسلوبیات، کو اپنا مخصوص میدان بنایا۔ اور اس نقطۂ نظر سے کئی اجتہادی مضامین لکھے۔ میری ہی تحریک پر میرے ایک شاگرد، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ سولن کے اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر کی پرنسپلی چھوڑ کر شعبۂ لسانیات میں لکچرر کی حیثیت سے آئے۔ انھیں ریڈر کی تنخواہ تو دے دی گئی لیکن اس کا منصب نہ مل سکا۔ خیال تھا کہ چند سالوں میں اس کی بھی صورت نکل آئے گی

وہ اب تک لکچرر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے ذہین، محنتی اور فرض شناس استاد ہیں اور میرے خیال میں ان کا معاملہ

ع ہنر بہ چشم عداوت بزرگ تر عیبے ست

کا ہے۔ لسانیات کے استاد اور تحقیق کے نگراں کی حیثیت سے جوں جوں ان کی شہرت بڑھی وہ حسد کا شکار ہوتے گئے۔

بے انصافی ہو گی اگر یہاں میں نئے صدر شعبہ پروفیسر عبدالعظیم کا ذکر قدرے تفصیل سے نہ کروں جنھیں بڑی توقعات کے ساتھ شعبۂ لسانیات کی صدارت پر لایا گیا

ان کے تعلیمی کیریئر کی ابتدا ایک عزیز شاگرد کی حیثیت سے ہوئی۔ میں نے انھیں بی اے۔ کی کلاس میں دریافت کیا۔ میں ان کی لگن، محنت اور بعد کے سخت حالات سے، جن سے وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے بے حد متاثر تھا۔ جیسے جیسے ان کے ذاتی حالات سے واقف ہوتا گیا میری ہمدردی بڑھتی گئی

مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا کہ ان کا ادبی ذوق بہت معمولی ہے اس لیے ان کی توجہ لسانیات کی طرف کرائی جس کے لیے ان کے ذہن کی ساخت اور

سخت محنت کرنے کی عادت مناسبت رکھتی تھی۔ چنانچہ اردو ایم۔ اے میں میرے ساتھ تاریخ زبانِ اردو کا کورس کرنے کے بعد میری ہی تحریک اور مدد سے وہ میسور کے لسانیات کے سمر اسکول تک پہنچے۔ ۱۹۵۸ء میں میں امریکہ چلا گیا۔ وہاں سے ۱۹۶۰ء میں جب واپس آرہا تھا تو ڈاکٹر جان گمپرز نے مجھ سے کہا کہ میں انھیں ایک ایسا اسسٹنٹ دوں جو لسانیات سے بھی واقف ہو، اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو، اور اردو ٹائپنگ بھی جانتا ہو۔ ان کے پیشِ نظر برکلے یونیورسٹی (کیلیفورنیا) کے اردو نصابات کی تیاری کا منصوبہ تھا۔ میں نے عظیم صاحب کے نام کی سفارش کی۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر گمپرز نے انھیں برکلے بلا لیا۔ وہاں ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے شعبے کے تمام اساتذہ کا دل انھوں نے اپنی محنت سے جیت لیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے بال بچوں کو بھی بلا لیا اور کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) منتقل ہو گئے۔ جہاں پروفیسر ولیم ڈائی ور کے ساتھ پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا۔ چوں کہ اس عرصہ میں ان کی زیادہ توجہ کمائی اور اپنے بچوں کی تعلیم کی جانب رہی اس لیے پی ایچ۔ ڈی کا کام بہت سست رفتاری سے کرتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں میں جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر ہو کر دہلی چلا گیا اور ڈاکٹر عبدالغفار شکیل میری جگہ بحیثیت ریڈر اور قائم مقام صدرِ شعبہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اسی عرصے میں شعبۂ لسانیات میں ایک اور پروفیسری کی جگہ منظور ہوئی۔ پروفیسر خسرو نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے بلا تکلف عبدالغفار شکیل صاحب کے مقابلے میں عظیم صاحب کا نام پیش کیا۔ اس وقت وہ کینیڈا کی یونیورسٹی میں عارضی لکچرر تھے۔ میرا خیال تھا کہ انھوں نے اپنی پی ایچ۔ ڈی مکمل کر لی ہے۔ لیکن یہ راز بعد کو کھلا کہ انھوں نے اس کام کو ختم تو کر لیا تھا لیکن جب ان کا تقرر ہوا ہے اس وقت تک انھوں نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔

پروفیسر خسرو نے میری رائے پر اعتماد کرتے ہوئے غیر حاضری میں ان کا پروفیسری پر تقرر کر دیا۔ میں بھی انتخاب کمیٹی کا رکن تھا۔ جب انھیں اس تقرر کی اطلاع نیویارک میں ملی تو انھوں نے وہاں سے مجھے ٹیلیفون کیا اور اپنی پی ایچ۔ ڈی کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان کی سرزمین پر اس وقت

تک قدم نہ رکھیں جب تک انھیں پی ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری نہ مل جائے۔ اس کے بعد انھوں نے یونیورسٹی سے تین ماہ کی مہلت مانگی اور شب و روز محنت کے بعد ڈگری حاصل کرلی۔ چنانچہ جب اکتوبر ۷۸ء کے آخر میں وہ علی گڑھ پہنچے تو سند یافتہ تھے۔ میں جامعہ ملیہ سے فارغ ہوکر ۱۵ اگست ۷۸ء ہی کو اپنی باز ملازمت پر علی گڑھ پہلے سے پہنچ چکا تھا۔

عظیم صاحب کا دورِ صدارت ابتدا میں بہت اچھا رہا سوائے اس کے عبدالغفار شکیل نے ان کے تقرر کو عقلی یا جذباتی طور پر بھی تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ شعبے کے ہر کام سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور دوسرے شعبوں میں جاکر ہم سب کے خلاف پروپیگنڈا کرنا ان کا معمول ہوگیا۔ اسی زمانے میں میرے مشورے سے عظیم صاحب شعبے کے ایک گمشدہ لعل کو (میری مراد ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ سے ہے) سولن کے اردو ٹیچنگ اور ریسرچ سینٹر سے واپس لائے۔ وہ وہاں پرنسپل سینٹر کی حیثیت سے ریڈر گریڈ کی تنخواہ پا رہے تھے لیکن تحفظِ مشاہرہ کی شرط پر وہ شعبۂ لسانیات کی لکچراری پر آنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ خیال تھا کہ تنخواہ تو انھیں ریڈر کی مل ہی گئی ہے ریڈر کا منصب بھی بہت جلد مل جائے گا۔

اب عظیم صاحب تدریس و تحقیق کے بجائے فیکلٹی آف آرٹس کے انتظامی امور میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ اس کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ فیکلٹی کی سیاست میں سرگرم حصہ لیں اور اسی نسبت سے دوست اور دشمن بنائیں۔ انھیں سیاست کا چسکا شاید اس وجہ سے بھی لگا کہ انھیں غفار شکیل صاحب کے ہمہ وقتی پروپیگنڈے کا جواب دینا بھی ضروری ہوگیا۔ بعض صدر شعبہ نے شکیل صاحب کا پارٹ لیا۔ اس طرح فیکلٹی آف آرٹس سیاست کا اکھاڑہ بن گئی۔ جنوری ۸۶ء میں عظیم صاحب ڈین بھی بن گئے میں شعبے سے دو سال بازملازمت پر اور ایک سال وزٹنگ پروفیسر رہنے کے بعد ستمبر ۱۹۸۱ء میں مکمل طور پر سبک دوش ہوچکا تھا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، اب دیکھنے کی مروّت بھی باقی نہیں رہی۔ اس زمانے میں وہ مجھ تک سے مربیانہ انداز کا برتاؤ کرنے لگے۔ مثلاً کبھی کہتے میں لنگوئسٹک سوسائٹی کا نام مسعود حسین لنگوئسٹک سوسائٹی کرنا چاہتا ہوں۔ کبھی لالسا لگاتے کہ وہ میری ایک تصویر

بانی صدر شعبہ کی حیثیت سے شعبۂ لسانیات کے سیمینار میں ٹانگنا چاہتے ہیں۔ میں قبل از وقت متشکرانہ نگاہوں سے دیکھتا اور اس کے بعد اپنے اوپر لعنت بھیجتا کہ میری اب یہ اوقات رہ گئی ہے!

مجھے ان واقعات اور بدلتے ہوئے حالات سے سخت تشویش رہتی۔ بالآخر میں نے اپنی ہمدردی کا وزن اپنے محروم طلبہ اور بیگ صاحب جیسے اساتذہ کی جانب ڈال دیا۔ چنانچہ دو ایک ملاقاتوں میں میں نے عظیم صاحب سے کھل کر باتیں کیں اور آخر میں صاف صاف کہہ دیا کہ کسی انسان کو خود کو خدا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ذہن کی اسی بحرانی کیفیت میں جب لسانیات کی ایک انتخابی کمیٹی میں ڈاکٹر ہنس راج ڈآر کا تقرر ان کی سخت مخالفت کے باوجود ہو گیا، تو انھوں نے اگست ۱۹۷۰ء میں یونیورسٹی کے پروفیسر اور جامعہ اردو کے

نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے استعفا دے دیا۔ ہمدردوں کی دوڑ دھوپ سے انھوں نے مسلم یونیورسٹی سے تو اپنا استعفیٰ واپس لے لیا لیکن چوں کہ اس قسم کی کوئی کوشش جامعہ اردو کے سلسلے میں نہیں ہوئی وہ کچھ عرصے کے بعد منظور کر لیا گیا۔

اس کے بعد انھوں نے میرے یہاں کا آنا جانا بند کر دیا لیکن میری جانب ان کا احترام کا جذبہ قائم رہا۔ کچھ عرصے بعد غالباً میرے احسانات کا بوجھ کم کرنے کے لیے انھوں نے شعبۂ لسانیات سے مجھے پروفیسر ایمریٹس بنانے کی تجویز منظور کرائی جو فیکلٹی اکیڈمک کونسل سے متفقہ طور پر پاس ہوتی ہوئی بالآخر جولائی ۷۸ء میں یونیورسٹی کی ایگزیکیٹو کونسل نے منظور کر لی۔ عظیم صاحب اب خواہش مند تھے کہ میں پروفیسر ایمریٹس بننے پر ایک خطبہ دوں۔ جو میں نے "اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر" کے عنوان سے ۱۳ر جنوری ۸۸ء کو وائس چانسلر سید ہاشم علی کی صدارت میں دیا۔ اس میں میں نے ببانگِ دہل کہا کہ "سرسید تا حال علی گڑھ نے اردو کے حق کو ادا نہیں کیا ہے" مجھے نہیں معلوم اس کا مجموعی اثر مجمع پر (جو بڑی تعداد میں تھا) کیا پڑا لیکن سید ہاشم علی نے خطبے کے اختتام پر یہ کہا کہ ان کے پیشِ نظر اردو کریسپانڈنٹ کورس کی تجویز ہے۔

بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ عظیم صاحب اور میرے تعلقات میں جو کشیدگی آگئی تھی وہ دور ہو چلی ہے۔ پروفیسر ایمریٹس کی حیثیت سے شعبۂ لسانیات میں میرے لیے ایک کمرہ بھی مخصوص کر دیا گیا۔ میں نے وہاں جانا شروع کر دیا کہ بدقسمتی سے وہ واقعہ پیش آیا جس کی بدولت ہم ایک دوسرے سے اور زیادہ دور ہو گئے۔ ۱۶ر فروری ۸۸ء کو لسانیات کی پروفیسری کا انٹرویو تھا۔ بہت دنوں کے بعد اس بار سید ہاشم علی صاحب نے مجھے بھی اس کمیٹی کا رکن نامزد کیا۔ میں نے کمیٹی کے سامنے بیگ صاحب کا معاملہ بالتفصیل زوردار طریقے پر پیش کیا۔ دو ہی امیدوار تھے، ڈاکٹر اقتدار حسین خاں اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ۔ ڈاکٹر اقتدار حسین، بیگ صاحب سے صرف دو سال سینیئر تھے لیکن بیگ صاحب شعبۂ لسانیات کے پہلے پی ایچ۔ ڈی تھے انھوں نے ڈاکٹر اقتدار حسین خاں سے چار سال اور عظیم صاحب سے ۲ سال قبل حاصل کی تھی۔ وہ سولن کے اردو ریسرچ سینٹر کی پرنسپلی کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے

جس کا گریڈ ریڈر کے برابر تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اقتدار حسین خاں پروموشن کی پروفیسری کے مستحق بن چکے ہیں اور اس پر بآسانی ہو جائیں گے۔ دوسری جگہ پر بیگ صاحب کو کر دیا جائے جو ملازمت میں کھانچا پڑ جانے کی وجہ سے پروموشن اسکیم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے

میری ایک

نہ چلی اور وائس چانسلر نے یہی فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر اقتدار حسین کا اس پروفیسری پر تقرر کر دیا جائے۔ میں اس بے انصافی کو (جو بیگ صاحب اور شعبۂ لسانیات دونوں سے تھی) برداشت نہ کر سکا اور مجھے اپنے ضمیر کو اختلافی نوٹ لکھ کر سبک سار کرنا پڑا۔

میری پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی اور یو۔جی۔سی سے پروموشن اسکیم میں توسیع کی اجازت دو ہفتے کے اندر آگئی! اگر میری تجویز کو مان لیا جاتا تو اقتدار حسین خاں صاحب اور بیگ صاحب دونوں اس وقت پروفیسر ہوتے اور شعبۂ لسانیات کا وقار بڑھ جاتا۔

میرے اوپر عظیم صاحب کی کارگزاری اور وائس چانسلر کے فیصلے کی کمزوری دونوں کا بڑا اثر پڑا اور میں نے طے کر لیا کہ اب عظیم صاحب سے مصالحت کی کوئی شکل ممکن نہیں۔

مگر واہ ری   ! کسی سے کہا کہ بیگ نے باپ کو بیٹے سے لڑوا دیا۔ کسی سے کہا کہ بیگ نے میری ساری عمر کی ریاضت برباد کر دی۔ اس ریاضت ایک بار پھر با کار بنانے کا یہ منصوبہ بنایا گیا کہ مجھے 'نذرِ مسعود' کے نام سے ایک جلد پیش کی جائے۔ فوراً ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس میں بیگ صاحب کے علاوہ شعبے کے سارے اساتذہ کو شامل کیا گیا۔ باہر سے پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مختارالدین احمد اور ڈاکٹر اصغر عباس کے نام شامل کیے گئے۔ اتفاق سے جس روز مشورت کمیٹی کی پہلی میٹنگ تھی اس سے دو روز قبل سرور صاحب میرے یہاں آئے اور اس تجویز کا تذکرہ کیا۔ میں نے ان سے احترام کے ساتھ کہا: نذر تو اس وقت نذر ہوتی ہے جب قبول کر لی جائے جب میں اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تو اس سعیِ رائیگاں سے کیا حاصل۔ انھوں نے میرا اشارہ پالیا اور عظیم صاحب کو تیسرے روز میٹنگ سے قبل میری نیت اور اپنی معذرت لکھ بھیجی۔ کچھ اسی قسم کی گفتگو میں نے

مختارالدین صاحب سے بھی کی تھی۔ لیکن انھوں نے اس کے باوجود مشورت کے جلسے میں شرکت کی اور سرور صاحب کی رائے سن کر ایک بہت اچھی پیالی چائے کی پی کر فرحاں و شاداں میرے یہاں آئے! در ساری تفصیل سنائی۔ سنا ہے موصوف نے شام کو سرور صاحب کے یہاں پھر دھاوا بولا اور بر بنائے اس خلوص کے جو انھیں مجھ سے ہے ان کو میرے اوپر اثر انداز ہونے کے لیے آمادہ کرنا چاہا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

خاندانی محاذ پر اس زمانے میں میں نے اپنی دوسری بیٹی نادرہ کی (جس نے انگریزی میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے۔ کیا تھا) شادی سے فراغت حاصل کی۔ اس کا امتحان صرف ایک دن پہلے ختم ہوا اور دوسرے دن ناصر محمد خاں سے نکاح پڑھا دیا گیا۔ اس کے نانا قدوس عالم خاں صاحب سب کے لیے یہ نئی بات تھی کہ لڑکی نہ مائیوں میں بیٹھی اور نہ اور رسمیں ہوئیں اور سیدھی دلہن بنادی گئی۔ میں نے اب اپنی بچیوں کی شادی کے لیے ایک نئی تکنیک ایجاد کی۔ یعنی یہ گھر کے آنگن میں ہوگی اور اس میں دونوں طرف سے مدعوئین کی تعداد اس قدر محدود ہوگی کہ نکاح تا کھانا سب گھر کے اندر کیا جاسکے۔ مجھے خوشی ہے کہ ناصر محمد خاں کے والد فضل محمد خاں (مرحوم) نے اس سلسلے میں مجھ سے تعاون کیا، اس طرح فریقین بے جا اسراف سے بچ گئے۔ ناصر محمد خاں، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں اور اس وقت جدّہ میں سیل انجنیئر کی حیثیت سے ایک فرم میں کام کر رہے ہیں۔ نادرہ کی شادی میں جو طرز قائم ہوگیا اسی انداز پر میں نے ۸۶ء میں باقی ماندہ دونوں بچیوں کا نکاح کیا۔

پندرھواں باب

"رخت بہ کاشمر کُشا....."

(۱۹۸۱ تا ۸۲ء)

پچھلے باب کی داستان میں تسلسل کی خاطر ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۸ء تک لے آیا ہوں۔ لیکن اس مدت میں چند اور واقعات رونما ہوئے جن کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۸۰ء میں جامعہ ملّیہ سے واپس آکر میں نے دو سال تک شعبۂ لسانیات میں باز ملازمت کی جس پہ میرا تقرر پروفیسر علی محمد خسرو نے کیا تھا۔ نئے وائس چانسلر سید حامد باز ملازمت کے بارے میں زیادہ گرم جوش نہیں تھے اس لیے جب پروفیسر عبدالعظیم نے میری دو سال کی مدّت میں مزید توسیع کی خواہش کی تو انھوں نے باوجود ہمدردی کے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ ایک دو ماہ تک میں بیکار رہا۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۸۱ء میں اچانک پروانہ ملا کہ مجھے سال بھر کے لیے اپنے ہی شعبے میں وزٹینگ پروفیسر بنا دیا گیا ہے۔ یو۔ جی۔ سی کے قاعدے کے مطابق جس یونیورسٹی میں کسی نے ملازمت کی ہو وہاں اُسے وزٹینگ پروفیسر نہیں بنایا جاتا۔ بعد کو معلوم ہوا اس کے لیے سید حامد صاحب نے خاص طور پر یو۔ جی۔ سی کو لکھا تھا اور وہاں اس شرط کے ساتھ منظوری ملی تھی کہ اسے آئندہ کے لیے نظیر نہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس طرح میں

مزید سال بھر شعبۂ لسانیات سے منسلک رہا۔ آخر کار ستمبر ۱۹۸۱ء میں مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے مکمل طور پر سبکدوش ہو گیا۔

دورانِ ملازمت مسلسل آمد و رفت کی وجہ سے میرے ریٹائرمنٹ بے نی فٹس پر برا اثر پڑا۔ جب ۱۹۶۸ء میں عثمانیہ سے علی گڑھ واپس آیا تو اس وقت تک پنشن اسکیم آچکی تھی۔ میرے ریٹائر ہونے میں اس وقت ۹ سال دو مہینے تھے۔ اس خیال سے کہ تعلیمی سال کے دوران ریٹائر ہونے والوں کو سال کے آخر تک توسیع خود بخود مل جاتی ہے۔ میں نے پنشن اسکیم کا انتخاب کیا۔ پنشن کے لیے کم از کم دس سال کی مدتِ ملازمت درکار ہے۔ میری شومئ قسمت دورانِ ملازمت قاعدوں میں تبدیلی ہوئی اور توسیعِ ملازمت کا طریقہ ختم کر کے باز ملازمت کا جاری کیا گیا۔ باز ملازمت کی مدت کا شمار پنشن کے لیے نہیں کیا جاتا۔ اس طرح دس سال کی مدت میں میرے دس مہینے کم رہے۔ مجھے اب پراوِڈنڈ فنڈ کی اسکیم میں پھر جانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں پنشن کے حقوق سے کلیتہً محروم رہ گیا۔ قسطوں میں جو پراوی ڈنڈ فنڈ ملتا رہا وہ خرچ ہوتا رہا۔ اس سے واحد فائدہ میں مکان کی تعمیر میں اٹھا سکا۔ جس کے لیے میں نے ۱۹۵۵ء میں بہت سستے داموں دو بیگھ کا پلاٹ یونیورسٹی کیمپس کے بالکل قریب خرید لیا تھا۔ چنانچہ یونیورسٹی سے جب ۱۹۸۱ء میں مکمل طور پر سبکدوش ہوا ہوں تو میرے پاس پراوی ڈنڈ فنڈ کے چند ہزار کی رقم کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہمیشہ اچھا کھایا، اُجلا پہنا، اس لیے پس انداز کچھ نہ کر سکا۔

علی گڑھ کے شعبۂ لسانیات میں میری وزٹنگ پروفیسری کی مدت ختم ہوئے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ کشمیری یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں میرا تین ماہ کے لیے بحیثیت وزٹنگ پروفیسر تقرر ہو گیا۔ میں وہاں ستمبر ۸۲ء کے وسط میں پہنچا اور ۱۵ دسمبر تک فرائض انجام دیئے۔ چلتے وقت یونیورسٹی نے مارچ ۸۳ء سے ایک تعلیمی سال کے لیے پھر اس حیثیت میں میرے تقرر کی توسیع کی۔ دو حصوں میں میرا تقرر صرف تعطیلات کی تنخواہ بچانے کی نیت سے کیا گیا۔

میں اس پر بھی خوش تھا، دو وجہوں سے، ایک تو لسانیات سے مجھے ایک بار پھر شعر و ادب کی جانب گریز کرنے کا موقع ملا اور دوسری خوشی کی بات میرے لیے یہ تھی کہ جنتِ ارضی میں ایک بار پھر طویل قیام کا موقع مل گیا۔ تکلیف صرف کھانے کی تھی۔ ابتدا میں مَیں نے گیسٹ ہاؤس کے میس میں کھانا شروع کیا لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ گاڑی یوں نہ چل سکے گی۔ چنانچہ مارچ ۸۳ء میں تعلیمی سال کے آغاز سے میں نے طے کر لیا کہ اب دستِ خود دہانِ خود کا تجربہ رہے گا۔ کھانا پکانے کے فن سے میں قطعاً ناواقف ہوں۔ اس سلسلے میں مَیں نے ایک اچھے برہمن کی طرح ہمیشہ اپنی نصف بہتر کا سہارا لیا ہے جو اتفاق سے اس فن کی ماہر ہیں۔ ہمیشہ انھیں کے ہاتھ کا پکایا کھایا، حالاں کہ میں اس طبّی قول سے واقف ہوں کہ " حملۂ قلب، کو دعوت دینا ہو تو ایک خوب صورت اور عمدہ کھانا پکانے والی عورت سے شادی کر لو"۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ دونوں صفات سے متصّف ہونے کے باوجود میری بیوی میرے لیے 'دل شکنی' کا باعث اب تک نہیں ہوئیں، بلکہ ہمیشہ راحتِ جاں کے ساتھ ساتھ قوتِ دل کا باعث بنی رہیں۔ بہرحال اس زمانے میں طبّاخی کے نئے نئے تجربے خوب ہوئے۔ گوشت تو 'مینو' سے قطعاً خارج رہا۔ لیکن ارہر کی دال پکاتا تو مونگ کی دال بن جاتی۔ تنگ آ کر دودھ، ڈبل روٹی اور انڈے پر اکتفا کیا۔ البتہ خشک و تازہ میوہ جات کا کثرت سے استعمال رہا۔ کچھ ہی عرصہ میں تقلیلِ بدن کا عمل شروع ہو گیا اور تلخیص نکل آئی لیکن صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا۔ ہلکا پھُلکا ہونے کے ساتھ چاق چوبند محسوس کرنے لگا، ناشپاتی اور بگوگوشوں نے گالوں پر غازہ سا پھیر دیا۔ ہماری فاقہ مستی اس طرح رنگ لائی۔ جون ۸۳ء میں بچّہ آ گئیں، اور خاں صاحب کا پھر ٹھاٹھ، کھانا شروع ہو گیا۔ کشمیر کا گوشت بشرطیکہ وہ کشمیری بھیڑ کا ہو پنجابی بھیڑ کا نہیں نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ بجلی کے اسٹوو ہی پر بچّہ اپنے فنِ طباخی کا کمال دکھانے لگیں، اس طرح کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طالبات کے لیے لنگر سا کھُل گیا۔ خاں صاحب کے جسم پر ڈبل نوم، پھر سے چڑھنے لگا

اس دور کی فاقہ مستی اور لذّت پرستی یہ سب تیاری تھی علامہ اقبال کے فکر و فن سے نبٹنے کے لیے۔ چنانچہ جلد میں نے مکمل دل جمعی کے ساتھ خود کو اس کام میں جھونک دیا۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ تھوڑے سے فاصلے پر اقبال لائبریری کے ایک حصّے میں واقع تھا۔ یہ شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی دور بینی اور پروفیسر آل احمد سرور کی محنت کا ثمرہ تھا۔ سرور صاحب پہلے نو قائم کردہ 'اقبال چیئر' پر ۱۹۷۷ء میں پروفیسر کی حیثیت سے آئے تھے۔ چند سال کے بعد اس نے ایک انسٹی ٹیوٹ کی شکل اختیار کر لی جہاں اقبال اور متعلقاتِ اقبال پر تحقیقی کام ہوتا تھا۔ سرور صاحب کے علاوہ یہاں

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی اور سید محمد امین اندرابی صاحب مستقل حیثیت سے کام کر رہے تھے اور ایک جگہ وزیٹنگ پروفیسر کے لیے مخصوص تھی۔ مجھ سے قبل اس جگہ پر عالم خوند میری صاحب کام کر چکے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کے پاس اقبال اور متعلقات پر مشتمل ایک اچھی لائبریری تھی جہاں پاکستانی مطبوعات اور رسائل دستیاب تھے۔ کئی طالب علم اقبال سے متعلق موضوعات پر ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی۔ کے لیے کام کر رہے تھے۔ میرے ذمہ متفرق کام تھے جن میں اپنے منتخب کردہ موضوع پر لکچر دینے کے علاوہ اقبال کے فکر و فن کے کسی موضوع پر ایک کتابچہ بھی تصنیف کرنا تھا۔ اتفاق سے سرور صاحب نے جس طالبہ، طالوہ مقدوی، کو میری نگرانی میں دیا وہ اقبال کے تصوراتِ جمالیات پر کام کر رہی تھیں۔ انھیں معیاری کام کرانے کے لیے مجھے خود بھی اس موضوع پر مطالعہ کرنا پڑا۔ اس طرح اس مختصر سے رسالے: "اقبال کی نظری و عملی شعریات"۔ کی داغ بیل پڑی جس پر ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی نے مجھے ۱۹۸۴ء کا اردو انعام دیا۔ میں نے اس میں اقبال کے شعریاتی تصوریات سے بحث کرنے کے علاوہ لسانیاتی اسلوبیات کے نقطۂ نظر سے اقبال کے صوتی آہنگ کا جائزہ لیا ہے اور نمونتہً چند نظموں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ غالباً میری تنقید کا یہی نیا انداز تھا جس کی وجہ سے مجھے ساہتیہ اکیڈمی کے ایوارڈ کا مستحق سمجھا گیا۔

انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سال میں ایک دو کل ہند پیمانے پر اقبال پر سمینار بھی منعقد کرائے جاتے تھے۔ جن میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ بعد کو انسٹی ٹیوٹ کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہوتا۔ اب تک اس طرح کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں اقبال کے فکر و فن کے مختلف گوشوں پر لکھے ہوئے میرے بھی کئی مضامین شامل ہیں۔

کشمیر کے قیام میں میرے اندر کا شاعر آخری بار جاگ اٹھا۔ میں نے پہلا شعر ۱۹۳۲ء میں جب میں اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں کشمیر گیا تھا، کہا تھا۔

نہیں نہیں نہیں جاتے تم اس طرف کو مگر
قدم قدم پہ یہ لرزہ قدم کا کیسا ہے

اور آخری شعر بھی وہیں ۱۹۸۲ء میں پچاس برس کے بعد کہا ہے

ہر گلی کوچے میں، ہر موڑ پہ وہ ہی آہٹ
کیسا یہ شہر ہے، ہر راہ میں تم ہی تم ہو!

میں نے ۱۹۵۶ء تک جو کچھ کہا تھا اس کا انتخاب 'دو نیم' کے نام سے اسی سال شائع کرا دیا تھا۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شعر کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ اس کا باعث کچھ میری عملی زندگی کی مصروفیات اور کچھ مطالعۂ لسانیات تھا۔ بہر حال نہیں کہہ سکتا کہ تخیل و جذبات کو ۶۲ برس کی عمر میں اس جنتِ ارضی میں کس چیز یا شخص، نے مشتعل کیا کہ شعر پھر اُبل پڑا۔ شام کو میں نسیم باغ کے سامنے جھیل ڈل کے کنارے لگے ہوئے چمن میں پابندی سے ٹہلنے جاتا۔ وہیں شعر کا نزول ہوتا۔ دو غزلیں تو میں اس قطعۂ چمن میں لکھیں جہاں آج شیخ محمد عبداللہ آسودۂ خواب ہیں۔ ایک کو 'وادیٔ گل' کا عنوان دے کر میں نے دو نیم کے نئے ایڈیشن (۱۹۸۶ء) کی نظموں میں شامل کر دیا اور دوسرے کو بلا عنوان کی غزل رہنے دیا۔ جیسا کہ بار بار کہہ چکا ہوں کہ میری شاعری، میری اصل خودنوشت ہے لیکن اسے بین السطور دیکھنا ہوگا:

وادیٔ گُل

دید ہی دید ہے اے عمرِ رواں! کچھ بھی نہیں
یہ جہاں کتنا حسین ہے، یہ جہاں کچھ بھی نہیں
یہ تبسم، یہ تکلم، یہ تماشا، یہ نگہ،
یوں تو سب کچھ ہے یہاں اور یہاں کچھ بھی نہیں
تیرے ابرو سے سوادہ نگہِ تشنۂ خوں
تیر جب نکلا کماں سے تو کماں کچھ بھی نہیں

عمر کے فاصلے طے کر نہ سکا جذبۂ شوق
خونِ دل کچھ بھی نہیں، قلبِ تپاں کچھ بھی نہیں
ڈھونڈھئے چل کے کہیں عمرِ گذشتہ کا سراغ
کشتیٔ دل کے لیے سیلِ زماں کچھ بھی نہیں
ان نظاروں میں نظر اپنی بھی جانب مسعود
وادیٔ گل میں بجز دل کا زیاں کچھ بھی نہیں

(کشیر، ستمبر ۱۹۶۸)

کیا اس میں "ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا" کی حسرت اور "دل کو خوں کرنے کی فرصت ہی سہی" کا احساس نہیں ملتا؟

یہ حسرت جب کسی شخص کی تمنّا کا پیکر اختیار کر لیتی ہے تو غزل کا یہ پیکر اختیار کر لیتی ہے:

ترے خیال سے رقصِ رواں ہے میری غزل
تری نگاہ سے اب تک جواں ہے میری غزل
یہ لفظ و معنی کا رشتہ یہ میرا، تیرا وجود
ذرا میں پیدا، ذرا میں نہاں ہے میری غزل
ہدف شناس ! یہ دل تیرے انتظار میں ہے
تری نظر کے لیے تو کماں ہے میری غزل
مرے وجود میں پنہاں ہوں مثلِ آتشِ گل
مرے وجود میں جیسے نہاں ہے میری غزل
تری نگاہ نے بخشی وہ رفعتِ جذبات
کہ اس زمین میں بھی آسماں ہے میری غزل
کہاں سے اہلِ سخن لائیں طالعِ مسعود
وہاں گذر نہیں ممکن، جہاں ہے میری غزل

(کشیر، اکتوبر ۱۹۶۸)

لیکن یہ ۶۲ برس کی عمر کی شاعری تھی جب کہ کہا جاتا ہے کہ فنِ شعر کی عمر اس کے نصف برابر ہوتی ہے۔ محرکات موثر طریقے پر اسی وقت کارگر ہوتے ہیں جب زمین تیار ہو۔ آپ لاکھ ساٹھے پاٹھے ہوں، شعر کی دیوی کی نظر میں تو آپ کچھ سٹھیائے ہی کہے جائیں گے۔

کشمیر کے قیام میں مجھے کئی دلچسپ تجربے ہوئے۔ ایک تو اس زیریں رقابت کے جذبے کا احساس ہوا جو کشمیریوں اور غیر کشمیریوں کے درمیان رہتا تھا۔ یہ کبھی کبھی اخباروں کے کے مزاحیہ کالم میں اس انداز میں اُبھر آتا تھا کہ "شمالی ہند کی جتنی بوڑھی گائیں ہیں، ہماری شاداب وادی میں چرنے چلی آتی ہیں"۔ کبھی کشمیری مچھلی اور پنجابی مچھلی یا کشمیری بھیڑ اور پنجابی بھیڑ کی تفریق میں ظاہر ہوتا تھا۔ دراصل (شاید تاریخی اسباب کی بنا پر) کشمیری زبان میں پنجابی، 'غیر ملکی' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک طالبہ نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ مجھے اور سرور صاحب کو 'علی گڑھ کا پنجابی' کہتی ہیں!

اتفاق سے "شمالی ہند کی یہ بوڑھی گائیں" کشمیر یونیورسٹی میں خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں! ابتداء سے وائس چانسلر بھی سب کے سب غیر کشمیری ہوتے رہے۔ جب میں وہاں تھا تو وحید الدین ملک صاحب وائس چانسلر تھے۔ وہ زبان کے پھوہڑ تھے اس وجہ سے بھی علی گڑھ والوں کا پنجابی ہونا ثابت ہو جاتا تھا۔ ان کا اپنے رجسٹرار پر (جو کشمیری تھے) خفگی، کا ایک عالم میں نے بھی دیکھا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ایک جلسے میں تشریف لائے تھے۔ جلسے کے بعد سب لوگوں کو اقبال لائبریری میں ایک نمائش کے افتتاح کے لیے جانا تھا۔ ظاہر ہے وائس چانسلر صاحب شیخ صاحب کی کار میں تھے۔ کار اقبال لائبریری کے دروازے پر پہنچی۔ لوگوں نے بڑھ کر شیخ کو نرغے میں لے لیا۔ اتنے میں کار کا دروازہ جو بند ہونے کے خود کار آلے سے مسلح تھا، بند ہو گیا۔ وائس چانسلر صاحب کار کے اندر رہ گئے۔ شیخ صاحب کی پذیرائی کی گھما گھمی میں کسی نے یہ تک نہیں دیکھا کہ وائس چانسلر کہاں ہیں۔ وہ اندر سے کار کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتے

رہے مگر سیکورٹی کا یہ دروازہ کیوں کر کھلتا۔ بہرحال شیخ صاحب نے مقررہ مقام پر پہنچ کر نمائش کے افتتاح کا فیتہ کاٹا اور اسے دیکھنے کے لیے ہجوم کے ساتھ ہال کے اندر داخل ہو گئے۔ اس وقت کسی کو وائس چانسلر کی غیر حاضری کا احساس ہوا تو انھیں کار کا دروازہ کھول کر لایا گیا۔ رجسٹرار یونیورسٹی شرمندہ کھڑے تھے اور وائس چانسلر صاحب نمائش کے دروازے پر کھڑے ہوئے انھیں بے نقط سنا رہے تھے۔ ایک نمائش ہال کے اندر تھی اور ایک تماشا ہال کے باہر ہو رہا تھا!

کشمیریوں کا غیر کشمیریوں کے بارے میں جو احساس تھا، میرے خیال میں اس کی ذمہ داری غیر کشمیریوں پر بھی تھی۔ وہی احساسِ برتری کا جذبہ، جس کی ہمیں شکایت انگریزوں سے رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ باہر سے آئے ہوئے لوگ جو کشمیریوں کی سطح پر اتر کر ان کے جذبات و خیالات کا احترام کرتے ہیں، وہ ان میں محترم اور عزیز رہتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر رئیس احمد کو پروفیسر وحید الدین ملک سے زیادہ مقبول پایا۔ ایک اسلامی ذہن کے کشمیری استاد نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ اسلامی شعائر کے پابند ملک سے تو کیمونسٹ رئیس احمد اچھے تھے کہ وہ انسان کی عزت کرنا جانتے تھے، اور ہمیشہ معقولیت سے کام لیتے تھے۔ شعبۂ اردو میں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کو جتنی مقبولیت حاصل رہی۔ اردو کے کسی دوسرے پروفیسر کو نہیں رہی۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے قیام کے تھوڑے ہی عرصے میں اردو ادب سے متعلق کشمیریوں کی خدمات پر کئی تصانیف لکھ ڈالیں۔

عام طور پر اہلِ کشمیر نے اردو کو اپنی تعلیمی و سرکاری زبان کی حیثیت سے شیخ محمد عبداللہ مرحوم کی قیادت میں تسلیم کر لیا تھا۔ اُردو کی اہمیت اس لیے بھی تھی کہ یہ کشمیر کے تین مختلف اللسان علاقوں۔ جموں، لدّاخ اور وادیٔ کشمیر۔ کے درمیان ایک رابطے کی زبان کا حکم رکھتی ہے۔ تاہم نوجوان کشمیریوں میں کشمیری کو سرآمد بنانے کا جذبہ خاصا شدید تھا۔ اسی کے تحت کشمیر یونیورسٹی میں کشمیری کا شعبہ قائم کیا گیا۔ جس کے سربراہ کشمیری کے مشہور شاعر رحمان راہی تھے۔ وہ کشمیری تحریک

کے میرِ کارواں تھے اور اردو فارسی کی اچھی استعداد رکھنے کے باوجود اردو والوں کی جانب سے شاکی اور مشتبہ رہتے تھے۔ میں نے جب ان سے لسانیاتی سطح پر کشمیری زبان کے سلسلے میں ہمدردی کی باتیں کیں تو کچھ مطمئن ہوئے اور کھلے۔ میں نے صاف الفاظ میں کہا اپنی مادری زبان کے سلسلے میں اُن کے جو عزائم ہیں اردو والوں کو ان کا احترام کرنا چاہیئے۔ اردو کو کشمیر میں قائم رہنے کا حق اسی وقت ہے جب تک اہلِ کشمیر اپنی ضرورت کے مطابق اسے رکھنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ کہ خود ہندی والوں سے انصاف کے طالب ہیں وہ کشمیری کا حق کیوں کر سلب کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل بیان کر چکا ہوں، میں اگست ۱۹۸۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے مکمل طور پر سبکدوش ہو گیا تھا، یعنی دو سال باز ملازمت اور ایک سال وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد۔ ابھی بے کار رہتے مجھے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ پروفیسر آل احمد سرور کی تحریک پر مجھے کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں پہلے تین ماہ اور اس کے بعد مزید ایک تعلیمی سال کے لیئے وزٹنگ پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ کشمیر میں پہلی بار اسکول کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ۱۹۳۲ء میں آیا تھا۔ طویل وقفے کے بعد دوسری بار ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیئے حیدرآباد سے ۱۹۶۶ء آنا ہوا۔ اس کے بعد کئی بار مختصر مدت کے لیئے اس جنّتِ ارضی کا چکّر لگایا لیکن بھرپور انداز میں یہاں قیام کا موقع یا تو ۱۹۳۲ء میں ملا تھا یا اس بار ۸۲ء، ۸۳ء میں۔

وہاں میرا قیام یونیورسٹی کیمپس میں نسیم باغ میں تھا جہاں مجھے پہلے ایک کمرہ اور جون ۸۳ء میں بیوی کے آجانے کے بعد دو کمرے رہائش کے لیئے دیئے گئے تھے۔ اکبر بادشاہ کا بنا کردہ چناروں کا یہ باغ جھیل ڈل کے کنارے واقع ہے جہاں سے جھیل کا پُر لطف نظارہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ عین وسط میں 'چار چناری'، کا جزیرہ ہے اور ڈل کے دوسرے کنارے پر چشمۂ شاہی، شالامار اور نشاط باغ تھے۔ مغلیہ عہد کی صبح و شام کی دلچسپیوں کا

ذکر کسی شاعر نے اس انداز میں کیا ہے ؎

صبح در باغِ نشاط و شام در باغِ نسیم

چناروں کی کثرت کی وجہ سے نسیم باغ کے باشندے موسمِ سرما میں دھوپ سے محروم رہتے ہیں لیکن اگست کے گرم مہینے میں بھی یہاں بجلی کے پنکھے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ موسم خزاں میں رنگوں کی وہ بہار ہوتی ہے جیسے چناروں کے درختوں میں آگ سی لگ گئی ہو۔ سردی کا موسم آتے آتے یہ درخت برہنہ (مادر زاد برہنہ) ہو جاتے ہیں۔ پتے سوکھ کر زمین پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ کشمیریوں کی سردی کے موسم کی مونس 'کانگڑی' کے لیے چنار کے پتوں کا ایندھن سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ برہنی کے دل کی مانند مسلسل سلگتا رہتا ہے۔ کشمیری کانگڑی کو ساتھ لے کر سو بھی جاتے ہیں۔

جی گھبراتا تو 'شکارا' کرایے پر لیتا اور ڈل کو پار کر کے نشاط باغ یا شالامار جا پہنچتا۔ اس سے زیادہ پُرسکون سفر کا تجربہ مجھے اور کہیں نہیں ہوا۔ اتوار کا دن بالعموم دریائے جہلم کے کنارے 'بند' پر گزرتا، جہاں 'احدوس'، یا کسی اور ریستوران میں مُنہ کا مزہ بدلنے کے لیے کشمیری 'گوشتابہ' کا لُطف اٹھاتا اور پھر 'بند' کے چکر لگاتا۔ ۳۲ء میں جب میں کشمیر آیا تھا تو اسی 'بند' کے کنارے سرکاری کوارٹروں میں ڈھائی مہینے تک میرا قیام رہا تھا اس لیے اس کی یادیں حافظے میں تازہ ہو جاتیں۔ میرے ایک کشمیری واقف کار، جو آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے، مجھے وہاں اکثر ٹہلتا پا کر ایک روز کہنے لگے 'آپ کو تو 'بند' سے عشق سا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا عشق اور وحشت میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہوتا ہے۔ میں اِس جنتِ ارضی میں تنہائی کی وحشت کو بہلانے یہاں آجاتا ہوں۔

میں جب ستمبر ۸۲ء میں کشمیر پہنچا تو شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ حیات تھے اور صاحبِ اقتدار۔ اس سے قبل میں اُن سے دو تین بار دہلی میں مل چکا تھا۔ جامعہ اُردو

نے جب شریمتی اندرا گاندھی کو 'ڈکٹر ادب' کی اعزازی سند دہلی یونیورسٹی کے شنکر ہال میں منعقدہ خاص کنووکیشن میں دی تھی، تو وہ اور ڈاکٹر کرن سنگھ دونوں اس میں موجود تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ڈاکٹر کرن سنگھ مرکزی وزارت میں شامل تھے اور شیخ صاحب ابھی تک مسندِ وزارت سے محروم تھے۔ اس کے بعد دوسری ملاقات حکیم عبدالحمید صاحب کے دولت کدے پر ایک دعوت میں ہوئی تھی اس وقت ان کا انداز گفتگو کسی حد تک جارحانہ تھا۔ سردار پٹیل پر طنز کرتے رہے حتیٰ کہ جب میں نے اردو کی کس مپرسی پر گفتگو کرنا چاہی تو اسے بھی انھوں نے ایک غیر اہم موضوع قرار دیا۔ اس صحبت میں مجھے مرزا افضل بیگ ان سے زیادہ سمجھدار اور گہرے نظر آئے۔ بات کم کرتے تھے مگر تول کر۔ مشہور تھا شیخ صاحب کے 'نفسِ غیر ناطقہ' وہی تھے۔

لیکن اس کے بعد جب ایک بار شیخ صاحب جامعہ ملیہ تشریف لائے تو انھیں بالکل بدلا ہوا پایا۔ اب وہ ملّت کی باتیں بھی کر رہے تھے، اردو کی بھی اور اقبال کی بھی۔ ان کے ایثار اور قربانیوں کے پیشِ نظر میرے دل میں ان کا بڑا احترام تھا۔ کشمیر پہنچ کر مجھے کشمیریوں کو شیخ صاحب سے جو عقیدت تھی اور شیخ صاحب کو اقبال سے اس کا صحیح اندازہ ہوا۔ اُنھوں نے نہ صرف اقبال چیئر اور اقبال انسٹی ٹیوٹ کی داغ بیل ڈالی بلکہ کشمیر یونیورسٹی کی لائبریری کا نام بھی اقبال لائبریری رکھا۔ شیخ صاحب کی کشمیر اور کشمیریوں کے لیے قربانیوں کا اعتراف ہر شخص کی زبان پر تھا سوائے نوہٹہ کے علاقے کے میر واعظ اور چند قدیم خاندانوں کے بعض افراد کے۔ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ ہم تو اُس 'شیخ' کے قائل ہیں جو ہماری آزادی کی تحریک کا ہیرو اور شیر رہا ہے، اُس 'شیخ' کے نہیں جو وزارتِ عظمیٰ کا مسند نشیں ہو کر اپنے اہلِ خاندان کا مربّی بن گیا ہے۔ انھوں نے اپنے 'یارِ غار' مرزا افضل بیگ کو کشمیر کی سیاست سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کیا؛ اس کا بھی لوگوں کو قلق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شیخ صاحب

آخری بار افضل بیگ کی عیادت کو گئے تو انھوں نے بسترِ مرگ پر کہا "شیخ صاحب! میں ہمیشہ آپ کے پیچھے چلا ہوں۔ اب میں آپ سے آگے جا رہا ہوں آپ میرے پیچھے آیئے"۔

شیخ صاحب کو آخری بار میں نے ۱۵ اگست ۸۲ء گورنمنٹ سینٹرل ایمپوریم کے لان پر یومِ آزادی کی تقریب میں دیکھا۔ وہ صحت کے اعتبار سے اس وقت تک بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ اس قابل بھی نہیں رہے تھے کہ لوگوں سے کھڑے ہو کر ہاتھ ملا سکیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا کئے جیسے فرضِ کفایہ ادا کرنے آگئے ہوں۔ موٹر میں اپنی نشست تک آئے اور موٹر ہی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ تین ہفتے کے بعد، ستمبر کو اپنے مولا سے جا ملے۔

ان کی تدفین کا منظر میں نے نسیم باغ سے دیکھا۔ یہ ڈل کے کنارے عین اُسی مقام پر ہوئی جہاں میں روز شام کو ٹہلنے جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ جگہ انھوں نے اپنے لیے پہلے سے مختص کر لی تھی۔ ڈل کے کنارے اس چمن کے ایک کنارے پر حضرت بل کی درگاہ ہے، جہاں شیرِ کشمیر ہر جمعہ کو نماز کے بعد گرجتا تھا اور دوسرے کنارے پر ان کی آخری آرام گاہ ہے۔ میرا بس چلتا تو حضرت بل جیسی دوسری سنگِ مرمر کی پاکیزہ عمارت شیخ صاحب کے مزار پر بنوا دیتا!

شیخ صاحب کی تدفین کا منظر دیدنی تھا۔ ایک شورِ ماتم تھا جس میں بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں، شہری، دیہاتی سب شریک تھے۔ تدفین کے بعد عقیدت کا یہ منظر بھی دیکھا کہ لوگ مٹھیوں میں ان کے مرقد کی مٹی بھر کر تبرک کے طور پر ساتھ لے گئے۔ یہ غالباً بودھ اور کشمیری اسلام پر اثر تھا۔ یہ اثر ان کے طرزِ عبارت پر بھی نظر آیا۔ حضرت بل میں نماز پانچ منٹ کی ہوتی تو دعا، گھنٹہ بھر تک ہوتا رہتا۔ لاالہ اللہ کی آواز جب ڈل کے پانی پر چاروں طرف کے پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آتی تو بقولِ اقبال، "شبستانِ وجود لرز اٹھتا"۔

کشمیر کے دورانِ قیام میں، میں کچھ دنوں کے لیے اپنی عقلیت کو بالائے طاق رکھ کر 'درگاہی' بن گیا تھا۔ ہاری پربت کے دامن میں مخدوم صاحب کی بڑی درگاہ ہے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ وادیٔ کشمیر کے ولی ہیں اور یہاں ہر کام ان کے حکم سے ہوتا ہے۔ میں اس زمانے میں اپنے اکلوتے بیٹے جاوید کی جانب سے بہت متردّد رہتا تھا۔ اس نے نیویارک یونیورسٹی سے فزکس میں پی ایچ ڈی امتیازات کے ساتھ کرلی تھی اور اب میری خواہش تھی کہ وہ ہندوستان واپس آکر اپنا گھر بسائے۔ کشمیر یونیورسٹی کے فزکس ڈپارٹمنٹ میں اس کا بحیثیت لیکچرر انٹرویو کے بغیر تقرر بھی ہو گیا تھا۔ گھر بسانے کے سلسلے میں اُس کا ذہن صاف نہیں تھا ذرا میں ہاں اور ذرا میں نہ۔ ہم لوگ چاہتے تھے کہ جس طرح ہو یہ طائرِ رمیدہ زیرِ دام آجائے۔ ظاہر ایسے میں جہاں کسی اچھی لڑکی پر نظر پڑتی تو دل میں منصوبے بننا شروع ہو جاتے تھے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ میں مخدوم صاحب کے خاندان کی ایک طالبہ، طالعہ مخدومی ریسرچ کر رہی تھیں چوں کہ ان کا موضوع "اقبال کے تصوراتِ فن وجمالیات" تھا اس لیے سرور صاحب نے خاص طور پر مجھے اُن کی نگرانی پر مامور کیا۔ کچھ عرصے میں نہ صرف طالعہ کے جوہر مجھ پر کھلے وہ بھی میرے حسنِ سلوک کی وجہ سے مجھ سے بہت زیادہ مانوس ہوتی گئیں۔ ان کے والد عرصے سے بیمار اور حواس باختہ تھے۔ ممکن ہے انھیں میری شفقت میں ایک پدرانہ محبت کا بدل ملنے لگا ہو۔ جون ۸۳ء میں جب میری بیوی بھی سری نگر آگئیں تو طالعہ ان کی شخصیت سے بھی بہت متاثر ہوئیں اور ایک دن کہنے لگیں میری والدہ اور ان میں ہر اعتبار سے بڑی مشابہت ہے "بس ایک کو چھپاؤ اور دوسرے کو نکالو"۔

میری نظروں نے بہت جلد جاوید کے لیے طالعہ کا انتخاب کر لیا۔ میں نے ان سے غائبانہ [illegible] کا تعارف بھی کرا دیا۔ اسی زمانے میں جاوید کا کشمیر یونیورسٹی میں لیکچرر [illegible] سے انتخاب عمل میں آگیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ سب وادی کے

ولی مخدوم صاحب کے حکم سے ہو رہا ہے اس لیے میں نے ہر اتوار کی صبح باوضو ان کی درگاہ پر حاضری دینی شروع کر دی۔ یہ ذہن میں رہے کہ اس قسم کی حرکت میں نے کبھی چوبیس خواجاؤں کی چوکھٹ والی دلّی میں بھی نہیں کی تھی۔ اس لیے کہ میرا ذہن کسی بھی قسم کی مزار پرستی کو قبول نہیں کرتا۔ مزاروں کے عود و لوبان کی خوشبو اور قُل اور قوالی کے شور سے میری سوچنے کی صلاحیت مفقود سی ہو جاتی ہے لیکن بہرحال مخدوم صاحب کی درگاہ میں بڑی عقیدت سے جاتا، دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا اور اُن سے انھیں کے خاندان کی ایک لڑکی کا طالب ہوتا۔

اِدھر میں نے جاوید کو امریکہ خط لکھ کر ٹٹولنا شروع کیا۔ کبھی امید بندھتی تھی اور پھر ٹوٹ جاتی تھی۔ جب اس نے کشمیر کی ملازمت کی پیش کش کو بالآخر ٹھکرا دیا اور شادی کے مسئلے پر بھی گفتگو کرنے سے انکار کر دیا تو میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ مجھے اس سے بھی شکایت ہوئی اور مخدوم صاحب سے بھی جو اس کے دل کو نہ بدل سکے۔ ایک دن شکارے میں بیٹھ کر ڈل کو پار کیا اور نشاط باغ جا کر اضطراب کے عالم میں جاوید کو خوب کوسا اور بد دعائیں دیں۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ بس جھیل ڈل مجھے ایک بڑی چشمِ پُر آب کے مانند نظر آ رہی تھی!

اس عیوضی محبت، کی جانب میں نے قدم جس احتیاط سے بڑھائے تھے اسی احتیاط سے پیچھے ہٹا لیے۔ کچھ عرصے کے بعد طالعہ کی شادی ہو گئی۔

میں اقبال کے فکر و فن کا شائق اپنی طالب علمی کے زمانے سے رہا ہوں۔ اس کے بعد ایم۔اے کی کلاسوں کو مدتوں اقبالیات کا درس دیتا رہا ہوں۔ لیکن جس یکسوئی کے ساتھ مجھے اقبال کے مطالعے کا موقع اپنے کشمیر کے سوا سالہ قیام میں ملا اور کہیں نہیں ملا۔ اس سے میری عقیدت مطالعہ کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی گئی۔ یہ مطالعہ میں ایک مکمل سپردگی کے ساتھ کرتا۔ اور میرا یہ خیال راسخ ہوتا

گیا کہ کسی بڑے شاعر کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیے خود کو اس کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو کے عظیم شاعر صرف دو ہیں۔ غالب اور اقبالؔ، اور اقبالؔ کو منظم فکر کے اعتبار سے غالب پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ اسی زمانے میں رفتہ رفتہ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں اقبال کی فکر کے تمام پہلوؤں سے متفق نہیں ہوں۔ ان کی فکر کی مابعدالطبعیاتی سطح اور اس کے تصوّرات — خودی، عشق، وجدان، عظمتِ آدم مردِ مومن، تصورِ ابلیس وغیرہ میں بہت جاذبیت اور عمومیت پائی لیکن جب وہ اس سطح سے اتر کر معاشرتی مسائل پر آتے ہیں تو وہاں میرا آزاد ذہن ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا اور میں انھیں اسلام کی آڑ میں بہت زیادہ قدامت پسند پاتا تھا۔ میں خود نوشت کے گذشتہ ابواب میں مسلسل یہ اشارہ کرتا آیا ہوں کہ بچپن سے میرا ذہن آزاد خیالی کی طرف مائل رہا ہے اور میں نے ہر مذہب کو (بہ شمول اسلام) عقلیت کے معیاروں پر پرکھنے کی کوشش کی ہے، خاص طور پر مذاہب کی فروعات کو۔ اقبال اپنی مذہبی فکر میں (اور نتیجۃً معاشرتی افکار میں) ہندوستانی مسلمانوں کے متوسط طبقے کے اندازِ فکر سے آگے نہ جا سکے۔ وہ فقہِ اسلامی کی از سرِ نو تدوین کرنے کا عزم رکھتے تھے اور ایک جگہ کہا بھی ہے کہ اس دور کا مجدّد وہی کہلائے گا جو اس کام کو انجام دے گا۔ کاش وہ اس کام کو مکمل کر لیتے تو معلوم ہوتا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

شروع شروع میں اقبال کے فن کے جادو نے مجھے اس انداز میں سوچنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ مجھے ایک رَو میں لے جاتا تھا اور میں اسلامی تاریخ کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھ پاتا تھا۔ اب اقبال کی اسلامی فکر اور 'اسلامیت' کو میں نے ناقدانہ نظر سے دیکھنا شروع کیا اُن کی ہمہ اسلامیت، کی معنویت کے بارے میں اندیشہ ہائے دراز پیدا ہونے لگے۔

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لیئے

مجھے ایک عینیت پرست کا خواب نظر آنے لگا۔ تاریخِ عالم پر جب میری نظر پڑ جاتی تو مجھے اس بات پر یقین کرنے میں تامل ہوتا کہ سارے عالم کی تنظیم اسلام کی اساس پر کی جا سکتی ہے، جیسا کہ اقبال کا عقیدہ تھا۔ دنیائے عرب میں جو انتشار تھا اس سے میرے خیال کی تصدیق ہو جاتی تھی۔

میں اب اس قسم کے تصورات یا زن، رقص اور تیاتر کے بارے میں اقبال کے خیالات کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ لیکن شعر کے پیرائے میں ہر بار اقبال کا وار بھرپور پڑتا۔ اور میں ان کے اس قسم کے اشعار کو بھی وحی الہام سمجھ کر وردِ زبان رکھتا۔ جنھیں عقل یا تاریخی شعور قبول نہیں کرتا سے

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

اب میری ذہنی کشمکش یہ تھی کہ اقبال کا ہر حرف، حرفِ آخر، کا حکم نہیں رکھتا۔ ان کی فکر کے بارے میں اگر خالص علمی انداز میں گفتگو کی جائے تو اس کے بہت سے گوشے 'غیر منوّر' نکلیں گے لیکن ان کے فن کی ساحری سے کس طرح نپٹا جائے، کہ جو کہدیا ہے وہ دل میں تیر بن کر اُتر جاتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم 'مسجدِ قوت الاسلام' ہی کو لے لیجیے۔ کس پیمبرانہ آواز کے ساتھ دعوت دی ہے۔

کیوں مسلماں نہ خجل ہو تری سنگینی سے
کہ غلامی سے ہوا مثلِ زجاج اس کا وجود!

ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز
جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مورخ کی نظر سے 'مسجد قوت الاسلام' کو دیکھتا اور جانتا ہے کہ اس کی تعمیر کے لیۓ ایک دوسرے مذہب کی عبادت گاہ کی تخریب کی گئی ہے (جس کے آثار آج بھی نمایاں ہیں) تو وہ بحیثیت انسان کس طرح اقبالؔ کی اس تمجید اور تکبیر میں تہِ دل سے شرکت کر سکتا ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہے کہ اقبال کے افکار کے اس حصے سے قاری متاثر نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ 'جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے' فنِ شعر کے جادو پر یہ قول پوری طرح صادق آتا ہے۔ اسی لیۓ کہا گیا ہے کہ 'صداقتِ شعری'، 'تاریخی صداقت'، سے مختلف ہو سکتی ہے۔ یہ سحر اور علم کی صداقت ہوتی ہے جس کی عقل منکر ہوتی ہے اور دل شہادت دیتا ہے۔

چنانچہ رفتہ رفتہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہیں سروکار اقبالؔ کی فکر سے زیادہ ان کے فن سے رکھنا چاہیۓ۔ اقبال کی فکر کی ساری 'بُراقی' اسی 'تہمتِ شعر' کی وجہ سے ہے جس کو زائل کرنے کے لیۓ وہ بار بار تاویلیں پیش کرتے رہے۔ اُن کی عظمت کا اصل راز خود ان کے بقول یہ ہے ؎

یہ کون غزل خواں ہے پُرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

معاشرتی سطح سے قطع نظر اقبال کے سیاسی تصورات میرے لیۓ اور بھی اُلجھن کا باعث رہے ہیں۔ مثلاً ان کا 'اسلامیت'، یا 'قومیتِ اسلام'، کا تصور۔ باوجود اس کے کہ وہ نہایت خوبصورت شعری پیکر میں پیش کیۓ گۓ ہیں، جنھیں پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیۓ انسان کی سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے لیکن جو منطقی استدلال یا تاریخی حالات کی کسوٹی پر مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ میں قطعی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب دنیاۓ عرب میں ایک اسلامی مملکت کی تشکیل نہیں ہو سکی تو اس کے دامن میں

اس قدر مختلف النوع قومیتیں جیسے ترکی، ایران، افغانستان، پاکستان یا بنگلہ دیش کس طرح محض 'عقیدہ' کے اشتراک کی بنیاد پر یکجا کیے جا سکتے ہیں؟ جاوید اقبال نے لکھا ہے کہ "اقبال اسلام کو ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک اصول یا انسانی اتحاد کو وجود میں لانے کے لیے ایک عملی تحریک تصور کرتے تھے" (زندہ رود ص ۶۵۷) یہ تاریخ انسانی کا ایک خواب ہے یا حقیقت؟

اسی طرح بحیثیت ایک ہندی مسلمان ہونے کے میں اقبال کے آخری دور کے شمال مغربی اسلامی مملکت کے خواب کو اپنے لیے کیوں کر حقیقت سمجھ سکتا ہوں۔ پاکستان کی قیمت ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے خون سے چکائی ہے!

میرے خیال میں اقبال کی سیاسی فکر کو بدلتے ہوئے حالات کے آئینہ میں دیکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے ایک جگہ کہا ہے "ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنا نظریہ تبدیل کرے اور بقول ایمرسن صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں بدلتے" (زندہ رود ص ۶۵۵)۔ آجکل جو اقبال کی آخری دور کی سیاسی فکر کے بارے میں بحث چل نکلی ہے اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اقبال ابتدا میں یقیناً قوم پرست تھے۔ ان کی قومی اور وطنی شاعری کا جواب پوری اردو شاعری میں نہیں ملتا لیکن جب یہ قوم پرستی ان کی اسلامیت کے آڑے آتی گئی تو وہ اس حقیقت سے کنارہ کش ہو کر 'ہمہ اسلامیت' کا خواب دیکھنے لگے۔ صرف کبھی کبھی 'شعاعِ امید' جیسی نظموں میں 'خاکِ وطن' کی محبت ایک بار پھر ان کے دل میں کروٹیں لینے لگتی ہے ؎

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ نظم ۱۹۳۶ء میں خطبۂ مسلم لیگ (۱۹۳۰ء)

کے بہت بعد لکھی گئی ہے، جو شاملِ ضربِ کلیم ہے۔

اقبال ۱۹۳۰ تا ۱۹۳۷ء مسلم لیگ کے دیگر قائدین کی طرح ایک آزاد اسلامی مملکت کی اصطلاح میں نہیں سوچ رہے تھے۔ انھیں "پاکستان" کی نہیں مسلمانوں کے لیے ایک تہذیبی "گھر" کی تلاش تھی۔ ۳۷ء تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان کے سیاسی حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس کئی صوبوں میں برسرِ اقتدار آگئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلم عوام سے براہِ راست رابطہ قائم کرنے کا پروگرام بنایا۔ اب اقبال کی سیاسی بصیرت پر بھی یہ بات روشن ہو گئی جو سر سید نے ۱۸۶۷ء میں اردو کے معاملے میں بنارس میں محسوس کی تھی۔ یعنی "یہ دونوں قومیں کسی معاملے میں صدقِ دل سے اور پوری طرح ایک دوسرے سے اشتراک نہیں کر سکتیں..."

انھوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کو لکھا:

"... شریعت اسلامیہ کا نفاذ اور ارتقا اس ملک میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔ سال ہا سال سے یہی میرا پختہ عقیدہ رہا ہے اور میں اب اسی عقیدے کو مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان کے امن کا بہترین حل سمجھتا ہوں۔ ... مسلم ہند میں ان کے مسائل کے حل آسانی رائج کرنے کی خاطر ملک کی تقسیم کے ذریعے ایک یا زائد مسلم ریاستوں کا قیام اشد ضروری ہے۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبے کا وقت آن نہیں پہنچا؟ ..."

تین ہفتے کے فصل سے اقبال نے محمد علی جناح کو دوسرا خط ۲۱ جون ۳۷ء کو لکھا جس میں تقسیم ملک اور بنگال کے مسلمانوں کا زیادہ کھلے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:

"... ہندوستان میں قیامِ امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ اور تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب وہی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے، یعنی صوبوں

پر مشتمل ایک جداگانہ وفاق کا قیام.... میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ شمالی مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اسی طریق سے وابستہ ہے....۔"

ان دو خطوں کی موجودگی میں، جو انتقال سے صرف دس گیارہ ماہ قبل لکھے گئے ہیں، اقبال کی سیاسی فکر کا جواز ڈھونڈھنا، حقائق سے انحراف کرتا ہے۔ مسلم اقلیت کے صوبوں کو انھوں نے جس سہل انگاری کے ساتھ صرفِ نظر کیا ہے اس کے بارے میں ہندی مسلمان اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے ؎

اقبالؔ! اپنا محرم کوئی نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

تاہم اقبال ایک عظیم مفکر اور شاعر ہیں۔ ہمارے نقطۂ نظر سے ان کے اس جرم پر کہ انھوں نے تقسیمِ ملک کی حمایت کی انھیں نہ تو ان کی ہندوستانیت سے محروم کیا جا سکتا ہے اور نہ اُن کی فکر کے عالمی پہلوؤں سے۔

پاکستان کی تائید تو شری راجگوپال اچاری نے بھی کی تھی اور اس کی منظوری مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کے علی الرغم پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل نے دی تھی۔ تو کیا یہ سب لوگ ہماری قومی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے کیے جائیں گے؟

دراصل ٹیگور ہوں کہ اقبال، ان شخصیتوں کو سیاست کے بدلتے ہوئے پیمانوں سے ناپنا غلط ہوگا۔ ٹیگور کی 'ویدانیت' ہو کہ اقبال کی 'اسلامیت'، وحدتِ انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ دونوں آج بھی ہند و پاک کے افق پر شعر کی توس قزح کے ذریعہ فصل میں وصل کی کیفیت پیدا کیے ہوئے ہیں۔

سولھواں باب

علی گڑھ (۶)

(۸۳ء تا حال)

صبح کا بھولا شام کو واپس آئے تو اسے بھولا نہ جانیے۔ علی گڑھ میرا مقدر بن چکا تھا۔ ابھی کشمیر کی شاداب وادی میں اِس بُوڑھی گائے کی کُلیلیں، ختم نہیں ہوئی تھیں کہ علی گڑھ سے بُلاوا آگیا۔ وہاں ترقی اردو بورڈ (ثم بیورو) کا ایک اردو۔اردو لغت کا منصوبہ ۱۹۷۳ء سے چل رہا تھا۔ اس کے تحت پانچ مولفین ۔ پروفیسر آل احمد سرور، مالک رام صاحب، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختار الدین اور راقم الحروف کو ایک ایک جلد کا ایڈیٹر مقرر کر کے ایک ایک اسسٹنٹ کی مدد سے ایک جامع اور جدید لغت کی تالیف کا کام ۱۹۷۳ء میں سپرد کیا گیا تھا۔ بوجوہ اس کام میں زیادہ پیش رفت نہ ہو سکی اور چار پانچ برس کے بعد بورڈ کی جانب سے اعتراضات ہونے لگے۔ جب میر نصر اللہ صاحب، وزارتِ تعلیم کے ایڈیشنل سکریٹری کی حیثیت سے اردو بیورو کے افسرِ اعلیٰ تھے تو انھوں نے لغت کی سست رفتاری کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا کہ یہ کام انگریزی۔ اردو لغت کے نمونے پر پانچ مولفین سے لے کر ایک۔کو سپرد کر دیا جائے تو زیادہ ذمہ داری سے ہو سکے گا۔ اتفاق سے دونوں لغات کے ... ایک زمانے میں ترتیب دیئے گئے تھے جب کہ

انگریزی۔ اردو لغت کا کام تنہا پروفیسر کلیم الدّین کے سپرد کیا گیا، اردو۔ اردو لغت کا کام پنچایتی بنادیا گیا وہ بھی ۳۵۰ روپے کے حقیر اعزازیے پر۔ اس وقت مالک رام صاحب کے علاوہ ہم سب یونیورسٹی میں پروفیسری کی خدمات پر مامور تھے اور قاعدے کے مطابق اپنی تنخواہ کے ۲۰ فی صد سے زیادہ اعزازیہ نہیں لے سکتے تھے، اور وہ اسی قدر ہوتا تھا۔ بہر حال اور جو وجوہ ہوں اردو لغت کے کام میں پیشرفت نہیں ہو سکی۔ جب کہ پروفیسر کلیم الدّین اپنے مکان پر انگریزی اردو لغت کا دفتر جما کر، اطمینان سے کام کرتے رہے۔

جولائی ۸۲ء تک وزارت تعلیم نے طے کر لیا کہ اردو لغت کی تنظیمِ نو انگریزی اردو لغت کے انداز پر کر کے اس کام کو بھی ایک شخص کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ میر نصراللہ صاحب کے دفتر میں ایڈیٹوریل بورڈ کا جلسہ ہوا جس میں ان کی تجویز پر طے پایا کہ یہ کام راقم الحروف کے سپرد کر کے لغت کا دفتر علی گڑھ میں میرے مکان کے دو کمروں میں انگریزی۔ اردو لغت کے انداز اور شرائط پر قائم کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے یکم دسمبر ۸۲ء کو کشمیر کو خیرباد کہا اور علی گڑھ آکر اپنے نئے کام کا چارج لے لیا۔ چارج ان معنوں میں کہ دوسرے مولفین کے یہاں سے تیار شدہ کارڈ متعلق لغات اور دیگر سامان کو اپنے یہاں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ترقی اردو بیورو کے اربابِ حل و عقد کو امدادی اسٹاف کے تقرر کی اجازت کے لیے عرض داشتیں بھیجنا شروع کیں۔ واہ رے دفتر وزارتِ تعلیم! اور واہ ری بدنصیب اردو! وہاں لغت اردو کی فائل پر یہ نوٹ لکھا گیا کہ ایڈیٹر کے تقرر کی اجازت تو مل گئی ہے لیکن باقی اسٹاف کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ میں انگشت بدنداں تھا! کیا آپ یقین کریں گے کہ دفتری گھِس گھِس میں اسٹاف کے تقرر کی منظوری مجھے جون ۸۳ء میں جا کر ملی۔ اس کے بعد مجھے پہلے ۶ ماہ کی مدّ فاضل سمجھ کر ادائیگی نہیں کی گئی۔ حالاں کہ میں نے اپنا کام دسمبر ۸۲ء میں کشمیر سے واپس آنے کے فوراً بعد شروع کر دیا تھا۔ بالآخر وزارتِ تعلیم کو بہت تگ و دو کے بعد یہ ادائیگی کرنا پڑی۔ اس طرح کام کا آغاز بد دلی کے ساتھ ہوا۔ جون ۸۳ء سے

جب بیشتر مددگاروں کا تقرر ہو گیا تو تالیفِ لغت کے کام میں تیز رفتاری آنا شروع ہوئی۔ میرے بیشتر مددگاروں کو لغت نویسی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ صرف ایک یوسفی صاحب کو پہلے سے اس اسکیم میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ لیکن وہ جغرافیہ میں ایم اے تھے اس لیے اُن کی اردو کی معلومات محدود تھی جس کی کمی وہ اپنی محنت اور وقت کی پابندی سے کر دیتے تھے۔ میں نے دو سال کے اندر اس لغت کی جلدِ دوم جو د تا س کے حروف پر مشتمل تھی مکمل کر لی اور اس کی پریس کاپی تیار کر کے بیورو کے ڈائریکٹر کو بھیج دی۔ اس کے بعد جلد اوّل کی تیاری کے لیے چھ مہینے اور دیئے گئے، اس کا بھی کچھ حصّہ مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد اسکیم ختم کر دی گئی اور تا حال دو ریویو کمیٹیوں کی سفارشوں کے باوجود معاملہ معلّق ہے اور اس کا سارا ساز و سامان اب تک میرے یہاں پڑا ہوا ہے۔

لغت نویسی کے فن میں داخل ہونے کے بعد مجھے علم ہوا کہ فرہنگ آصفیہ کے اختتام پر اس کے مؤلف نے جو لکھا ہے وہ فاعتبروا یا اولی الابصار کے تحت حرف بہ حرف صحیح ہے۔

"..... ہمارے ناظرینِ فرہنگ واقف ہو گئے ہوں گے کہ ہم نے کس کس جاں کاہی، جانفشانی اور اخراجات برداشت کر کے اس فرہنگ کو انجام پر پہنچایا۔ خود ہماری آٹھوں پہر کی روزانہ جمتوّل نشست نے مصائب کے ضمن میں یہ مزید عنایت فرمائی کہ پیٹ بڑھا کر توندل کر دیا۔ ریاحی بواسیر ضعفِ مثانہ بہم پہنچا دیا، معدہ بگاڑ دیا، اعصاب کو ڈھیلا کر دیا....."

لغت نویسی کی ہمارے یہاں روایت قدیم ہے لیکن ہمارا لغت نویس اس فن کی اُن باریکیوں سے واقف نہیں جن کی مغرب میں آکسفورڈ ڈکشنری یا ویبسٹر کی لغتِ کلاں نے روایات قائم کی ہیں۔ میں نے اردو لغت کا نمونہ ویبسٹر کی لغتِ کلاں سے لیا۔ اندراجات کے اصول، ذیلی اندراجات کا محل و مقام، تلفظ، قواعدی زمرہ اور سب سے اہم الفاظ کے مشتقات کا التزام رکھا۔ مثالیں صرف

ان الفاظ کی دیں جو یا تو متروک ہو گئے ہیں یا جو مخصوص معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ محاورات بھی ضرورت کے مطابق دیئے لیکن صاحب آصفیہ یا مہذب اللغات کی طرح لغت کو محاورات کی کھتونی بنانے سے احتراز کیا اس لئے کہ ہر زبان میں محاورات پر مشتمل علاحدہ سے لغات تصنیف کی جاتی ہیں۔ اس لغت کو جامع تر بنانے کے لیئے اس میں دکنی اردو کے الفاظ کا بھی شمول کیا گیا۔ غرض کہ ہر لحاظ سے حوالہ کی ایک ایسی کتب بنانے کا التزام کیا جس کی مدد سے قدیم تا جدید ہر عہد کے ادب کا مطالعہ کیا جا سکے۔ مختلف علوم کی اصطلاحات کو اسی قدر جگہ دی گئی جس قدر کہ وہ عام زبان کا حصہ بن گئی ہیں۔

مجھے اس کا بھی احساس ہوا کہ لغت نویسی ایک تاب شکن فن ہے اور ایک اس میں داخل ہو جانے کے بعد انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ اس کا مولف شیر کے منہ میں اپنا ہاتھ دیتا ہے۔ تحسین سے کم اور تعریض سے زیادہ سابقہ پڑتا ہے اور اس کو مرنے کے بعد ستائش ملے تو ملے، جیتے جی یہ اس سے محروم رہتا ہے۔ لغت کی تالیف کے لیئے طویل مدت اور کثیر سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام عجلت میں نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سرکار ان مسائل سے بے خبر ہوتی ہے اور ہتھیلی پر سرسوں اُگانے کی قائل ہوتی ہے۔ چنانچہ وزارتِ تعلیم نے ۱۹۷۳ء سے کر ۱۹۸۳ء تک کی مدّت اور اخراجات کو مجھ سے محسوب کر کے ڈھائی سال کے بعد اس اسکیم کو یک لخت بند کر دیا۔

لغت نویسی کے فن سے مجھے ذاتی طور پر بہت فائدہ پہنچا۔ ہر قسم کے الفاظ کی پرکھ ہو گئی۔ اس تربیت کے بعد اب میں صحیح معنوں میں لغت کی باقی ماندہ جلدوں کا حق ادا کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی نوعیت ابھی تک نہیں آئی ہے اور اب جو آئی تو یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ میری تربیت یافتہ جماعت تتر بتر ہو گئی ہے۔ اردو کے جس ٹائپسٹ کو میں نے بڑی محنت سے اس قابل بنایا تھا کہ وہ لغت کا مسوّدہ صحیح ٹائپ کر سکے دوسروں کے ہاتھوں میں

چلا گیا ہے۔ غرضیکہ آشیانے کے لیئے ایک ایک تنکا پھر جمع کرنا پڑے گا۔ اب میں ترقی اردو بیورو کے وعدوں پر بے دلی کے ساتھ یقین کرتا رہتا ہوں۔

اسی زمانے یعنی ۱۹۸۴ء میں بیرونِ ہند کا ایک غیر متوقع سفر درپیش آیا جسکی تمام تر ذمہ داری میرے عزیز دوست پروفیسر احسان رشید پر ہے جو اس وقت اُردن میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے متعین تھے۔ حکومت اردن کا ایک ثقافتی ادارہ ہر سال ایک علمی و تحقیقی سیمینار منعقد کرتا ہے جس میں باہر کے اساتذہ و علماء کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب تقریباً ہر سال اس میں شرکت کرتے ہیں۔ احسان صاحب کی تحریک پر اس سال مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ میں پریشان تھا کہ میں وہاں اپنی موجودگی کا اظہار کس طرح کرسکوں گا اس لیئے کہ میں عربی زبان بالکل نہیں بول سکتا، سمجھتا بھی نہیں صرف پڑھ کر مطلب نکال لیتا ہوں۔ بہر حال موقع سے فائدہ اٹھا کر میں مختار الدین صاحب کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم صاحبہ بھی تھیں، جن کا پروگرام وہاں سے مقاماتِ مقدسہ کی سیر تھی۔ وہاں ہمارا قیام ایک نہایت نفیس ہوٹل میں تھا۔ کانفرنس کے اجلاس بھی اسی ہوٹل میں ہوتے تھے۔ کھانے پینے کی اشیاء کی افراط تھی۔ جب سے میرے خون میں شکر دریافت ہو گئی ہے میں ہاتھ روک کر کھاتا ہوں، خاص کر میٹھے سے اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن خورد و نوش کے اس ماحول میں اس حکیمانہ قول کو نظر انداز کرنے لگتا ہوں کہ خوردن برائے زیستن نہ کہ زیستن برائے خوردن۔ کیوں صاحب پھر زندگی ضروری کیا ہے جب قدم قدم پر نواہی سے سابقہ ہو۔ ایک شام کا ڈنر پرنس حسن بن طلال برادرِ خورد ولی عہد شاہ حسین کی جانب سے تھا۔ میں نے اس سے بہتر روسٹ کہیں نہیں کھایا، وہ تو ہماری میز پر وہاں کے میڈیکل کالج کے ایک بزرگ شریک ہو گئے۔ نہ خود کھاتے تھے نہ اوروں کو کھانے دیتے تھے۔ یا فتاح! یہ کیا مصیبت ہے ہر لذیذ غذا کا تیر قلب یا جگر پر پڑتا ہے۔ کھانا کھا کے بے مزہ رہا۔

کانفرنس کے اختتام پر احسان رشید صاحب مجھے ہوٹل سے اٹھا کر اپنے یہاں لے گئے۔ دو تین دن ان کے یہاں قیام رہا۔ ان کی بیگم کا آپریشن ہوا تھا اور وہ چند روز قبل اسپتال سے مکان پر آئی تھیں لیکن احسان صاحب کی توجہ میں کمی نہ پائی۔ مجھے گھمانے بحرالموت (ڈیڈ سی) لے گئے جو سطح سمندر سے نیچے ہے۔ اس کے دوسرے کنارے سے اسرائیل کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ دوسرے روز اپنے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے حضرت شعیب کی قبر اور اصحاب کہف کا غار دکھا لاؤ۔ دونوں چیزیں قابلِ دید ہیں۔ حضرت شعیب کی قبر بلا مبالغہ نو دس فٹ کی ہوگی۔ کہا جاتا ہے اس زمانے میں اس علاقے کے تمام لوگ لَونبے ہوتے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر رومن سلطنت کے آثارِ قدیمہ بڑے بڑے ستونوں کی شکل میں دیکھے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا شوکت اور دلآویزی کی شان ہوگی۔ اصحابِ کہف کا قصہ تو قرآن کریم میں بھی موجود ہے سگِ اصحابِ کہف کی ہڈیاں تک شیشے کے اندر محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم۔

اردن ایک قدیم ملک لیکن جدید ریاست ہے۔ میں اس بات پر حیران ہوتا تھا کہ اہلِ اردن کی خوشحالی کا راز کیا ہے۔ بالکل ایک یورپی ملک معلوم ہوتا ہے۔ ایک روز وہاں کی یونیورسٹی دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اسے کسی بھی یورپی یونیورسٹی سے صفائی اور سلیقے میں کم نہیں پایا۔ سب سے پہلے مہمان کو یونیورسٹی پر بنی ہوئی مختصر سی فلم دکھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی دلچسپی کے مطابق ان شعبوں میں گھمایا جاتا ہے جن کو وہ دیکھنا چاہے۔ میں نے لائبریری جانا پسند کیا۔ اس کو بھی امریکی یونیورسٹی کی لائبریری کے مماثل پایا۔ سہولتوں اور سروس دونوں اعتبار سے۔ طلبہ کو بھی ہندوستان سے زیادہ چاق چوبند پایا۔ یہ سب دیکھ کر میں سوچتا رہ گیا کہ اس قدر ترقی یافتہ قوم کو اسرائیلی کس طرح زیر کیے رہتے ہیں۔ یقیناً وہ ان سے بھی بہتر ہوں گے۔

اردن سے واپسی پر چند روز راستے میں کراچی رکا۔ بیشتر وقت اپنے عزیز دوست فرمان فتح پوری صاحب کے ساتھ اردو لغت بورڈ کے دفتر میں گزارا

میں نے فرمان صاحب سے کہا کہ آپ لوگوں نے یہ بہت بڑا کام اٹھایا ہے۔ اتنی بڑی لغت کے لیے قدیم متون کی ترتیب کا کام پہلے ہونا چاہیے۔ مصنفین اور تصانیف کے سنین کے بارے میں فیصلے ہونے چاہئیں۔ ان کے بغیر تاریخی اصولوں پر لغت کیوں کر مرتب کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے ان دقتوں کا اعتراف کیا اور کہا "لا محدود التواء کے مقابلے میں کچھ تو کیا جائے کی پالیسی بہتر ہوتی ہے"۔

۱۹۸۵ء میں اردو لغت کی اسکیم کو ایک بند باب سمجھنے کے بعد میں نے اپنی ساری توجہ جامعۂ اردو اور اپنے تصنیفی کاموں کی جانب مبذول کر دی۔ جامعۂ اردو کا، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے میں جنوری ۱۹۷۳ء میں پہلی بار شیخ الجامعہ منتخب کیا گیا تھا۔ اسی سال نومبر میں دہلی بحیثیت وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ میرا تقرر عمل میں آیا اور وہاں چلا گیا۔ میری غیر حاضری میں جامعہ اردو کے کام کی نگرانی نائب شیخ الجامعہ ڈاکٹر عتیق صدیقی کرتے رہے۔ میں مختلف مواقع پر، خصوصاً مختلف مجالس کی صدارت کرنے کے لیے دہلی سے علی گڑھ آتا جاتا رہا۔ لیکن اگست ۱۹۷۸ء میں جب میں جامعہ کو خیرباد کہہ کر پھر علی گڑھ آ گیا تو جامعہ اردو کی ذمہ داری میں نے پھر سنبھال لی۔ کچھ عرصے کے بعد جب تیسری بار میرا انتخاب عمل میں آیا تو میری تجویز پر پروفیسر عبدالعظیم، صدر شعبۂ لسانیات کا انتخاب نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ہو گیا۔ اعزازی خازن کے عہدے پر الحاج عبیدالرحمن خاں شیروانی حسب سابق کام کرتے رہے۔ ان کے بعد ۸۶ء میں اس عہدے پر ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس زمانے میں جامعہ کے امتحانات میں بیٹھنے والوں کی تعداد بڑھ کر چودہ ہزار کے قریب ہو گئی۔ ۱۹۷۶ء میں معلم اردو کا نیا امتحان کھل جانے کے بعد طلبہ نے اس کی جانب بھی توجہ کی۔ اس لیے کہ یہ پروفیشنل امتحان ہے۔ طلبہ کی تعداد کے ساتھ آمدنی بھی بڑھی، سالانہ بجٹ تین لاکھ سے بڑھ کر دس لاکھ ہو گیا۔ آمدنی بڑھنے کے ساتھ ہم نے کئی بار اہلکاران جامعہ اردو کے گریڈوں

پر نظرِ ثانی کی اور مہنگائی بھتہ میں ہر سال اضافہ کیا۔

ایک خیال جو میرے ذہن میں عرصے سے گھوم رہا تھا یہ تھا کہ جامعہ اُردو کے میڈیکل کالج سڑک کے رُخ پر اگر دکانیں تعمیر کردی جائیں تو اس کی آمدنی میں اضافہ ہوجائے گا۔ یہ ضمانت ہوگی جامعہ کے بُرے دنوں کے لیے۔ میں اِس سلسلے میں جب بھی تجویز رکھتا مجلسِ عام کے ایک بااثر رکن یہ کہہ کر کہ اس سے جامعہ کی عمارت کی 'جمالیات' خراب ہوجائے گی، مسترد کرادیتے۔ بالآخر اورنگ آباد کی ۱۹۸۶ء کی مجلسِ عام کے جلسے سے پہلے میں نے امیرِ جامعہ، ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب سے اس سلسلے میں گفتگو کی اور ان کی مدد چاہی۔ چنانچہ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس سال بہ سال دہرائے جانے والے اعتراض پر کل اختیارات صدر کو سونپ دینے کی تجویز رکھی، جو منظور ہوگئی اور اس کے بعد انھوں نے دکانوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے مجھے ہری جھنڈی ہلادی۔ آجکل ترقی پسندی جس قدر آسان ہے تعمیر پسندی اسی قدر مشکل ہے۔ میں نے کچھ ذاتی تجربے کی بنا پر اور کچھ دوسرے لوگوں کے تجربے کی مدد سے دکانوں کا اچھا سا نقشہ بنوایا۔ جس میں جامعہ کی مرکزی عمارت کی جمالیات اور پیش منظر کا نمایاں خیال رکھا گیا اور ان دکانوں کو 'اردو بازار' کے نام سے ۱۹۸۷ء میں مکمل کردیا۔ اسی سال امیرِ جامعہ نے مجلسِ عام کے اراکین کے سامنے اس کا افتتاح کیا۔ اس وقت ہر شخص کے لب پر تحسین کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اُردو بازار، صحیح معنوں میں جمالیات اور مالیات کا سنگم بن گیا ہے۔

اس 'کارے کردم' کے ساتھ میری خواہش تھی کہ نئے انتخابات کے وقت میں سبکدوش ہوجاؤں، لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ میری مدتِ عہدہ آئندہ انتخابات ہونے تک بڑھادی گئی۔ پچھلے چند سالوں سے میں محسوس کررہا ہوں کہ بعض حضرات کی جاہ طلبی کی وجہ سے جامعہ اردو میں سیاست آتی جارہی ہے۔

میرا ایک خواب اور اردو ذریعۂ تعلیم کے جونیر اسکول قائم کرنے کا رہ گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس کو شرمندۂ تعبیر کرسکوں گا۔ یہ خواب میں اپنے

عزیز شاگرد اور جامعۂ اردو کے اعزازی خازن، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔ انھوں نے اس سلسلے میں بہت تپاک ظاہر کیا ہے اور چوں کہ اس وقت جامعہ کا بجٹ تین لاکھ سے بڑھ کر دس لاکھ ہو گیا ہے اور اسی قدر رقم فکسڈ پازٹ میں پس انداز ہے، قدم بہ قدم جامعہ اردو اس منزل کی جانب بھی بڑھ سکتی ہے۔ دیکھنا ہے کہ معترضینِ جامعہ اردو کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے!

جامعہ اردو کے سلسلے میں ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب سے میری رفاقت کا یہ پندرھواں سال ہے، یعنی جنوری ۱۹۷۲ء سے وہ جامعہ اردو کے چانسلر اور میں اس کے وائس چانسلر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک فعال شخصیت کے مالک ہیں۔ ان میں علمی و عملی دونوں قسم کی صلاحیتیں خداداد ہیں۔ ابتدائی چند سالوں میں ان کے توسط سے جامعۂ اردو کو چند بڑی رقوم بھی حکومتِ اترپردیش اور مہاراشٹر کی جانب سے ملیں۔ یہ انھیں کے سیاسی اثرات کا کرشمہ تھا کہ شریمتی اندرا گاندھی، اپنے مشیروں کی صلاح کے علی الرغم جامعۂ اردو کی 'دکتورِ ادب' کی اعزازی ڈگری قبول کرنے پر تیار ہو گئیں۔ اس سلسلے میں دہلی یونیورسٹی کے شنکر ہال میں مارچ ۱۹۷۴ء میں ایک خصوصی کنونشن کی تقریب منعقد کی گئی، جس میں مرکزی سرکار کے کئی وزراء کے علاوہ شیخ محمد عبداللہ بھی شریک تھے۔ بایں ہمہ اس قدر ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ اپنے 'منسٹرانہ' طرزِ عمل کی وجہ سے بعض اوقات ان کا رویہ دوسرے عہدیدارانِ جامعہ اردو اور اراکینِ مجلسِ عام کے ساتھ وہ نہیں ہوتا جس کی تعلیمی حلقوں میں توقع کی جاتی ہے۔ جامعہ اردو کو بعض اوقات وہ اپنے سیاسی مقاصد کے لیے بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایمرجنسی کے زمانے میں اس کی مجلسِ عام کا تائیدی ریزولیشن پاس کرنا۔ اُن میں اور چیف جسٹس ہدایت اللہ صاحب میں، جن کے ساتھ مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام کرنے کا شرف حاصل رہا ہے، بنیادی فرق ایک 'جسٹس' اور 'وزیر' کا ہے۔

۱۹۸۵ء میں اردو لغت کی پیشہ ورانہ مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد میں نے جامعۂ اردو کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اپنی علمی تعمیر کا بھی سلسلہ شروع کردیا۔ اسی زمانے میں ایجوکیشنل بک ہاؤس کے مالک و منیجر اور اپنے دوست اسدیار خاں صاحب کے پیہم اصرار پر میں نے "مقدمہ تاریخ زبانِ اردو" کا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن تیار کیا جسے انھوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ ۱۹۸۷ء میں آف سیٹ کی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کیا۔ اس سے ایک سال قبل وہ میرے مجموعہ کلام "دو نیم" کا اضافہ شدہ ایڈیشن شائع کر چکے تھے۔ میرے مرتب کردہ کے قصہ مہر افروز و دلبر کا نیا ایڈیشن انجمن ترقی اردو عنقریب شائع کرنے والی ہے۔ میرے انگریزی تحقیقی رسالے A Phonetic and Phonological study of the word in Urdu کا ترجمہ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے نہایت صحت اور محنت کے ساتھ کیا جسے شعبۂ لسانیات نے اہتمام سے ۸۶ء میں شائع کیا۔ اسی سال میں نے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام لکھنؤ میں "ہندوستانی زبانوں میں اردو کا مقام" پر خطبہ دیا۔ جنوری ۸۸ء میں "نیاز فتحپوری کے اسلوبِ نگارش" پر نیاز میموریل خطبہ کراچی (پاکستان) جاکر دیا۔ جہاں مجھے "نیاز فتحپوری ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ (دہلی) کے لیے ایک مقالہ بعنوان "ڈاکٹر یوسف حسین خاں بحیثیت ناقدِ اقبال" ۸۸ء میں لکھا، جو انسٹی ٹیوٹ کے اگلے مجلے میں شائع ہوگا۔ اترپردیش اردو اکاڈمی کے لیے نظیر اکبرآبادی کی نظموں کا انتخاب تیار کیا اور ساہتیہ اکاڈمی (دہلی) کے لیے محمد قلی قطب شاہ پر "ہندوستانی ادب کے معمار" سیریز کے لیے ایک مونوگراف تصنیف کیا۔ یہ دونوں زیر طبع ہیں

دسمبر ۸۴ء میں میں مرکزی وزارتِ تعلیم کے ایک ثقافتی وفد کے رکن کی حیثیت سے میں پاکستان گیا۔ اس وفد کے لیڈر کنور مہندر سنگھ بیدی تھے اور دیگر اراکین میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد،

پروفیسر حامدی کاشمیری، اور ڈاکٹر خلیق انجم تھے۔ ہماری پہلی منزل کراچی تھی جہاں ہوائی اڈے پر ہمارے استقبال کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی، جمیل الدین عالی صاحب، غلام ربانی آگرو صاحب (ڈائریکٹر پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز) ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور دیگر مشاہیر موجود تھے۔ یہاں کی ایک مجلس میں ہم نے ہندوستان میں اردو کی ترقی کے مختلف پہلوؤں پر پرچے پڑھے۔ پاکستان کے اردو لغت بورڈ کا معائنہ کیا اور روزنامہ 'جنگ' کے دفتر میں سوال و جواب کی ایک صحبت میں شرکت کی، اور اس کی طباعت کی جدید ٹیکنیک کو دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ کراچی کے چوٹی کے ہوٹل آوری ماڈرن میں سرکار کی جانب سے ہمارا قیام تھا۔ ہوٹل میں مشروبات تلخ' مسلمانوں کے لیے ممنوع تھے۔ اس لیے ان سے استفادہ کنور صاحب، نارنگ صاحب، اور جگن ناتھ آزاد صاحب نے خوب اٹھایا۔ ان کے طفیل میں کچھ پاکستانی شعرا و ادبا بھی غیر قانونی طور پر مستفید ہوتے رہے۔ ہم مُسلین، ترسا کیے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ نقل کے لیے جو بھنے ہوئے بادام ہر کمرے میں رکھے رہتے تھے، میرے پڑوسی جگن ناتھ آزاد نے اپنی بڑھتی ہوئی ضرورت کے پیش نظر میرے کمرے سے غائب کرنا شروع کر دیے۔ ایک دن میں ان کے کمرے میں گیا اور اپنا 'نقل' یہ کہہ کر طلب کیا میں نقل اور مے دونوں سے محروم ہونا نہیں چاہتا ورنہ بددعا دوں گا۔ معلوم نہیں کہ یہ دھمکی کن لمحات میں دی تھی کہ دوسرے دن سے آزاد صاحب کے اسہال شروع ہو گئے اب ان کے بھی نُقل میں نقل کرتا تھا!

کراچی ہی کے دورانِ قیام ہمیں دن بھر کے لیے ہوائی جہاز سے موہن جوڈارو لے جایا گیا۔ اس کو نہ دیکھنا اپنے ورثے کے قدیم سرمائے سے محروم رہ جانا ہے۔ چنانچہ پاکستان کی ادبی اکیڈمی کے ڈائریکٹر آگرو صاحب کی رہبری، اور ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ کی معیت میں ہم نے 'وادی سندھ' کے قدیم ترین آثار کو بالتفصیل دیکھا۔ یہاں شہری مدنیت کے تمام آثار موجود تھے۔

کشادہ سڑکیں، مکانات، غسل خانے، عبادت گاہیں غرض کہ ایک ترقی یافتہ تمدن کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ جب ہم ایک عبادت گاہ کے آثار کو بغور دیکھ رہے تھے تو ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے نہایت معصوم سا سوال اپنے رہبر سے کیا "کیا یہاں کسی مسجد کے آثار نہیں ہیں؟!!"

دوپہر تک قیام گاہ پر واپس آئے تو تھک کر چور تھے۔ وہاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پُرتکلف مگر قصباتی انداز کے کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد سندھی موسیقاروں نے کچھ دیر نوازا۔ اس کے بعد وفد کے ہر رکن کو ایک ایک سندھی شال کا تحفہ پیش کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سندھ کی رسم قدیم ہے۔ جب چلنے لگے تو سندھی ہندو نوجوانوں اور لڑکیوں کا ایک گروہ ہم سے ملنے آیا۔ زور سے السلامُ علیکم کہا لیکن ماتھے کی بندیوں سے شناخت ہوگئی۔ جگن ناتھ آزاد نے بےتابانہ انداز میں بڑھ کر ان سے کچھ پوچھ گچھ کی اور واپس آکر ہمیں بتایا کہ یہ لوگ کئی لاکھ کی تعداد میں سندھ میں موجود ہیں اور حکومت کے رویّے سے مطمئن ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں "جس طرح مسلمان ہندوستان میں!"

کراچی سے ہم اُڑ کر اسلام آباد پہنچے۔ اس نئے شہر کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا لیکن اب تک دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ واقعتاً نہایت دلکش مقام پر بسایا گیا ہے، پس منظر میں مری کی پہاڑیاں ہیں۔ کچھ دہرہ دون کا سا انداز پایا۔ گرمی کے موسم میں چند میل کے فاصلے پر مری پہاڑ پر چلے جائیے اور قدیم انداز کی شہریت سے دلچسپی رکھتے ہوں تو راول پنڈی اُتر آئیے۔ ابھی یہ شہر عالمِ کُن فیکون میں ہے۔ صدر کا محل اور جامع مسجد زیرِ تعمیر تھیں لیکن سڑکیں، مکانات، بازار، ہوٹل اور دفاتر بن چکے تھے۔ نئی دہلی کی طرح وسیع وعریض ہے۔ اس لیے متوسط طبقے کے لیے ذرائع آمد ورفت کا مسئلہ رہتا ہے۔ یہاں ہمیں کئی استقبالیے دیے گئے جس میں "مقتدرہ" کا سب سے دلچسپ تھا۔ اس کے سربراہ اردو کے مشہور مزاح نگار شفیق الرحمٰن تھے

وہ بنیادی طور پر فوجی تھے اور سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد فوجی مقتدرین نے ان کے سپرد مقتدرہ کر دیا تھا۔ لیکن اس کی علمی سرگرمیوں کی تمام تر ذمہ داری ڈاکٹر وحید قریشی کی تھی جو اس وقت اس کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

اسلام آباد میں ہمارے پروگرام میں صدر پاکستان سے ملاقات کرنا بھی شامل تھی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ہمارے اعزاز میں دعوت دینا چاہتے ہیں جس میں ادیبوں اور شاعروں کو لاہور اور کراچی تک سے بلایا گیا ہے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ایران کے اعلیٰ عہدیدار اپنے تام جھام کے ساتھ آ گئے۔ صدر پاکستان کی تمام تر توجہ ان کی جانب ہو گئی۔ لہٰذا طے پایا کہ چونکہ لاہور بھی ہمارے پروگرام میں تھا، پہلے وہاں ہو آئیں۔ اس کے بعد ایک دن کے لیۓ صدر پاکستان کی دعوت کھانے راولپنڈی لوٹ آئیں۔ لاہور میں ادیبوں کا جم غفیر زیادہ پایا۔ الحمرا میں پرچہ خوانی، تھی لیکن بجلی فیل ہو جانے کی وجہ سے ہال کے بجائے باہر انتظام کیا گیا پچھلی قطاروں تک آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے نہ مقالہ نگار کو مزا آیا اور نہ سامعین کو۔ اس لیۓ لاہور کا سفر علامہ اقبال کے مزار پر فاتحہ خوانی اور میل ملاقات تک محدود رہا۔ ہم اس سے قبل کراچی میں قائدِ اعظم کے مزار پر حاضری دے آئے تھے۔ اس کو ہر اعتبار سے جاہ و جلال کا مظہر پایا۔ علامہ اقبال کا مزار چوں کہ شاہی مسجد کے دامن میں ہے اس لیۓ یہ نہ صرف مختصر ہے بلکہ غیر نمایاں بھی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مسجد کے زیر سایہ خرابات کی گنجائش ہے کسی مزار کی ہرگز نہیں۔ یقین نہ آئے تو اقبال اور مولانا آزاد کے مزاروں کا دیکھ لیجیۓ، دونوں شاہی مسجدوں کے جاہ و جلال میں غرق ہیں!

اسلام آباد کے سفر میں مجھے ایک نیا احساس ہوا (جس کی بعد کو شہادت ہمارے سفیر سنگھ صاحب نے دی)، وہ یہ کہ پاکستان میں فوجی حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد تر ازوۓ سیاست میں مفکرِ اسلام علامہ اقبال کا پلّا بھاری اور

قائدِاعظم محمد علی جناح کا پلّا ہلکا ہوتا جارہا ہے۔ جناح صاحب سے عقیدت اور ان کی مقبولیت اب کراچی تک محدود ہے جب کہ اقبال پاکستان کی پوری فضا پر چھاتے جارہے ہیں۔ پاکستانی ٹیلی ویژن پر دونوں کی تصویریں ان کے اقوال اور اشعار کے ساتھ دکھائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کسی سیاست داں کا قول اقبال کے شعر کی 'براقی' کو کہاں پہنچ سکتا ہے۔ اقبال کو یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ اس کی فکر پاکستان کو ایک اسلامی اساس بخشتی ہے جب کہ قائدِاعظم کی اسلامی اساس ہی بہت کمزور تھی۔ ہرچند اقبال نے آخری ایّام میں انھیں اپنا قائد کہا ہے لیکن اب سارا پاکستان اقبال کو اپنا قائد سمجھتا ہے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کو جو مقام دیا جارہا ہے وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔ پاکستان کسی نہ کسی معنوں میں "اسی مفکرِ اسلام کی امنگوں آرزوؤں، امیدوں اور جستجوؤں" کا عکس ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہندی مسلمانوں کے لیے ان کی سیاسی فکر کی اب کوئی معنویت نہیں رہی ہے۔

دوسرے دن لاہور سے پھر اسلام آباد پہنچے، صدرِ پاکستان کی ضیافت کھانے کے لیے۔ اسلام آباد سے شام کو موٹروں میں راول پنڈی جانا تھا جہاں صدر پاکستان کی قیام گاہ تھی۔ اس وقت کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب سے ایک لطیفہ سرزد ہوگیا۔ جب ہوٹل کے صدر دروازے پر سب جمع ہو گئے اور روانہ ہونے ہی والے تھے کہ کنور صاحب نے مجھے کوئی کام یاد دلایا جس کے لیے مجھے اوپر کی منزل پر اپنے کمرے جانا ضروری ہو گیا۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرا انتظار کریں گے۔ چند منٹ بعد جب میں واپس آیا تو قافلے کے سارے ساتھی جا چکے تھے۔ مجھے بعد کو ٹیکسی سے راول پنڈی جانا پڑا۔

صدر پاکستان کی ضیافت ان کی رہائش گاہ کے بڑے ہال میں تھی۔ ان کی تواضع و مدارات کے بارے میں جو سن رکھا تھا، ویسا ہی پایا۔ چہرے پر مستقل خندۂ دنداں نما تھا، گرم جوشی اور گرم اختلاطی۔ مجھے ان کے خاص گول میز پر بیگم ثاقبہ رحیم الدّین اور جنرل رحیم الدّین کے درمیان جگہ دی گئی۔ یہ دونوں میرے

صلبی رشتے سے عزیز ہیں اور جنرل ضیاء الحق کے نسبتی رشتے سے۔ ضیافت کے بعد دونوں جانب سے منتخب حضرات نے اپنا کلام سنایا۔ میں نے وہ غزل سنائی جو ۵۸ء میں امریکہ میں لکھی تھی لیکن بعض اشعار حسب حال تھے۔

ترے دیار میں کوئی بھی ہم زباں نہ ملا
ہزار نقش ملے، کوئی راز داں نہ ملا
میں سوچتا ہوں کہ یہ بھی حسین ہیں لیکن
تصوّرِ رُخِ جاناں کا امتحاں نہ ملا
کسے سنائیں غزل بہرِ شرحِ دل مسعودؔ
کہ اس دیار میں کوئی بھی نکتہ داں نہ ملا

غزل پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کا پس منظر بیان کر دینا چاہیئے تھا تاکہ پاکستانی میزبانوں کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ لیکن موقع ہاتھ سے نکل گیا اور اب ہم رخصت ہو رہے تھے۔ میں نے جنرل ضیاء سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "آپ کے بارے میں جو سُنا تھا ویسا ہی پایا۔" کہنے لگے "اس بار آپ آئیں گے تو ہمارے مہمان ہوں گے"۔

دوسرے روز لاہور کے ہوائی اڈے پر پھر پہنچے۔ اب سوئے وطن رواں تھے۔ یہاں جگن ناتھ آزاد نے، جن کے میرے درمیان پاکستان کے سارے سفر میں مزاح المومنین قسم کی نوک جھونک ہوتی رہی، یہ تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ریل سے سفر کیا جائے، میں نے کہا جی ہاں، مجھے اس سے اتفاق ہے اس لیئے کہ میں پنجاب کے طول و عرض سے نہایت اطمینان سے گزر جاؤں گا لیکن آپ کا 'جگن ناتھ' امرت سر ہی میں رہ جائے گا البتہ 'آزاد' دلی پہنچ جائے گا۔

راول پنڈی کے قیام میں ہم ننکانہ صاحب بھی گئے، جہاں پنجاہ صاحب گوردوارہ ہے۔ یہاں ایک پہاڑی چشمہ بہتا ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ باباگرو نانک نے پتھر پر اپنا پنجہ لگا کر دھارے کو روک دیا تھا۔

دھارے کے منہ پر جو پتھر ہے اس پر انسانی پنجے کا نشان اب تک نمایاں ہے۔ میں اس کرامت سے تو زیادہ متاثر نہیں ہوا لیکن جس خاموش تنہائی میں گوردوارہ اپنا تماشائی بنا ہوا تھا اسے دیکھ کر افسوس ضرور ہوا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے چوکھٹ پر ماتھا ٹیکا اور دس روپے نذر کئے۔ جگن ناتھ آزاد صاحب نے ماتھا تو نہیں ٹیکا لیکن پانچ روپے نذرانے کے دیئے۔ وہاں بند دروازے کے علاوہ کوئی نذر لینے والا تک نہیں تھا۔ وہاں سے لوٹے تو میں گرونانک کی عظمت کے بارے میں سوچتا رہا۔ مہاتما گوتم بُدھ کے بعد ہندوستان کی تاریخ کی اگر کوئی غیر مسلم شخصیت مجھے متاثر کرتی ہے تو وہ گرونانک کی ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے کس عقیدت سے انھیں یاد کیا ہے ؎

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو "واہ گرو!"

وہاں سے لوٹتے وقت میں نے اقبال کے عقیدت مند اور اپنے دوست جگن ناتھ آزاد سے عجیب و غریب سوال کیا اور وہ اس سیاق میں کہ انھوں نے کہا جب مجھے کوئی 'شری' کہتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی گالی دے رہا ہو۔ میں نے کہا تلوک چند محروم کے صاحبزادے، عیسیٰ خیل کے باشندے آپ کی تو رگ و پے میں اقبال سرایت کئے ہوئے ہے۔ یہ مجھے بتایئے کہ آپ اقبال کے اس قسم کے کلام کو کس طرح انگیز کرتے ہیں:

خودی کا سرِّ نہاں لاالٰہ الّا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لاالٰہ الّا اللہ
یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لاالٰہ الّا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لاالٰہ الّا اللہ

عملی مسلمان نہ ہونے کے باوجود، میرے وجود میں یہ اشعار ایک برق سی دوڑا دیتے ہیں۔ آپ اس 'برہمن زادہ' کی وجدانی اسلامیت سے یکسر کیوں نکلتے ہیں۔ اگر آپ اقبال کے اس قسم کے کلام کو من میں ڈوب کر محسوس کرتے ہیں تو آپ کو اب تک مشرف بہ اسلام ہونے سے کس چیز نے مانع رکھا ہے۔ گہرے سوچ میں پڑ گئے میں نے اپنے سوال کے نشتر کو اور زیادہ گہرا نہیں چبھویا۔

میں نے موجودہ زمانے میں خُلقیۂ اسلامی سے قریب جن چند ہندو بزرگوں اور دوستوں کو پایا ہے ان میں پنڈت آنند نرائن مُلّا، جناب مالک رام صاحب، جگن ناتھ آزاد صاحب، اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ اور ڈاکٹر گیان چند جین، اردو کے بڑے محقق ہونے کے باوجود میری اس فہرست سے خارج ہیں۔ لیکن مجھے آج مسلمانوں میں ایک بھی صاحبِ قلم ایسا نظر نہیں آتا جو ہندو خُلقیہ میں رچ بس گیا ہو!

۸۶ء میں مَیں اپنی آخری گھریلو ذمہ داریوں سے فارغ ہو گیا، یعنی شاہدہ اور زیبا کی شادیاں کر ڈالیں۔ چھوٹی بیٹی زیبا کی شادی جنوری ۸۶ء میں عبدالحق خاں صاحب سابق پرنسپل ٹیچرز ٹریننگ کالج کے چھوٹے صاحبزادے محمد عمران خاں سلمہٗ سے ہوئی، جو جامعہ ملیہ کے انجینئرنگ کالج میں لکچرر ہیں۔ اور شاہدہ کی شادی چھ ماہ کی تاخیر سے جولائی ۸۶ء کو اپنے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر شارق عالم آفریدی سے ہوئی جن سے اس کی نسبت عرصے سے طے تھی۔ برات کراچی سے آئی تھی۔ شارق فی الحال امریکہ میں ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری کے لیے کام کر رہے ہیں اور شاہدہ بھی ان کے ساتھ وہیں مقیم ہے۔ زیبا نے باٹنی میں ایم۔ اے۔ فرسٹ کلاس کیا تھا۔ شاہدہ نے میری تحریک پر ایم اے۔ لسانیات میں داخلہ لیا اور اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد ایم۔ فل۔ کیا جس میں اس نے "قائم گنج کے پٹھانوں کی لسانی خصوصیات" پر مختصر سا مقالہ لکھا۔ یہ بعض لحاظ سے ایک منفرد تالیف تھی جسے آئندہ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے پھیلایا جا سکتا تھا۔ لیکن شادی کے بعد اس کی

ساری ریسرچ دھری رہ گئی۔ ہندوستانی لڑکیوں کا یہی اَلمیّہ ہوتا ہے کہ اچھی طالبات بھی بعض اوقات گھر گرہستی میں پھنس کر رہ جاتی ہیں۔ میری ایک پُرانی خواہش یہ تھی کہ میری چاروں لڑکیوں میں سے کوئی نہ کوئی اپنے لیے تعلیمی کیریئر اختیار کرے۔ ان سب کا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت اچھا رہا ہے لیکن غالباً اپنی والدہ کی تربیت کے زیرِ اثر ان سب نے گھریلو زندگی کو ملازمت پر ترجیح دی۔ بہر حال ان کی خوشی میں میری خوشی ہے۔ اب جو چاروں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں تو گھر خالی ہو چکا ہے۔ صرف لَم یَلِدْ کی تثلیث رہ گئی ہے: میں (۶۹ سال)، میری بیوی (۵۸ سال)، اور میرا ناکتخدا بیٹا، جاوید حسین (۳۸ سال)۔

سترھواں باب

"شادم از زندگیٔ خویش ....."

میں اب عمر کی سترؔ ویں سال کی چوٹی پر کھڑا ہوں۔ ۲۸ر جنوری ۱۹۸۹ء کو امید ہے، اسے سرؔ کر لوں گا۔ یتیمی کے بچپن سے لے کر شادمانی کے اس دور تک جب میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو خود کو مطمئن پاتا ہوں۔ ہر چند ماں باپ کی بے وقت موت کی وجہ سے میں ان کی محبّت اور شفقت سے محروم رہا۔ زندگی کے بعض موڑوں پر مجھے ان کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا اور اس وقت بے بسی کے عالم میں میری آنکھوں آنسو چھلک اٹھتے۔ لیکن چوں کہ میرے حافظے میں ان کا کوئی مادّی نقش محفوظ نہیں تھا، اس لیے اس کیفیت پر بہت جلد قابو پا لیتا، اور اس کے ساتھ یہ احساس قوی تر ہو جاتا کہ مجھے اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا ہے۔ مجھے میری ننھیال کے مشترکہ خاندان نے زندگی کی بہت سی تلخیوں سے بچا لیا۔ اسی لیے میں ایسے خاندان کی برکتوں کا قائل رہا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے ضروریاتِ زندگی کے سلسلے میں وہ فراخ دستی حاصل نہیں رہی جو مجھے ہوتی اگر والدین کی شفقت کا سایہ نصیب رہتا لیکن میں اِس اعتبار سے خوش قسمت رہا کہ مجھے ایک محبت اور خدمت کرنے والی رفیقۂ حیات ملی، جس نے "ممتا" کی کمی کو بہت کچھ دل سے بھلا دیا۔ وہ مجھ سے عمر میں ۱۲ برس چھوٹی تھی، جب ۱۹۴۸ء میں وہ میرے گھر میں دُلہن بن کر آئی تو اس وقت سترہ برس

کی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ آتے ہی اس پر خانہ داری کا بوجھ پڑ گیا۔ اپنی والدہ کی تربیت کی وجہ سے وہ اِس پُر آشوب دور سے خوش اسلوبی سے گزری۔ کم عمری کی وجہ سے اس سے کبھی کبھی کوتاہیاں ہو جاتی تھیں۔ میں بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر برافروختہ ہو جاتا۔ غصّے سے زیادہ ضد ہوتی۔ لیکن داد دیتا ہوں اس وفا کی دیوی کے صبر و تحمّل کی، وہ ہر بار یہی کہتی کہ میری ماں نے رخصت کرتے وقت نصیحت کی تھی کہ بیٹی! جس گھر میں جا رہی ہو کیسے ہی نامساعد حالات کیوں نہ ہوں وہاں سے چار کے کاندھوں ہی پر نکلنا۔ اس مہر و وفا کی دیوی کے صبر و تحمل نے بالآخر کام کیا اور یہ کندۂ ناتراش پٹھان بچّہ رفتہ رفتہ رام ہوتا گیا۔ نجمہ کا کہنا ہے کہ عین غیظ کے عالم میں بھی اس کے اس اعتماد میں کبھی کمی نہیں آئی کہ میں اُسے دل سے چاہتا ہوں، اس لیۓ انتظار کرتی رہی کہ اِس وحشئ رمیدہ پر کبھی تو فتح حاصل ہو گی۔ عمر کے ساتھ ساتھ ہم دونوں کی محبت، رفاقت سے مل کر دو آتشہ ہو گئی۔ اب من تو شدم تو من شدی کا مقام ہے۔ وہ یقیناً میری نصف بہتر ہے اور میں اس کا نصف کم تر۔

اب جو اپنی نالائقیوں کا خیال آتا ہے تو وہ منظر سامنے آجاتے ہیں جب میں اسے سرزنش کرتا تو اس کے گلابی رخسار آنسوؤں سے تر ہو جاتے۔ میں بہت جلد اپنی حرکت پر نادم ہو جاتا اور وہ نہایت فیاضی سے مجھے معاف کر کے زندگی کا سرا وہیں سے اُٹھا لیتی جہاں اُسے چھوڑا تھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ تجدیدِ محبّت کا یہ عمل اگر بار بار نہ ہوتا تو شاید بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ یہ بھی نہ بڑھتی۔ چوں کہ وہ میری بیوی ہی نہیں میرا انتخاب بھی تھی اور یہ انتخاب مشترک خاندان کے اس ماحول میں ہوا تھا جس کی عکاسی حسرت کی غزلوں میں ملتی ہے۔ اس لیے میں اپنی واردات کے اظہار کے لیۓ یہاں سے حسرت کے حسن کارانہ الفاظ کا سہارا لیتا ہوں:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

با ہزاراں اضطراب وصد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو ازراہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں مجھ کو بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ رازونیاز
اپنا جانا یاد ہے، تیرا بلانا یاد ہے
دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے
چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ
مدّتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

"گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" کا تطابق جو میری اور حسرت کی عشقیہ واردات کے درمیان ملتا ہے، مجھے اپنا "سرِّ دلبراں" بیان کرنے کی زحمت اور رسوائی دونوں سے فارغ کر دیتا ہے۔

نجمہ نے مجھے پانچ تندرست، خوبصورت اور ذہین بچوں کا باپ بنایا۔ میری چاروں لڑکیاں — فریدہ، نادرہ، شاہدہ اور زیبا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں، جہاں وہ خوش اور مطمئن ہیں۔ میں اب پانچ بچوں کا نانا بن چکا ہوں۔ گرما کی تعطیلات

میں جب ان کے آمد سے گھر بھر جاتا ہے تو مجھے اپنے بچوں کے بچپن کا سماں یاد آجاتا ہے۔ اور دن بھر کی کلفت کو فت ختم ہو جاتی ہے۔

نجمہ بڑی گہری ممتا کی مالک ہیں۔ انھوں نے اپنی بچیوں کو اس کا بہرۂ وافر دیا ہے۔ ان کی چاروں بچیاں اپنی ماں پر جان دیتی ہیں۔ جس پر اکثر مجھے رشک آتا ہے۔ میری جانب ان کی محبت، خدمت اور خیال کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

اپنے لڑکے جاوید حسین کی جانب سے۔ جواب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انجینرنگ میں فزکس کا پروفیسر ہے۔ البتہ ہم دونوں فکر مند رہتے ہیں۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ ہندوستان اور امریکہ دونوں جگہ شاندار رہا ہے۔ اسی بنا پر اُسے پہلے ایک امریکن یونیورسٹی اور اس کے بعد ظہران کی یونیورسٹی آف پٹرولیم اینڈ منرلز (USA) میں کولمبیا یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کرنے کے فوراً بعد ملازمت مل گئی۔ اپنے تحقیقی کام اور تعلیمی تجربے کی بنا پر وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۴۵ سال کی عمر میں پروفیسری کے اعلیٰ عہدے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک سعادت مند بیٹا ہے لیکن اپنی دنیا میں اس قدر مست رہتا ہے کہ نہ اُسے اہلِ خاندان کا خیال ہے اور نہ سماجی رشتوں کا۔ اس تنہائی پسندی نے اس کے ذہن سے گھر بسانے کا خیال بالکل نکال دیا ہے۔ مجھے بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ سوائے کتاب کے اسے کسی کی رفاقت عزیز نہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ (اب وہ ۴۸ برس کا ہو چکا ہے) نہ صرف وہ ہمارے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی ع

سعدیؔ از دستِ خویشتن فریاد

ہم اس کے ماضی سے مطمئن رہے ہیں، حال بھی ایسا بے حال نہیں لیکن مستقبل میں اس پر کیا گزرے گی؟ اس کے لیے دونوں متوحش اور مشوش رہتے ہیں۔

جب میں اپنی گذری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ایک خاص قسم کی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے سب سے بڑی خوشی اس بات سے ہوتی ہے

کہ خود کو دوسروں اور اپنی نظر میں باوقار پاتا ہوں۔ میں روایتی قسم کا مذہبی انسان نہیں ہوں تاہم مخصوص قسم کی سرّیت کا قائل ہوں اور وہ حضرات جو ان گزرگاہوں کے راہ رو رہے ہیں ان سے عقیدت رکھتا ہوں۔ زندگی میں میرا عمومی رویّہ عقلیت پسندی کا ہے لیکن سینے میں ایک دلِ گداختہ رکھتا ہوں۔ سیاست کو اجتماعی زندگی کی ناگزیر ضرورت سمجھتے ہوئے مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہوں اس لیے کہ اس میدان میں جواہرلال جیسے انسان کم نظر آتے ہیں۔ میری نظر میں اہل علم و ہنر زیادہ لائقِ تعظیم ہیں اسی لیے میر، غالب، اقبال اور ٹیگور جیسی ہستیوں کو دل سے عزیز رکھتا ہوں۔

عزتِ نفس مجھے ورثہ میں ملی ہے۔ یہی میری طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ میں نہ کسی کی توہین کرنا چاہتا ہوں اور نہ توہین برداشت کرتا ہوں۔ عام طور پر صلح کل میرا مسلک ہے لیکن جب خودی اور خود داری پر چوٹ پڑتی ہے تو اس کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دینے پر تیار رہتا ہوں۔ میں عام طور پر دوست داری کا رویّہ رکھتا ہوں لیکن نامعقولوں سے انتہائی درجے کی سرد مہری بھی دکھا سکتا ہوں۔ میری بڑی بیٹی فریدہ کو میرا یہ قول بہت پسند ہے کہ جب میں کسی کو پسند نہیں کرتا تو اس کے وجود تک کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہوں اور ہندوستان کی ستّر کروڑ کی آبادی کے ہجوم میں پھینک کر اس کی جانب سے مکمل طور پر غافل ہو جاتا ہوں۔ ایسا شخص کبھی سامنے آ بھی جاتا ہے تو میں اُسے نہیں پہچانتا۔ اسے دیکھ کر مجھے غصّہ بھی نہیں آتا اس لیے کہ یہ بھی اثباتِ وجود کی ایک علامت ہو گی۔

انسانی تعلقات میں میں ذکی الحس اور زود رنج واقع ہوا ہوں لیکن اسی وقت جب کسی کے قول و فعل سے مجھے تکلیف پہنچی ہو۔ بنیادی طور پر میں جلوت کا نہیں خلوت کا آدمی ہوں۔ اس لیے زندگی میں میرے دوستوں کا حلقہ ہمیشہ محدود و مخصوص رہا۔ میں کسی دوست کو اپنی نسبت سے احساسِ برتری کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ میرے لیے سب دوستوں کے 'قد' برابر ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اگر

وہ کسی لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے تو میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ جہاں کسی دوست نے آنکھیں بدلیں میں نے راہیں بدل لیں۔ دوست داری کے مسلک کے سلسلے میں مجھے رحیم خان خانان کا یہ دوہا بہت پسند رہا ہے:

رحمن دھاگا پریم کا مت توڑ و جھٹکائے
ٹوٹے پاچھے پھر نہ ملے ملے گانٹھ پڑ جائے

اسی لیے ساری عمر میرا سفر ہجوم سے تنہائی کی طرف رہا ہے۔ میں تنہائی سے مطلق نہیں گھبراتا اس لیے کہ خود سے نہیں گھبراتا۔ البتہ اس دن کے تصور سے بھی کانپ اٹھتا ہوں جب 'مونسِ تنہائی' کی رفاقت سے محروم ہو جاؤں گا۔

میں عام طور پر پابندیٔ اوقات سے کام کرتا ہوں لیکن بعض دنوں میں میرے معمولات میں کوئی نظم و ضبط نہیں رہتا۔ یہی صورت جسمانی ورزش کی ہے، جس میں مجھے صبح و شام ٹہلنا سب سے زیادہ پسند ہے۔ دہلی جیسے بڑے شہروں میں میرا سب سے محبوب مشغلہ 'دکان بینی' رہا ہے۔ اس مشغلے میں گھنٹے گزار سکتا ہوں۔ میری اس عادت پر میرے دوست ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک بار کہا تھا "آپ کو کناٹ پلس سے خریداری کرنے کا بہت شوق معلوم ہوتا ہے حالاں کہ وہ سب سے مہنگا بازار ہے" انھیں کیا معلوم ہے کہ کناٹ پلس سے صرف کتابیں خریدتا ہوں جن کی قیمت ہر جگہ یکساں ہوتی ہے۔ باقی دید ہی دید ہے خرید کچھ بھی نہیں۔ روپے پیسے کی جانب سے لاپرواہ رہا ہوں یعنی کوئی 'گوں' کی چیز مل جاتی ہے تو پھر "مانع دشت نوردی کوئی 'زنجیر' نہیں ہوتی۔ پیسہ کو میں نے ہمیشہ خرچ کرنے کی چیز سمجھا لیکن اسی قدر کہ قرض لینے کی نوبت نہ آئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے آج تک نہ کسی سے قرض نہیں لیا اور نہ دیا۔ کبھی دینا پڑا تو اس کو شمار نہ کیا۔ روپے پیسے کے سلسلے میں مجھے عرفی کا یہ مشہور مصرع بہت پسند ہے ؏

ہر چہ باشی باش عرفی اندکے زردار باش

یہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ میں کسی منظم مذہب کا پابند نہیں ہوں سبب

مذاہب کو تاریخ کی رو کا آوردہ سمجھتا ہوں، جو اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں اور فرسودہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے احیاء کا دور شروع ہوتا ہے، دوسرے الفاظ ان کے خرقۂ کہنہ میں نئی فکر کے پیوند لگنا شروع ہو جاتے ہیں، لیکن ایک جگہ سے پیوند لگتا ہے تو دوسری جگہ سے مسک جاتا ہے۔ سب مذاہب میں کچھ دیرپا اقدار ہوتی ہیں جو اخلاقی اور معاشرتی قدروں کی شکل میں زندہ رہتی ہیں۔ لیکن ان اقدار کو بھی اضافی سمجھنا چاہیئے اس لیئے کہ ہر لحظہ بدلتی ہوئی دنیا میں اقدارِ مطلقہ قسم کی کوئی چیز قائم بالذات نہیں ہوتی۔ ان کا مقام تو اعیانِ نامشہود میں ہو سکتا ہے۔

میں تاریخِ انسانی کو ہمیشہ معاشی محرکات کے تابع نہیں سمجھتا۔ ہر شخص اپنی زندگی میں تجربہ کر سکتا ہے کہ اس کا ہر عمل معاشی دباؤ پر سرزد نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن جسم و جان کا ایک عجیب و غریب مرکّب ہے جس کی پُر پیچ راہوں میں وہ اقدارِ عالیہ پیدا ہوتی ہیں جو آدمی کو انسان بناتی ہیں۔ اسی طرح فنونِ لطیفہ اور ان کا تصورات ہمیشہ معاشیات کے تابع نہیں ہوتے۔

میں چوکھٹوں اور سانچوں کی فکر کا قائل نہیں ہوں چاہے وہ سیاسی ہو یا معاشی یا مذہبی۔ یہ انتہائی شکل میں 'عقیدہ' کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور عقیدہ منافیٔ عقل ہوتا ہے۔ میں چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کا انفرادی حق سے کبھی بھی دستبردار ہونا نہیں چاہتا۔ انسانی سماج کے لیئے اشتراک بہت اچھی قدر ہے لیکن اشتراکیت کی جن شکلوں میں یہ رونما ہوا ہے، اس سے تشویش پیدا ہوتی ہے 'زر، زن اور زمین' کی اشتراکیت سے مسائل کم ہونے کے بجائے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ 'زن' کے اشتراک پر تو اب تک کیمونسٹ روس تک عمل پیرا نہیں ہو سکا ہے۔

ستّر برس کی عمر ہو جانے پر بھی میں ابھی زندگی سے تھکا نہیں ہوں۔ ع

میری پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

ابھی تک میرے دل و دماغ چاق و چوبند ہیں اور مجھے کسی قسم کا جسمانی عارضہ لاحق نہیں ہوا ہے۔ خون میں شکر کی زیادتی ہو جاتی ہے جسے میں غذا میں احتیاط کر کے قابو میں رکھتا

ہوں۔ مجھ میں ابھی تک حوصلۂ قلم ورقم باقی ہے۔ بلکہ یہ کہوں کہ زورِ قلم زیادہ ہو گیا ہے تو غلط نہیں ہو گا۔ علمی کاموں کے کچھ منصوبے رہ گئے تھے جن کی سمیٹا سمیٹی میں لگا ہوا ہوں۔ البتہ شاعری اب دور کی آواز ہو گئی ہے اور یہ تمنا دل کی دل میں رہ گئی کہ کاش میں اپنے خونِ جگر سے کچھ اور شعری پیکر تراش سکتا! بعض اوقات اپنا کلام دیکھتا ہوں تو ایک اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ میں نے کیوں کر کہا؟ اگر مجھے زندگی دوبارہ عطا ہو تو نجمہ کے ساتھ شعر کی دیوی کا پھر خواہش مند رہوں گا۔

بچوں کی جانب سے اطمینان ہے لیکن میری بیوی بیمار رہنے لگی ہیں۔ خون کا دباؤ ہے، ذیابیطس کی بھی شکایت ہے اور سب سے تکلیف دہ بات جوڑوں کا درد ہے۔ اب پتے میں کنکر پڑ گئے ہیں جس کے لیے آپریشن تجویز کیا گیا۔ یہ آپریشن چند ہفتے قبل خوش اسلوبی کے ساتھ ہو گیا۔ نجمہ آپریشن کے سلسلے میں ایک بہادر عورت ہیں۔ میں جس قدر جراحی سے گھبراتا ہوں وہ نہایت اطمینان کے ساتھ اسے قبول کر لیتی ہیں۔ کہتی ہیں میرا عقیدہ ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے، اس لیے اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس عمر میں مجھے ان کی رفاقت کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ وہ ابھی زندگی میں دیر تک میری ہم سفر رہیں۔ ہر چند وہ بار بار یہی خواہش کرتی ہیں کہ وہ اس دنیا سے سہاگن جائیں۔

مکینوں سے قطع نظر مجھے اپنے مکان سے بھی بہت محبت ہے۔ میں نے اس کا نام 'جاوید منزل' اپنے بیٹے کے نام پر رکھا تھا۔ اس کا دوسرا نام جو اس وقت میرے ذہن میں تھا، 'دُرُودِ مسعود' تھا۔ اب یہ اِس خود نوشت کا رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن اب یہ کلمۂ توصیفی نہیں کلمۂ اضافی ہے۔

چالیس سال کے ہمسفر



ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ کے جل گئے

جناب سید حامد
نئی دہلی

نئی تعلیمی پالیسی اور ہندوستانی مسلمان

جس طرح فرد کے لیے احتساب ضروری ہے اسی طرح جماعت کے لیے بھی۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ کام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اپنے سالانہ اجلاسوں میں کیا کرتی تھی، کانفرنس کے ہاتھوں سے زمامِ احتساب نکل گئی۔ اب کوئی جائزہ لینے والا نہیں رہا کہ ہندوستانی مسلمان کس حالت میں ہیں اور کس سمت جا رہے ہیں۔ دوسری طرف جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، آزادی کے بعد حکومتِ ہند نے مردم شماری کے تحت فرقہ وارانہ تعلیمی حالت کے اعداد و شمار شائع کرنا بند کر دیے۔ اس وقت یہ حال ہے کہ ہم اندھیرے میں ٹٹولتے رہتے ہیں کہ ہم کہاں پہنچ گئے، زوال کے کتنے مراحل ہم نے طے کر لیے اور کتنے ہنوز باقی ہیں، اور زوال کو روکنے کی کوئی تدبیر ہے بھی یا نہیں؟ ہم میں سے کچھ لوگ جنھوں نے مایوس ہونا نہیں سیکھا جلسے اور سیمینار کرتے رہتے ہیں جہاں مسلمانوں کی تعلیمی حالت زیرِ بحث آتی ہے۔ اس مہینے کے شروع میں بمبئی کی انجمنِ اسلام نے ایک سہ روزہ سیمینار بلایا تھا۔ وہاں اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا کہ ملک کے مسلم تعلیمی اداروں میں ربطِ باہم اور ان کے معیار کی ترقی اور مسلمانوں کے تعلیمی احتساب اور پیش رفت کے لیے ایک ملک گیر ادارہ کی ضرورت ہے جس کا کام وفاق، نگرانی، نصاب کی تشکیل، معائنہ، منصوبہ سازی اور اشاعتِ علم ہونا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ایسے ادارہ کی ضرورت پر غور اور ضرورت کے احساس کو عام کریں تاکہ اس کی تاسیس کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔ ضرورت دراصل صرف تعلیمی اداروں کو وفاق کی لڑی میں پرونے کی نہیں ہے، بلکہ ان انجمنوں کی شیرازہ بندی بھی لازمی ہے جو

مقامی سطح پر اپنی بساط کے مطابق مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت کے لیے کام کر رہی ہیں۔ ایسی انجمنوں کی تعداد کافی نہیں لیکن کم بھی نہیں۔ آپ کے شہر بنارس میں اس کی ایک بہت اچھی مثال سرسید سوسائٹی ہے جس نے گزشتہ چار سال کے عرصے میں تعلیمی اور اصلاحی شعور کو عام کرنے کی کوشش کی ہے، جس نے ایک پرانے اسکول کو سہارا اور توصلہ دیا ہے اور ایک چھوٹا سا پبلک اسکول کھولا ہے۔ اس نے ایک بڑے اور اعلیٰ معیار کے پبلک اسکول کا منصوبہ بنایا ہے جس میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی جائے گی۔ یہ بات حیرت اور افسوس کی ہے کہ بنارس کے پُرحوصلہ اور دردمند باشندوں نے اتنے بڑے کارِ خیر کے لیے ابھی تک سات لاکھ روپے کی ابتدائی رقم کا بھی انتظام نہیں کیا جس سے اس اعلیٰ اسکول کے لیے زمین خریدی جا سکتی۔

اعداد و شمار مُیسّر نہ ہوں تو جائزوں، اشاریوں اور موٹے موٹے تاثرات سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ سب ہمیں بتاتے ہیں کہ ہندوستانی مُسلمان تعلیمی اعتبار سے ہندوستان کے سارے فرقوں سے پیچھے ہیں اور یہ فاصلہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ ملک کی زندگی اور اس کی پیش رفت میں اُن کا حصّہ بہت کم ہے۔ اور ملک نے ترقی کے جو قابلِ لحاظ مراحل طے کیے ہیں اُن کا فائدہ اُنھیں بہت کم پہنچا ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ فرقہ جو ملک کی زندگی میں اکثریت کا ہم قدم تھا، اس حیثیت کو پہنچ گیا جسے کیمپ فالوویا غُبارِ کارواں کہہ سکتے ہیں۔ ملک کے بٹوارے اور اس کے جلو میں ہونے والی خوں ریزی اور اُکھاڑ پچھاڑ نے اسے سراسیمہ کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا مُتوسط طبقہ، جس کے حصّہ میں رہنمائی اور پیش قدمی آئی ہے اور جسے ریڑھ کی ہڈی کا نام دیا جاتا ہے، مقصد، غرض یا دہشت کے تحت اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی نیّت، وفاداری، اور سلامتی صحیح ہوتے ہوتے مشکوک ہو گئی۔ اسے ایک ایسے جمہوری نظام کا سامنا کرنا پڑا جس میں اس کی حیثیت عضوِ ضعیف کی تھی اور جس کی حکمتِ عملی اور زیرکی اور چابک دستی سے وہ ناواقف تھا۔ کسی نے اس کو یہ نہیں بتایا (اور یہ اس کی قیادت کا قصور تھا) کہ جمہوریت میں نپٹنے کے لیے سب سے

بڑی ضرورت ایک باخبر اور متحدہ رائے عامّہ کی ہوتی ہے؛ اور جمہوریت میں نہ کوئی طبقہ حاکم ہوتا ہے نہ کوئی محکوم۔ اسے اس کی آہٹ بھی نہ ملی کہ انتخابات کے آلے کو ملک و ملّت دونوں کے مفاد کے لیے کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے ایوانِ اقتدار اور دفاتر میں ہر طرف اکثریت کے ہی افراد نظر آئے اور اس نے ان کی آنکھوں میں ہمدردی اور محبّت کے بجائے بے مہری اور کبھی کبھی عناد بھی دیکھا۔ اور ان لوگوں کے متعلق جو خود اس میں سے اُٹھے تھے اور جنھیں اسمبلی اور پارلیمنٹ کے لیے چُنا گیا تھا، اس کی رائے کبھی اچھی نہیں رہی کہ انھیں اس کی ترجمانی اور پیروی میں اپنی ذات اور اپنے منصوبوں کے لیے خطرات نظر آئے۔ دوسری طرف اکثریت اور حکومت نے یہ رُخ اختیار کیا کہ جو مسلمان مسلمانوں کا ذکر کرے، ان کی دشواریوں اور شکایتوں کو منظرِ عام پر لائے، یا ان کے ازالہ کے لیے فریاد کرے، اسے مُتعصب اور فرقہ پرست اور بنیاد پرست اور رجعت پسند اور وطن دشمن سمجھا اور کہا جائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ مسلمان صالح، مُتوازِن اور معتدل رہنمائی سے یکسر محروم ہو گئے۔ جن رہنماؤں پر متواتر انتہاپسندی کی تہمت لگائی گئی ان میں سے کچھ بہ درجۂ مجبوری اور بزنۂ ضد ویسے ہی بن گئے اور کچھ گھروں میں بیٹھ رہے؛ اور ان کے "روشن خیال" نمائندوں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ زبان جب کھولیں تو نیشنل انٹیگریشن اور نیشنل مین اسٹریم کی ستائش میں، اور حکومت کو یہ بتانے کے لیے کہ مسلمان مطمئن اور خوش ہیں اور جو غیر مطمئن ہیں ان کی وفاداری مشتبہ ہے۔

الغرض مسلمانوں نے جمہوریت کی پذیرائی دانش و بینش کے ساتھ نہیں کی۔ ان میں سے بعضوں کے تحت الشعور میں اقبالؔ کا یہ شعر گونجتا رہا:

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کاری شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

(جمہوری طریقے سے دور بھاگو اور کسی پختہ کار انسان کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ کیونکہ دو سو گدھوں کے دماغ ایک انسان کی فکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے)

وہ دو باتیں نظر انداز کر گئے : ۱۔ جمہوریت ہی جماعت کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ اور صالح اور مؤثر جمہوریت ہی سب سے بہتر نظامِ حکومت ہے اور انسانی تہذیب کا قافلہ اسی سمت میں سفر کرتا رہا ہے اور بتدریج اس منزل پر پہنچا ہے : ۲۔ ہندوستان نے ایک ایسی جمہوریت اختیار کی ہے جو آئین اور پالیسی کی رُو سے مذہب کی پابند نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جس طرح پاکستان نے اسلامی جمہوریت اختیار کی ہندوستان ہندو جمہوریت کا اعلان کر دیتا۔ اس وقت مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کی کیا حیثیت رہ جاتی؛ اس وقت وہ کھُل کر برابری اور انصاف کا مطالبہ بھی نہ کر سکتے۔

غالباً شاد عظیم آبادی کا شعر ہے:

یہ بزمِ مَے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

ہماری طرف سے کمی یہ رہی ہے کہ ہم نے کوتاہ دستی اور کوتاہ اندیشی کو اپنا شعار بنالیا اور اپنے جائز حقوق کی طرف سے غفلت برتی۔ یہاں یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہوگا کہ حقوق کی تصویر کا دوسرا رُخ فرائض ہیں۔ یہ اعتراض کرنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ ہم جو کچھ مانگتے وہ ہمیں مل ہی جاتا؛ لیکن کچھ نہ کچھ ضرور ملتا؛ کوئی جمہوریت دیر تک جائز مطالبات کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ تقاضا کرتے وقت لہجہ میں نرمی اور شائستگی ہونی چاہیے۔ لیکن انکسار نہیں۔ کیونکہ یہ سوال نہیں ہے، اپنے حق کی طلب ہے۔
ہماری بات کم ہی سُنی گئی جیسے سُنی جانی چاہیے تھی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ ہم نے وہ رائے عامہ بنائی ہی نہیں جمہوریت جس کا احترام کرتی ہے۔ ہم بددل ہو کر بیٹھ گئے۔ کُڑھنے، سُلگنے اور آہیں بھرنے لگے۔ اس احساس نے کہ ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے ہمارے حوصلے اور عمل کی طاقت اور آگے بڑھنے کی صلاحیت کو پست کر دیا۔ شکوہ سنجی مزاج بن جائے تو بات بنتی نہیں بگڑنے لگتی ہے شکایتیں وہی کرتے ہیں جو اپنے دُکھ کا مداوا خود نہیں کر سکتے، جن میں خود کو سنوارنے اور مضبوط

کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی ؛ جو نالۂ و فریاد اور نکتہ چینی کو عمل کا بدل سمجھ بیٹھتے ہیں۔

ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

ہمیں حکومت سے، اکثریت سے، دوسرے فرقوں سے شکایت بعد میں ہونی چاہیے، پہلے کوشش یہ کرنی چاہیے کہ اپنی ان کمیوں اور محرومیوں کو دور کریں جو خود ہماری وجہ سے ہیں۔ قدرت کا قانون یہ ہے کہ جس کسی نے بھی کمزوری پر قناعت کر لی موت نے اُسی آن اُسے آ دبوچا :

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ علم طاقت ہے۔ انسان طاقتور ڈنڈ بیٹھک سے نہیں ہوتا، علم سے ہوتا ہے اور ملک اور قومیں بھی اپنی آگہی کے بقدر طاقتور ہوتی ہیں۔ عربوں نے اوائلِ اسلام میں علم حاصل کیا اور دنیا کو تسخیر کر ڈالا ؛ عربوں نے موجودہ دور میں علم کو ترک کر دیا تو ایک چھوٹے سے ملک نے اُن کو زیر و زبر کر دیا، اُس بڑی دولت کے باوجود جو عربوں کے پاس تھی اور جسے زرِ سیال کہتے ہیں۔

اس تمام گفتگو سے نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوریت میں پامال نہ ہونے، اور فیضیاب ہونے اور پیش قدمی کرنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں : پہلی باخبر اور متحد رائے عامہ کی تشکیل و اشاعت : دوسری اس طاقت کا حصول جسے علم اپنے ساتھ لاتا ہے۔ غور کیجیے تو ایک تیسری بات بھی درکار ہوگی ؛ حکومت کے ایوان اور دفاتر میں ہماری قابلِ لحاظ موجودگی۔ اس کے لیے مقابلہ کے امتحانوں میں شرکت لازمی ہے۔ الغرض ان تینوں مقاصد کے حصول کا ذریعہ صرف ایک ہے، تحصیلِ علم۔ اس وقت سماں یہ ہے کہ ہم تعلیمی اعتبار سے درماندہ ہیں۔ بہت سے ماں باپ بچوں کو اسکول نہیں بھیجتے، انھیں بچپن سے گھریلو صنعتوں میں جھونک دیتے ہیں جس سے ان کے ذہن اور جسم کے نشو و نما پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ بعض ماں باپ شروع میں شوق سے اپنے بچوں کو ابتدائی اسکول میں داخل کر دیتے ہیں اور پہلی فرصت میں انھیں

اسکول سے اٹھا لیتے ہیں۔ تاکہ گھر کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے۔ سوچیے یہ کتنا بڑا جرم ہے جس کا ہم ارتکاب کرتے ہیں۔ ہماری آئندہ نسل اس وطیرہ سے تباہ ہو رہی ہے۔ ان چند باتوں میں جن میں ہم نے امتیاز حاصل کیا ہے بچوں سے اسکول چھڑا دینے یا ڈراپ آؤٹ کی شرح ہے۔ آئندہ نسلوں کی تباہی میں اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے ہماری غفلت نے اُسے پورا کر دیا۔ ہم ملک کی زندگی کے مختلف شعبوں میں برادرانِ وطن کے ساتھ مقابلہ کیوں نہیں کر پاتے؟ اس لیے کہ ہمیں گھر میں نہ تعلیمی ماحول ملتا ہے نہ تعلیمی مدد۔ ہماری تعلیم کی بنیاد کمزور رہ جاتی ہے اور جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو یہ کمزوری رنگ لاتی ہے، آنکھیں دکھاتی ہے، ہمارے اعتماد کو گھائل کر دیتی ہے: جہاں اعتماد گھائل ہوا صلاحیتیں کُند ہو جاتی ہیں۔ صلاحیت اپنے عروج پر جب ہی پہنچتی ہے جب حوصلہ ساتھ دیتا ہے۔ ایک دروازہ سے بنیادی کمزوری اور کلہ مندی داخل ہوتی ہے تو دوسرے دروازے سے حوصلہ باہر نکل جاتا ہے۔ ہماری اس کم حوصلگی اور کم علمی کی تحریر آپ کو ملک کی پیشانی پر لکھی ہوئی ملے گی۔ نہ اہلِ علم و فضل ہمارے یہاں نظر آئیں گے، نہ اہل اقتدار، نہ اہلِ امتیاز۔ تلاشِ صلاحیت (ٹیلنٹ سرچ) مقابلہ کے امتحانوں (ڈاکٹری، انجینیرنگ، آئی آئی ٹی، بزنیس مینجمنٹ کے انسٹی ٹیوٹ، کوئیز (عام باخبری کی آزمائش) کے نتیجے نکلتے ہیں تو ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ بڑی اور درمیانی صنعتوں میں ہمارا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو ملت جس پر چھوٹی بات اور چھوٹی سطح حرام تھی، اب چھوٹے پن کے طلسم میں گرفتار ہے۔ چھوٹی موٹی صنعت، چھوٹی موٹی تجارت جو عام طور پر خوانچہ اور بساطخانہ سے آگے نہیں بڑھتی، چھوٹا سا افق جو محلہ اور مقامی شخصیات تک محدود رہتا ہے۔ چھوٹی سی نگاہ، چھوٹا سا حوصلہ۔

ہم آسانی سے بہکانے میں آجاتے ہیں، ہمیں بھڑکا دینا کوئی دشوار نہیں، ہمارے اندر آپس میں پھوٹ ڈالنے کے لیے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہمارے

یہاں وقت کی قدر نہیں ؛ صفائی کو ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے ، محنت سے ہم جی چُراتے ہیں ۔ ڈیڑھ اینٹ سے ہمارا ناطہ جُڑا ہُوا ہے ۔ ہر شخص اپنی راہ الگ نکالتا ہے ۔ مل کر ہم کوئی کام نہیں کر پاتے ۔ ادارہ چلانے اور اس طرح آگے بڑھنے کی صلاحیت ہم سے چھین لی گئی ہے ۔ اگر ہم میں سے کوئی اُٹھے اور ملّت کو یہ بتانے کی کوشش کرے کہ مذکورہ کمزوریوں سے برأت حاصل کریں ، تو کوئی نہ اس کی سُنے گا نہ اُسے سمجھے گا ، کہ عقل کو ہم نے معطّل کر رکھا ہے ! نشیب و فراز اور پیچ و خم سے آگہی میں دشواریاں ہی دشواریاں ہیں ، آسان راستہ جذباتی تن آسانی سے نکلتا ہے ۔ ہم میں اپنی بھلائی بُرائی کا شعور باقی نہیں رہا ۔ شعور نہ رہے تو صحیح فیصلہ کیونکر ہو اور صحیح قدم کیسے اٹھایا جائے ؟ سمجھنے بوجھنے سوچنے بچارنے کی عادت علم سے آتی ہے ۔ اسی سے عقل پر جِلا ہوتی ہے ، اسی سے افق وسیع ہوتا ہے اور انسان اپنے تنگ دائرے سے نکل آتا ہے ۔

ثابت ہوا کہ ہماری بیماریوں اور کمزوریوں اور پسماندگیوں کا علاج صرف علم ہے ۔ اگر ہم علم کو مضبوط پکڑ لیں گے تو دنیا کی دوسری نعمتیں ہماری گرفت میں آجائیں گی ۔ تاریکی اور پسماندگی کے بادل چھٹ جائیں گے ۔ علم نہ صرف ہم کو بہتر انسان اور بہتر مسلمان بنائے گا ، نہ صرف ہمیں اپنے بھلے بُرے سے آگاہ کرے گا ، نہ صرف ہمیں حسد ، بغض اور کینہ اور تنگ نظری سے بچائے گا ، نہ صرف ہمارے امکانات کو قوت سے عمل میں لائے گا ، بلکہ زندگی کا جو شعبہ ہم نے اختیار کیا ہے اس میں ہماری کارگزاری کو حال سے کہیں بہتر بنا دے گا ۔ علم سے ہمیں فراست اور بصیرت اور آگاہی ملے گی اور اس کے علاوہ آسائش ، آرام ، عافیت اور دولت ۔

علم سے مُراد صرف دنیاوی علم نہیں ، دینی علم بھی ہے ۔ اگر ہم نے دنیا کا علم حاصل کر لیا اور دین سے بے خبر رہے تو یہ ٹوٹے کا سودا ہے ۔ اس طرح ہماری شخصیت ادھوری رہ جائے گی اور ایک بہت مختصر سی زندگی کی لذتوں کی خاطر ہم دائمی زندگی کے سکون و عافیت کو کھو بیٹھیں گے ، ہم اپنی تخلیق کی غایت سے غافل ہو جائیں گے اور اپنے خالق کی عبادت اور اس کی مخلوق

کی خدمت سے محروم رہ جائیں گے۔ دنیوی علوم کی تحصیل کے لیے حکومت (مرکزی، ریاستی اور مقامی) نے بڑے سروسامان کیے ہیں، اور مختلف جماعتوں نے، جن میں سے مسلمان بھی ایک ہیں، خود اپنے عصری اسکول بھی کھولے ہیں۔ دینی تعلیم کی تمام ذمہ داری مسلمانوں پر ہے۔ انھوں نے دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلما جیسی جامعات کھولیں اور ملک کے مختلف حصوں میں دارالعلوم اور دینی کالج، مدرسے اور مکتب بھی۔ ملک میں جابجا ہمیں مدرسے اور مکتب ملیں گے۔ ان چھوٹے چھوٹے مکتبوں اور ان کے خستہ حال مُعلّموں نے اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ فتنۂ ارتداد کو روکنے میں اُن کا بڑا حصّہ ہے۔ اگر مسلمان اس ملک میں من حیث القوم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ مدرسوں کا دفاع اور تقویت کی جائے اور گوشہ گوشہ میں مدرسے قائم کیے جائیں اور ان کو معقول ڈھنگ سے چلانے کا انتظام ہو، اور کوئی مسلمان بچہ ایسا نہ رہ جائے جسے دین کی تعلیم نہ ملی ہو۔

دینی تعلیم اور ذہنی آگہی کی حالت اس وقت عبرت ناک ہے۔ مثالیں بے شمار ہیں، میں صرف ایک دوں گا۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے تلاش صلاحیت یا ٹیلنٹ سرچ کی ایک اسکیم شروع کی ہے۔ اس کے سامنے ایک بچی انٹرویو کے لیے آئی جس نے ہائی اسکول میں امتیازی نمبر حاصل کیے تھے، جس کی معلوماتِ عامّہ بہت اچھی تھی۔ اس کا نام معراج فاطمہ تھا۔ پوچھا گیا کہ معراج کے معنی کیا ہیں، جواب ملا، میرا راج۔ یہ جواب ملّت کے منھ پر طمانچہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بچّوں کا اسلامی نام رکھ دیا اور ان کی تربیت کا حق ادا ہوگیا۔ الزام اس نئی نسل کو نہ دیجیے جو دین سے بیگانہ اُٹھ رہی ہے؛ اس نسل کو دیکھیے جس کے زیرِ سایہ وہ اُٹھی ہے۔ کیا مسلمان والدین اس حد تک از کار رفتہ ہیں کہ وہ دین کی بنیادی باتیں اپنے بچّوں کے ذہن اور دل میں نہیں بٹھا سکتے۔ کیا وہ اتنے کنگال ہیں کہ بچّوں کے لیے دینی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتے۔ کیا وقت کی تنگی کا سوال صرف دینی تعلیم کے ضمن میں اُٹھتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ لوگ جو بچّوں کی دنیوی تعلیم پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے

ہیں اس سے بہت کم صرف ان کی دینی تعلیم پر کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ جواب صاف ہے۔ وہ دین کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ اہمیت صرف اس بات کو دیتے ہیں کہ ان کے بچے ایسے علوم پڑھ لیں جن کی مدد سے انھیں نوکری مل جائے اور وہ اپنا پیٹ پال سکیں۔ تو گویا انسانیت کا منتہا پیٹ پالنا ہے۔ وہی پیٹ پالنا جو جانوروں کی ابتدا ہے۔ حق شناسی، خدا پرستی اور دردمندی اگر نہ آئی تو انسانوں اور جانوروں میں فرق ہی کیا رہ گیا۔ انتہائی غفلت ہوگی اگر ہم یہ اہتمام نہ کریں کہ ہر مسلمان گھر میں اس زبان میں جو اس کے مکیں بولتے ہیں ایک چھوٹا سا کتابچہ ضرور ہو جس میں اسلام کی بنیادی معلومات، رسول اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ اور خلفائے راشدین کی سوانح اور دنیائے اسلام کی مختصر تاریخ دی گئی ہو۔ یہ امر ہم سب کی توجہ کا مستحق ہے اور خصوصاً ان اداروں کا جو دینی تعلیم سے سروکار رکھتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے ایک نظم کی ضرورت ہوگی جو ہر محلّہ پر حاوی ہو۔ والدین کا فرض ہوگا کہ اس میں لکھی ہوئی باتیں بچّے کے کانوں میں شروع سے ہی ڈالیں اور وہ بڑا ہو جائے تو اسے یہ کتابچہ پڑھائیں اور اسے دہراتے رہیں۔ یہ کام دشوار نہیں ہے، تھوڑی سی توجہ اور وقت چاہتا ہے۔ یہ کام ہمیں کل سے ہی شروع کر دینا چاہیے، جہاں کہیں ہم ہوں۔

اس نفسیاتی امر کو ملحوظ رکھیے کہ جو نقش بچپن میں بیٹھتے ہیں وہ حافظے سے کبھی محو نہیں ہوتے۔

صبح کا بھولا شام کو گھر ضرور آتا ہے۔ پہلے نقوش اس دینی تعلیم کے ہونے چاہئیں جو گھر میں دی جائے۔ یہ نقوش اس مشاہدہ پر بھی مبنی ہوں جو دین سے متعلق عبادات اور افعال بچّہ اپنے بڑوں کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔

اس تعلیم و تربیت کی دوسری سیڑھی محلّہ کے گھر، مسجد یا مدرسہ میں قرآن کی تعلیم ہوگی۔ اس نظام کو پھر زندہ کرنا چاہیے جس کے تحت پڑھی لکھی خواتین فی سبیل اللہ اپنے پڑوس کے بچوں کو دین کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔ ایسا کرنا بھی زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔ بحمدللہ مسلمان آبادیوں میں کئی گھر اب بھی ایسے مل جائیں گے جہاں عورتیں دین میں

دستگاہ رکھتی ہیں اور جن کے پاس اس خزانے کو نئی نسل تک منتقل کرنے کے لیے وقت بھی ہے۔ سوال صرف انھیں تلاش اور آمادہ کرنے کا ہے۔ جو قریہ قریہ بستی بستی اور محلہ محلہ کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ہم لوگ اس وقت میں سے جس کا ایک کثیر حصہ ہم خوشدلی کے ساتھ برباد کر دیتے ہیں، تھوڑا بہت وقت اس کار خیر کے لیے نکال سکیں۔ سب لوگ نہیں کچھ لوگ تیار ہو جائیں تو یہ مرحلہ سر ہو جائے۔ ایک دفعہ یہ کام شروع ہو گیا تو خود بخود چلتا رہے گا۔

اس زینہ کی تیسری سیڑھی دینی تعلیم کے وہ مدرسے ہیں جو شہروں اور دیہات میں قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کثیر تعداد ان مدرسوں کی ہے جنھیں دینی تعلیمی کونسل معرض وجود میں لائی۔ ان مدرسوں کی تعداد میں غیر معمولی توسیع کی ضرورت ہے۔ اور موجودہ مدرسوں کو بہتر بنانا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم نگرانی کے نظام کو منضبط کرنا ہے۔ بہت سے اضلاع میں یہ تلخ تجربہ ہو رہا ہے کہ اتنا روپیہ بھی فراہم نہیں ہوتا کہ ضلع کے ناظم تعلیم دین (ڈسٹرکٹ آرگنائزر) کی تنخواہ نکل آئے۔ یہ بات ہم سب کے لیے شرمناک ہے۔ آپ کو علم ہوگا کہ دینی تعلیمی نظام کا سرچشمہ بستی کا ضلع ہے جہاں عدیل عباسی صاحب مرحوم کی سعی بلیغ کے نتیجہ میں وہ مہم شروع ہوئی جس کو چٹکی کی تحریک کا نام دیا گیا۔ شہر اور دیہات ہر جگہ ہماری بہنوں نے یہ بات مان لی کہ جب گوندھنے کے لیے آٹا نکالا جائے گا تو اس میں سے ایک چٹکی الگ کر دیا جائے گا۔ نام چٹکی کا دیا گیا لیکن عملاً مٹھی بھر آٹا نکالا گیا۔ ایک ہفتہ میں جتنا آٹا اس طرح جمع ہو جاتا وہ نقدی کی شکل میں دینی تعلیم کے لیے دے دیا جاتا۔ اس نظام کے تحت ہزاروں مدرسے کھولے اور چلائے گئے اور اب تک چلائے جا رہے ہیں۔ مگر اب کچھ عرصے سے اس تحریک میں وہ گرمی نہیں رہی۔ علاوہ ازیں اس تحریک نے زور مشرقی اضلاع میں ہی پکڑا، مغربی اضلاع میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ گزشتہ ماہ میں سنبھل ضلع مرادآباد میں یو۔پی کے مغربی اضلاع کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ امید ہے کہ اس کانفرنس کے نتیجہ

میں جسے حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے صدارت سے نوازا، روشنی اور آگہی کی یہ تحریک مغربی یو۔پی میں بھی فروغ پائے گی۔ ہمیں پوری ریاست کو سیراب کرنا ہے۔ مدرسوں کی مالی مشکلات کو دور کرنا، آرگنائزوں کو تلاش کرکے انھیں معقول مشاہرہ دینا اور خود صوبائی دینی تعلیمی کونسل کے مرکز کو مضبوط کرنا اور اس لائق بنادینا کہ دینی مدارس کی نگرانی، امداد اور توسیع کا کام بخیر و خوبی انجام پاسکے، یہ سارے امور ہم سب کی توجہ چاہتے ہیں۔ چٹکی کے نظام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ تعلیم کی تحریک میں ایک بڑے طبقہ کی شرکت ہوجاتی ہے اور کسی پر بار نہیں پڑتا اور یہ احساس عام ہوجاتا ہے کہ دینی تعلیم ضروری ہے اور ہر ایک مسلمان اس بات کا ذمہ دار ہے کہ کوئی مسلمان دینی تعلیم کے تعلق سے اَن پڑھ نہ رہ جائے۔ دوسرا طریقہ وسائل فراہم کرنے کا یہ قرار پایا ہے کہ ایک ماہ میں گھر پر جتنا خرچہ ہو اس کا ۱/۲۰ حصّہ دینی تعلیم کی نذر کیا جائے۔ غور کیجیے کیا ہم اتنی چھوٹی سی مدد بھی تعلیمِ دین کی نہیں کرسکتے۔ پھر ہمیں اس کا حق کس نے دیا کہ مسلمانوں کے حالِ زار پر افسوس کریں اور ان کے علمِ دین سے بے بہرہ ہونے پر مُتاسِّف ہوں۔ کوئی قوم اور کوئی جماعت غم کے احساس و اظہار سے کامیاب اور سرخرو نہیں ہوتی۔ اس قسم کا احساس رسمی اور اظہار کھوکھلا سمجھا جائے گا اگر اس کے لیے ہم عمل اور ایثار کرنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ پڑھے لکھے اور نسبتاً خوشحال لوگوں پر پوری قوم کا قرض ہے۔ ہمارے بیشتر دینی بھائی اَن پڑھ ہیں اور ہم میں سے ایک بڑی تعداد اسلام کی مبادیات سے بھی ناواقف ہے۔ ان لوگوں کو دینی تعلیم دلانا ہمارا اوّلین فرض ہے، ورنہ ہمارے دیس میں اسلام باقی نہیں رہے گا مسلمانوں کا تو نقصان ہوگا ہی خود ملک بھی ثقافتی افلاس سے دوچار ہوجائے گا۔

مدرسے کھولنا اور چلانا ہی کافی نہیں ہے۔ کیونکہ دو ریاستوں کیرالا اور گجرات کو چھوڑ کر باقی ریاستوں میں یہ عالم ہے کہ جو بچے عام اسکولوں میں پڑھنے جاتے ہیں، مذہب سے انھیں ادنیٰ سی بھی آگاہی بھی نہیں ہوتی۔ اُن کے لیے مسجدوں میں جزوقتی دینی تعلیم کا اہتمام لازمی ہے یہ کام محلّہ محلّہ ہونا چاہیے کہ اس کے بغیر وہ خلیج جو عربی نوالوں

اور انگریزی خوانوں کے درمیان حائل ہوگئی ہے پاٹی نہیں جا سکتی۔ اسی طرح عربی مدرسوں میں اس کا اہتمام ہونا چاہیے کہ اس کے طالب علم کسی مرحلہ میں عصری تعلیم کی طرف بہ آسانی منتقل ہو سکیں۔ یہاں انگریزی، سائنس اور حساب کی تعلیم درکار ہوگی۔ مدرسوں کے پاس وسائل کم ہیں۔ مذکورہ مضامین پڑھانے والے استادوں کو بڑی تنخواہیں دینا ہوں گی۔ مان لیجیے کہ وسائل ہو بھی گئے، تو ایک ہی مدرسہ میں تنخواہ کے اعتبار سے دو قسم کے استادوں کی موجودگی سے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ہر ضلع اور ہر شہر میں ایک انجمن تعلیم یا ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی جائے جو مقامی تعلیمی مسائل کو اجتماعی وسائل اور باہمی مشورے کے ذریعے حل کرے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن اور قابلِ عمل ہو سکتا ہے کہ مقامی اسکول یا کالج سے مذکورہ مضامین کے استاد مدرسہ میں آکر مذکورہ مضامین کی جز وقتی تعلیم دے دیا کریں، یا مدرسہ کے طالب علم قریب کے اسلامی اسکول میں جاکر وہ مضامین پڑھ لیں۔ لیکن ہر جگہ مسلمانوں کے اہتمام میں چلنے والے مدرسہ اور انگریزی اسکول کا ایک دوسرے کے قرب میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایسا اتفاق کم ہی شہروں میں ہوگا۔ ایسی صورت میں مدرسہ کے اوقات کے بعد مدرسہ کے طلبہ کو خود مدرسہ یا کسی دوسری مناسب جگہ پر بیرونی استادوں کے ذریعہ انگریزی، ریاضی اور سائنس کی تعلیم دی جائے گی۔ اور ان اساتذہ کی خدمت میں معقول مشاہرہ پیش کیا جائے گا۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ عربی مدرسوں کا نصاب پہلے ہی سے گتھا ہوا، گنجان اور بھاری ہے۔ زائد مضامین پڑھانے کے لیے وقت کہاں سے آئے گا۔ اس مسئلہ کو دو طرح سے حل کر سکتے ہیں: اوّل تو ان مضامین کو حذف کر کے جن کا تعلق دین سے نہیں ہے، دوسرے، کورس کی مدّت میں سال یا دو سال کا اضافہ کرنے کے ذریعہ۔ اس تجویز پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس طرح دینی عنصر بہ تدریج کم ہوتا جائے گا اور عصری اور غیر دینی مضامین بڑھتے چلے جائیں گے۔ اگر احتیاط برتی اور نگاہ رکھی جائے تو اس کھٹکے کو دور کر سکتے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ یہ تجویز دینی حلقوں

میں مقبول نہیں ہوگی، لیکن بادی النظر کے اس ردِ عمل میں ترمیم ہو سکتی ہے: اگر موجودہ طرز و نصابِ تعلیم کو بدلا نہیں گیا تو اس کے نتائج بالآخر مضرت رساں ہو سکتے ہیں۔ اس وقت یہ عالم ہو گیا ہے کہ علما کے خاندانوں کو چھوڑ کر بیشتر طالبِ علم جو عربی مدرسوں میں داخل ہوتے ہیں زیادہ ذہین نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی تو والدین انھیں اس لیے مدرسوں میں بھیجتے ہیں کہ وہ اسکولوں میں نہیں چل سکتے۔ ان طالبِ علموں کے سر پر جب دستارِ فضیلت باندھی جائے گی تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ عالم ہونے کا حق ادا کر سکیں گے؟ ہمیں دینی مدرسوں میں اوسط اور اوسط سے زیادہ ذہانت کے طلبہ کے لیے کشش کا سامان پیدا کرنا ہے۔ یعنی یہ امکان پیدا کرنا ہے کہ وہ دینی تعلیم مکمل کر کے یا اس کے ابتدائی حصّہ پر راسخ ہو کر جدید تعلیم کی طرف جب چاہیں چلے جائیں۔ ہمارے اعلیٰ مدارس کے فارغین کو عصرِ حاضر کے علوم سے آگہی اس لیے بھی درکار ہے کہ وہ نئی نسل کو، جو عقیدہ سے زیادہ عقل پر زور دے رہی ہے اور جو آغاز ہی شک و شبہ سے کرتی ہے، دین کی صداقت اور فیوض کا قائل کر سکیں۔ اور جب ضرورت پڑے تو اجنبیوں کو دینِ اسلام سے، نئے حالات اور نئے علوم کو ملحوظ رکھتے ہوئے، روشناس کر سکیں، اور دین پر جب الحاد یا دوسرے مذاہب کی طرف سے حملہ یا اعتراض ہو تو اس کا دفاع کر سکیں اور جواب دے سکیں۔

لیکن یہ انتظام ضرور رکھا جائے کہ بیرونی مضامین جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، اختیاری ہوں۔ جو طالبِ علم انھیں پڑھنا چاہیں، انھیں پڑھا دیے جائیں، جو نہ چاہیں، وہ انھیں نہ پڑھنے کے لیے آزاد ہوں۔ یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ دینی مدارس میں حکومت مداخلت نہ کر سکے۔ اور یہ بات اس سے بھی زیادہ واضح کہ دینی مدارس کے نصاب میں جو ترمیم بھی ہو، ان کے اہتمام کے اتفاق سے ہو۔ دراصل یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ علمائے کرام کی مجلسِ شوریٰ کی توجّہ کا مستحق ہے۔ وہ اپنی صوابدید کے مطابق، مذکورہ تجاویز کو دیکھتے ہوئے، جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔

دینی تعلیم کے ساتھ اردو کی تعلیم کا مسئلہ اٹھتا ہے۔ اردو اتنی دلکش اور معنی خیز

اور متمول زبان ہے کہ ہندوستان کی بدقسمتی ہوگی اگر وہ مٹ گئی یا محدود ہو گئی۔ مسلمانوں کے لیے اس کی مزید اہمیت یہ ہے کہ اس کے اندر عربی، فارسی، ترکی الفاظ کا ذخیرہ ہے اور اس کے رسمِ خط کے ذریعہ ان کی رسائی، اسلام اور دنیائے اسلام تک ہو جاتی ہے۔ یوں تو علم کی تحصیل مسلمان عورتوں اور مردوں پر فرض ہے لیکن اردو زبان کی تحصیل میں ان کے لیے دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے۔ جو عرضداشتیں اور محضر وقتاً فوقتاً حکومت کو اردو کے سلسلہ میں دیے گئے، ان کی حیثیت حرفِ غلط سے زیادہ نہیں سمجھی گئی۔ اس وقت کئی ریاستوں میں اردو اگر باقی ہے تو وہ ایک حد تک عربی مدرسوں کی بدولت۔ تعلیم کے ماہرین تسلیم کرتے ہیں کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونی چاہیے، ورنہ اس کو اِدراک اور اظہار اور نشوونما کی دشواریاں درپیش ہوں گی۔ اردو کو بچانے اور بڑھانے کے لیے تین کام کرنے ہوں گے۔

۱۔ حکومت سے مطالبہ کہ اردو کے ساتھ ناانصافی ختم ہونی چاہیے اور ان طالب علموں کو، جو اُردو پڑھنا چاہتے ہیں، اس کا پورا موقع ملنا چاہیے؛ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے، ان کی ابتدائی تعلیم اُردو میں ہی ہونی چاہیے۔ سہ لسانی فارمولا میں اُردو کو شامل کرنا ان ریاستوں کے لیے لازمی قرار دیا جائے جہاں اس کا چلن ہے۔

۲۔ اُردو پڑھانے کا جزوقتی انتظام، خواہ گھر پر، خواہ کسی دوسری جگہ۔

۳۔ ان اسکولوں میں جو مسلمانوں کے زیرِ اہتمام ہیں، اُردو کی پڑھائی کا خاص انتظام کیا جائے۔

ہمیں تعمیر کے نقطۂ نظر سے مذکورہ بالا دوسری اور تیسری تجویز پر زور دینا چاہیے کہ یہ کام ہمارے کرنے کا ہے، ہمارے بس کا ہے اور اسے ہم کر سکتے ہیں۔ حکومت سے مطالبہ کا جہاں تک تعلق ہے، اس کے پیچھے ہماری پوری رائے عامہ کا دباؤ ہونا چاہیے: پالیسی کا اعلان کافی نہیں ہوتا۔ پروگرام کی وضاحت اور نفاذ کی ضمانت پر اصرار نہ ہوا تو مطالبہ کرنے سے کیا حاصل۔

ہمارے انتظام میں جو اسکول اور کالج ہیں ان میں سے بیشتر خلل پذیر ہیں؛

ان میں آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، ان کا معیار اور نتائج قابلِ تبریک نہیں ہوتے۔ وہ بالعموم سائنس اور حساب اور انگریزی کی تعلیم اچھی نہیں دے پاتے۔ ان مضامین کے اچھے استاد بھی انھیں ہاتھ نہیں آتے۔ مستثنیات ضرور ہیں لیکن رائے تو اکثریت کو دیکھ کر قائم کی جاتی ہے۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

کوئی تنظیم ضلع اور ریاست کی سطح پر ایسی ہونی چاہیے جو ان اداروں میں نظم و ضبط اور تعلیم کے معیار کو اونچا کر سکے۔ جس کا فیصلہ اساتذہ اور انتظامیہ دونوں کو منظور ہو۔ یہی تنظیم اس کی ذمہ داری بھی لے کہ گھروں میں تعلیمی ماحول اور تعلیمی رہنمائی اور مدد کی جو کمی ہے اس کی تلافی اجتماعی کوشش اور ریمیڈیل اور پروموشنل کلاسوں کے ذریعہ کی جائے۔ ضرورت اس کے لیے وسائل اور حسنِ انتظام کی ہوگی۔

ہمارے کاریگروں کے ہاتھ میں ہنر ہے، لیکن علم سے اُن کے ہنر پر صیقل نہیں ہونے پاتی وہ اپنے ہنر اور اپنی گھریلو صنعت کو ترقی نہیں دے پاتے۔ وہ ہر قدم پر سرمایہ کے دست نگر ہیں۔

دستِ دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

یہاں، اس نکتہ کو دہرانا شاید بے محل نہ ہوگا کہ ارتقائے انسانی کے مبصرین اس تعلق پر زور دیتے ہیں، جو ہاتھ اور دماغ کے مابین ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے ہاتھ کی ساخت اور اس کی گرفت جس کا محور انگوٹھا ہے، مغز کے نشو و نما کا سبب بن گئی۔ اس کے بعد انسان نے جو ترقی کی وہ ہاتھ اور دماغ کی شرکت کار کے باعث ہوئی۔ جن صنعتوں نے ہاتھ پر زیادہ تکیہ کیا اور دماغ کو نظر انداز کر دیا وہ پیچھے رہ گئیں۔ جن صنعتوں نے ہاتھ سے بھی زیادہ زور دماغ پر دیا وہ آگے بڑھ گئیں۔ ہمارے کاریگروں کے دستِ حسن آفریں کو اگر دماغ سے، اس دماغ سے جو تازہ ترین علم و ہنر سے جلا پا چکا ہے۔ کمک ملتی رہے تو وہ

آسمان سے تارے توڑ لائیں۔ ہو رہا ہے اس کے بالکل برعکس۔ ایک طرف زمانہ کی ناقدری نے اُن کے دلوں کو بُجھا دیا ہے۔ دوسری طرف علم کی روشنی میں جو نئی نئی راہیں مشقِ ہُنر اور ولولہ پردازی کے لیے کُھلتی رہتی ہیں اُن میں سے بیشتر ان پر بند ہیں۔ انھیں تھوڑی بہت جو روشنی ملتی ہے، وہ مانگی ہوئی ہے۔ معارف کیا چاہتا ہے؟ برآمد کرنے والے کے تصورات کیا ہیں؟ ڈیزائنر ان دونوں کو ڈیزائن میں کس طرح منعکس کر پاتا ہے۔ یہی وہ حصار ہے جس میں اہلِ حرفہ کام کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کام بے کیف اعادہ، بے مزہ تکرار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دل کہیں دماغ کہیں ہاتھ کہیں۔ ان کا وہ ربطِ باہم جو زندگی کو ذوق، کام کو کشش، اور جدّت کو مہمیز دیتا ہے، معدوم رہتا ہے۔ ایسا کام وبالِ جان بن جاتا ہے۔ ہمارے کاریگروں میں سے چند کو چھوڑ کر باقی سب اسی لامتناہی مصیبت میں گرفتار رہتے ہیں۔ جو کام بے دلی سے کیا جائے اس کا اثر اعصاب اور جسمانی اور دماغی صحت پر پڑتا ہے۔ پھر انھیں کام کرنے کا ماحول بھی ایسا ملتا ہے جو صحت کے لیے مُضر ہے۔ تنگ و تار کوٹھریاں جہاں روشنی اور ہوا کا گزر نہیں، چھوٹے چھوٹے گھر اور بہت سے مکیں۔ گنجان بستیوں سے ہمیں بہ تدریج نکلنا چاہیے۔ شہر کے باہر اپنی نو آبادیاں بنانی چاہئیں۔ سمٹنے میں پسپائی اور بیماری ہے، پھیلنے میں نُصرت اور صحت۔ یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو تاہم گہری اور مُنظّم توجہ کا طالب ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے اہلِ حرفہ کو جو ہمارے دست و بازو ہیں، اپنے بچّوں کو اچھی تعلیم دینی چاہیے؛ اسراف کو ختم کیجیے، فضول خرچی سے دامن بچائیے؛ ضرورت پڑے تو پیٹ کاٹیے اور بچّوں کو پڑھائیے، تاکہ وہ خاندان کے نام کو روشن کر سکیں اور اپنے خاندانی ہُنر میں چار چاند لگا سکیں، اپنے افق کو وسیع کر سکیں، ان میں سے ایک تعداد پشتینی کاروبار کو چھوڑ کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نام پیدا کر سکے:

رُکا؟ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

کبھی کبھی ہمیں اپنے شہر، اپنے پیشہ، اپنے نقطۂ نظر اور اپنی افتادِ طبع کی حدود سے نکلنا چاہیے تاکہ ہم تازہ دم اور وسیع النظر ہو کر اپنے گھر یا اپنے معاشرہ میں واپس آئیں۔ زمان و مکان کا نقل ذہنی صحت اور توازن کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ مکان کا نقل تو بڑی حد تک جسمانی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ زمان کا نقل صرف ذہنی اور روحانی ہوتا ہے۔ یعنی ماضی کی سیر کرنا اور مستقبل کے خواب دیکھنا جن کی اساس تعمیر تنظیم اور حوصلہ مندی پر ہو۔

ہمارے دین کے نزدیک شرک بہت بڑا گناہ ہے۔ باری تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک کرنا کسی حال میں جائز نہیں، مقاصد میں شرک بھی ناروا ہے۔ اگر مقصد ہے خدمتِ خلق یا اعلائے کلمۃُ اللہ، تو اس میں خواہش ناموری و اقتدار کی آمیزش نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے بہت سے شہروں میں دیکھا ہے کہ ان اداروں کی طرف سے جو ایک عرصہ ہوئے قائم کیے گئے تھے، غفلت برتی جاتی ہے، اور چھوٹے بڑے (زیادہ چھوٹے، کم بڑے) ادارے کھول دیے جاتے ہیں تاکہ ان اداروں سے بلا شرکتِ غیرے کسی صاحبِ خیر کی شہرت اور سرخروئی ہو۔ فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کو صاحبِ خیر بننا ہے یا صاحبِ نام، سرخروئی اس دنیا میں حاصل کرنی ہے یا عاقبت میں۔ اگر خیر محض ہدف ہے اور آخرت کی سرخروئی مدِ نظر ہے تو خدمتِ خلق اور کارِ خیر کو ذاتی اقتدار، وجاہت اور شہرت کا ذریعہ نہ بنائیے۔ شاعر تو یہاں تک کہ گیا ہے کہ:

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اس بے باکی پر برہم ہونے کی ضرورت نہیں، شعراء تو پروانۂ استثنا لکھوا کر آتے ہیں۔ شاعر کی مراد صرف یہ ہے کہ طاعتِ خالق اور خدمتِ خلق، غرض کی ملاوٹ کو قبول نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نیت کو دیکھتا ہے۔ لہٰذا خدمتِ خلق کے نام سے انا کی تسکین کے سلسلہ کو ختم ہونا چاہیے۔ اپنی ڈفلی الگ الگ بجانے سے بہتر ہے کہ اہلِ خیر مل کر مقامی ملی ضروریات پر غور فرمائیں اور انھی کے مطابق متحد ہو کر اداروں کی بنا ڈالیں اور ان اداروں کو سہارا دیں جو پہلے سے قائم ہیں۔ سوال مقدار کا نہیں معیار کا ہے۔ چھوٹے موٹے

اُلٹے سیدھے اداروں کی تعداد بڑھ گئی تو کیا حاصل ہوا؟ بدگمانی اور ہوا خیزی۔ اداروں کو معیاری بنائیے اور ضرورت کے مطابق نئے معیاری ادارے قائم کیجیے۔ جو لوگ نماز میں کندھا سے کندھا ملاتے ہیں تو وہ مسجد سے باہر نکلتے ہیں تو اتحاد اور یک جہتی کو فراموش کیوں کر دیتے ہیں۔ نماز جس اتحاد کا سبق دیتی ہے، وہ زندگی پر حاوی ہونا چاہیے۔ اگر ہم زوال کے سیلاب کو تھامنا چاہتے ہیں اور ترقی کے راستے پر گامزن ہونا ہمارا مقصد ہے تو ہمیں سر جوڑ کر اور قدم سے قدم ملا کر تعلیمی، اصلاحی اور تعمیری کاموں میں لگنا ہوگا۔

تعمیری کام تو بعد میں آتے ہیں، پہلے خانہ جنگی کو ختم کیجیے جو دیمک کی طرح ہمیں چاٹ رہی ہے اور جس نے ہمیں مضحکہ اور استہزا کا مُوردِ غیروں کی نگاہ میں بنا دیا ہے۔ ایک طرف تو ہمیں ذات اور برادری کا روگ لگ گیا ہے۔ برادری کو ماننے میں کوئی خرابی نہیں لیکن کیا ہماری برادری وہ عالمگیر انسانی برادری نہیں جس کا پیغام اسلام کی شکل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ اُس چھوٹی برادری کے اپنے الگ کچھ مسائل ہو سکتے ہیں جو کسی پیشہ یا حرفہ پر مبنی ہو۔ ان مسائل کو مل کر حل کرنا چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے خانوں میں بانٹ دیں اور اس زبردست اشتراکِ عقائد و اعمال کو بھول جائیں، اسلام جس کا نام ہے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو نہ صرف (خدا نخواستہ) ہم اپنے دین سے پھر جائیں گے بلکہ اپنا دفاع بھی مخالفِ دین طاقتوں کے مقابلے میں نہ کر سکیں گے۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی، ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

نفاق نے ہماری بدقسمتی سے ایک اور شکل اختیار کر لی ہے۔ شیعہ سنّی، بریلوی دیوبندی، آپس میں اس طرح گرمِ نبرد ہیں، جیسے اسلام صرف خانہ جنگی کی تعلیم دیتا ہو۔ ہماری ہر طرف

ہنسی اڑتی ہے اور ہم اپنے بھائیوں کو گالیاں دینے اور دائرۂ اسلام سے خارج کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ ہمیں احساس ہی نہیں کہ یہ سارے لچھن خودکشی کے ہیں۔ کیا اسلام کے بنیادی عقاید سے زیادہ اہمیت فروعات کی ہے، کیا ہم اتحاد پرور اصول کو چھوڑ کر نفاق انگیز فروع میں اُلجھ جائیں گے۔ اگر ہم نے اس بے معنی اور خود سوز خانہ جنگی کو ترک نہیں کیا تو ہماری بقا کے لالے پڑ جائیں گے۔ آستین چڑھانے کے بجائے ہمیں اپنے بھائیوں کے آگے مصالحت کا ہاتھ بڑھانا اور انکسار کا سر جھکانا چاہیے۔ ورنہ مہاجات اکبر اور عداوت آگ بن کر ہمیں بھسم کردے گی۔

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

ہمارے ملک میں پلانڈ ڈیولپمنٹ یا ہمہ جہت منصوبہ بند ترقی کا دور ۱۹۵۱ء میں شروع ہوا، اسے ۳۵ سال گزر گئے۔ اربوں روپے قطعہ بندار تقا پر صرف ہوئے۔ ہمیں اس میں سے کیا ملا؛ حصۂ رسدی بھی نہیں ملا حالانکہ وہ اقلیتیں جو بیدار ہوتی ہیں وہ اپنے حصۂ رسدی سے زیادہ پاجاتی ہیں۔ اقلیتی صورتِ حالات کی منطق ہی یہی ہے کہ اکثریت سے زیادہ محنت کریں اور ملک کی ترقی کے لیے خود کو اکثریت سے زیادہ بکار آمد بنائیں۔ کچھ تو ہمارے خلاف نفاذ کی متعدد سطحوں پر امتیاز برتا گیا لیکن اس سے کہیں زیادہ ہمیں خود سے نقصان پہنچا۔ ہمیں خبر بھی نہ ہوئی کہ کون سی اسکیموں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اگر خبر ہو بھی گئی تو کچھ بے حسی اور کچھ مخالفت اور عصبیت کے اندیشہ نے ہمارے قدم پکڑ لیے۔ اس سلسلے میں میں زیادہ موردِ الزام اس طبقہ کو ٹھہراؤں گا جس سے خود میرا تعلق ہے۔ وہ لوگ جو پڑھ لکھ گئے تھے اور وہ کہ اس کے منصوبوں سے واقف تھے، انھوں نے کوشش ہی نہیں کی کہ اس آگاہی کو اپنے بھائیوں تک لے جائیں۔ یہ کام ہر شہر میں کرنے کا تھا۔ اس غفلت اور بے حسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ ۳۶ سالوں میں مسلمانوں نے سب سے پچھڑی قوم ہونے کا ناقابلِ فخر امتیاز حاصل کرلیا ہے۔ اور پچھڑنے کی رفتار سے وہ اب بھی مطمئن نہیں نظر آتے اور اسے اور تیز کرنے کے درپے ہیں۔ عقلمند دوسروں کی

غفلتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی غفلتوں سے فائدہ اٹھائیں اور کم سے کم آئندہ پندرہ سالوں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ اس بار ساتویں پنجسالہ منصوبے کے ساتھ ساتھ پندرہ سال کا تناظری منصوبہ (Perspective Plan) بنا ہے۔ اس کے پروگراموں اور اسکیموں کی تشریح اور تعبیر اور تعاقب ہم پر لازم آتا ہے۔ یہ کام ہر شہر میں ہونا چاہیے اور ریاستی اور مرکزی سطح پر بھی۔ لیکن اس کے لیے ادارے اور وسائل درکار ہوں گے۔

فی الحال تو ہمیں نئی تعلیمی پالیسی کو مضبوطی سے پکڑ لینا چاہیے۔ اس پالیسی سے پورا فائدہ اٹھانا اور اس کے نفاذ کی نگرانی کرنا، اس کی کمیوں اور نفاذی خامیوں کو دُور کرانا ہمارا فرض ہے۔ ۱۹۸۵ء میں وزارتِ تعلیم نے تعلیم کے چیلنج کے نام سے ایک دستاویز شائع کی جس میں تعلیمی صورتِ حالات کا بیان صاف گوئی کے ساتھ کیا گیا تھا اور تعلیمی مسائل اور مستقبل کی ترقیاتی ضروریات کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ سال بھر اس دستاویز پر ملک گیر بحث ہوتی رہی۔ اس بحث کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکومت نے اپنی نئی تعلیمی پالیسی بنائی جو تعلیم کی قومی پالیسی کے نام سے پارلیمنٹ میں منظور ہونے کے بعد مشتہر کی گئی۔ اسی کے چند ماہ بعد اس پالیسی سے متعلق ایک عملی پروگرام یا پروگرام آف ایکشن بھی پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد جاری کیا گیا۔

قومی تعلیمی پالیسی کا مُدعا یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے ایک سطح کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ تعلیمی ڈھانچہ ۱۰ + ۲ + ۳ ہے۔ نصاب میں ایک مشترک جزو ہے، جسے نصاب کا بطن یا کور کریکلم کہا گیا ہے۔ اس کے دوسرے اجزا مقامی حالات کے مطابق مختلف ہو سکتے ہیں۔ "بطنِ نصاب" میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی، آئینی فرائض اور وہ مضامین شامل ہیں جو قومی تشخص سے قریبی ربط رکھتے ہیں اور مشترک تمدنی ورثہ، مساوات، جمہوریت، صنفوں کی برابری، ماحول کے تحفظ، دیواروں سے آزاد سماج اور چھوٹے خاندان اور سائنسی نقطۂ نگاہ کو فروغ دیتے ہیں۔ برابری اور برابر مواقع فراہم کرنا اور تعصبات اور بدگمانیوں کو دور کرنا اس نصاب کا ایک اہم نشانہ ہے۔

ابتدائی تعلیم کی ہمہ گیری، تعلیمِ بالغان، سائنسی اور تکنیکی تحقیق کی طرف نئے نظامِ تعلیم کا رُوئے سخن ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت زندگی بھر ساتھ دینے والی تعلیم ہے۔ خانہ دار عورتوں، نوجوانوں، زرعی اور صنعتی محنت کشوں اور پیشہ وروں کو مواقع ملنے چاہئیں زندگی بھر علم حاصل کرنے کے اور وہ بھی اپنی پسند اور سہولت کے مُطابق۔

تعلیم کا موضوع مشترک فہرست میں شامل ہوگیا ہے۔ اس طرح مرکز تعلیمی نظام پر براہِ راست اثرانداز ہوسکتا ہے۔

تعلیمی دستاویز نے ایک پورا باب وقف کیا ہے " برابری کے واسطے تعلیم" کے لیے۔ اور اس ضمن میں تعلیمِ نسواں، اور درج فہرست ذاتوں اور قبائل کی تعلیم، اپاہجوں کی تعلیم، بالغوں کی تعلیم کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ ایک پیراگراف اقلیتوں کی تعلیم کے بارے میں ہے:

" بعض اقلیتی جماعتیں تعلیمی اعتبار سے محروم یا پسماندہ ہیں۔ برابری اور سماجی انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان جماعتوں کی تعلیم کی طرف پہلے سے زیادہ دھیان دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ان اقدامات میں وہ آئینی ضمانتیں شامل ہوں گی جس کے تحت ان کو آزادی ہے کہ اپنے اسکول قائم کریں اور چلائیں، اور ان کی زبانوں اور ثقافتوں کا تحفظ بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ نصابی کتابوں کی تیاری اور معروضی انداز سے کی جائے گی اور اسکولوں کا پروگرام بھی غیر جانبدارانہ ہوگا۔ مشترک قومی مقاصد اور نصب العین کے عرفان کے ذریعہ ایسی یکجہتی کو فروغ دیا جائے گا جو کہ بطنِ نصاب (کور کریکلم) کے مطابق ہو۔

تعلیمِ بالغان کا ایک وسیع پروگرام عمل میں لایا جائے گا تاکہ حرف ناشناسی کو ختم کیا جاسکے، خصوصاً ۱۵ سے ۳۵ سال کی عمر والوں میں کوئی اَن پڑھ باقی نہ رہے۔ اس کے لیے بہت سے قدم اٹھائے جائیں گے جس میں ٹی وی، ریڈیو، فاصلے سے تعلیم، لائبریریاں، ریڈنگ روم اور سیکھنے والوں کی تنظیمیں اور خود خواندگی کے لیے امداد شامل ہیں۔"

قومی تعلیمی پالیسی چھوٹے بچے کے ارتقا پر خاص زور دیتی ہے، خصوصاً ان بچوں

کے ارتقا پر، جو آبادی کے ایسے حصوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں پڑھنے والوں کی پہلی نسل اکثریت میں ہے۔ اس کے لیے خوراک، صحت اور سماجی، ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور جذباتی ارتقا کی فکر ایک ساتھ کی جائے گی۔ ابتدائی طفولیت کی نگہداشت اور تعلیم ([illegible]) کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ ایسے مراکز بھی کھولے جائیں گے جن میں ننھے بچوں کی دن بھر دیکھ بھال ہوگی تاکہ ان کی بہنیں بھی جو اُن کی نگہداشت کی ذمہ دار ہیں تعلیم حاصل کر سکیں۔ ای سی سی ای کے پروگرام میں مقامی لوگوں کو پوری طرح شریک کیا جائے گا۔

ابتدائی تعلیم کا مرکز اور ہدفِ توجہ بچّے کو بنایا جائے گا۔ اُن بچوں کے لیے جو پڑھائی کی پہلی سیڑھی سے تعلق رکھتے ہیں زائد تعلیم کا انصرام ہوگا تاکہ اس کمزوری کی تلافی ہو سکے جسے وہ گھر سے لے کر آتے ہیں۔ اسکولوں کو بہتر بنانے کے لیے ایک مہم شروع کی جائے گی جسے آپریشن بلیک بورڈ یا تختۂ سیاہ کی مہم کا نام دیا گیا ہے۔

ان بچّوں کے لیے جو بیچ میں اسکول چھوڑ بیٹھتے ہیں اور کام کرنے والے بچّوں کے لیے جو اسکول نہیں جا سکتے، غیر رسمی تعلیم فراہم کی جائے گی۔ غیر رسمی تعلیم کے مراکز یعنی این ایف ای (NFE) (Non-Formal Education Centres) کو جدید آلات سے لیس کریں گے۔ مقامی سماج سے لائق اور خدمت آمادہ نوجوانوں اور خواتین کو بہ حیثیت معلّم کے چنا جائے گا۔ اور ان میں سے ان افراد کو جو لیاقت کا ثبوت دیتے ہیں رسمی تعلیم میں داخل ہونے کا موقع مل سکے گا۔ نصاب کے لیے ایک فریم مہیا کیا جائے گا جس میں مقامی حالات کی رعایت کی گئی ہو۔ این ایف ای مراکز کو چلانے کی بیشتر ذمہ داری رضاکارانہ انجمنوں اور پنچایتوں کو سونپیں گے۔

نئی تعلیمی پالیسی ان بچوں کے مسئلہ کے حل کو جو اسکول چھوڑ بیٹھتے ہیں، اولین ترجیح دے گی۔ بڑی دِقّتِ نظر اور جُزرسی کے ساتھ ان بچّوں کی بازیابی اور تعلیم کے لیے حکمتِ عملی مُرتب کی جائے گی۔ اس کوشش کو غیر رسمی تعلیم کے ساتھ بھی جوڑا جائے گا۔ اس بات کی ضمانت کی جائے گی کہ وہ سارے بچّے جو ۱۹۹۰ تک گیارہ سال کے ہو جائیں گے، انھیں

اس وقت تک ۵ سال کی باقاعدہ تعلیم یا غیر رسمی (نان فارمل) تعلیم ضرور مل جائے گی۔ اور ۱۹۹۵ء تک سارے بچّوں کو ۱۴ سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم کا فیض پہنچے گا۔

ثانوی تعلیم میں زیادہ زور استحکام پر ہوگا۔ اسی دور میں بچّوں کو تاریخ کا شعور اور قومی ورثہ کا عرفان حاصل ہوگا۔ اور اس مقصد سے نصاب کی تشکیل ہوگی۔ ثانوی تعلیم دینے والے اداروں کو بڑھایا جائے گا تاکہ ہر جگہ کے رہنے والوں کی ان تک دسترس ہو جائے۔

مثالی اسکول کھولے جائیں گے۔ نمونہ ایک ہی ہوگا لیکن ضروری تبدیلیوں اور تجربوں کی اجازت دی جائے گی۔ ان کا مقصد ہوگا (۱) اکتسابِ فضیلت، عدل اور سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ (۲) ملک کے مختلف حصّوں کے بچوں کو خصوصاً دیہات کے بچوں کو ایک ساتھ رکھیں گے تاکہ قومی یکجہتی کو فروغ ہو، اور ان کے امکانات شکل پذیر ہو جائیں، اور ان مثالی اسکولوں کے ذریعہ ملک بھر کے اسکولوں کو بہتر بنایا جا سکے۔ یہ اسکول اقامتی ہونگے اور بچوں سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جائے گی۔

پیشہ وارانہ تعلیم (ووکیشنل ایجوکیشن Vocational Education) کا اہتمام بہت دھیان اور سلیقہ سے کیا جائے گا۔ یہ کورس عام طور پر ثانوی تعلیم کے بعد دستیاب ہوں گے لیکن اگر ضرورت پڑی تو انھیں آٹھویں جماعت کے بعد بھی لے سکیں گے۔ صنعتی تربیت کے اسکول (آئی ٹی آئی۔ انڈسٹریل ٹریننگ اسکول) پیشہ وارانہ تعلیم کے ملک گیر نظام میں پیوست ہو جائیں گے۔ صحت، زراعت، مارکیٹنگ، سماج سیوا وغیرہ کے لیے بھی ووکیشنل تربیت دی جائے گی۔ ایسے زاویۂ نظر اور ایسی معلومات اور ہنروں کو بڑھاوا دیا جائے گا جو خود روزگاری اور صنعتی و تجارتی پیش قدمی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حکومت عورتوں، دیہاتی اور قبائلی طلبہ اور معاشرہ کے محروم طبقات کا خاص خیال رکھے گی۔

غیر رسمی، لچکدار اور حاجت بستہ پیشہ ورانہ پروگرام کا فائدہ نوخواندوں، ابتدائی تعلیم حاصل کیے ہوئے نوجوانوں، اسکول چھوڑ بیٹھنے والوں اور ان لوگوں کو جو کام میں لگے ہوتے ہیں یا بے روزگار یا نیم روزگار ہیں پہنچایا جائے گا۔

ووکیشنل کورس کے فارغین کے لیے آگے تعلیم کی راہیں کھولی جائیں گی ۱۹۹۰ء تک ثانوی تعلیم کے طلبہ کا دس فی صد اور ۱۹۹۵ء تک ۲۵ فی صد ووکیشنل کورس کرچکا ہوگا۔ ان کو اپنا روزگار شروع کرنے یا روزگار دلانے کے جتن کیے جائیں گے۔

اس بار پالیسی بنانے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بہت غور و فکر اور صلاح و مشورہ کے بعد لائحۂ عمل یا پروگرام آف ایکشن بھی بنایا گیا۔ اس دستاویز کا مقصد یہ ہے کہ ان اقدامات کی صراحت کردی جائے جو نئی تعلیمی پالیسی کی تعمیل کے لیے ضروری ہیں۔ پروگرام کے دکھائے ہوئے خطوط پر اسکیمیں بنائی جائیں گی۔ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مرکز، ریاستوں اور استادوں اور عوام کا اشتراکِ عمل ضروری ہے؛ اور اس کی پیش رفت کی بابت متواتر مشورہ۔ پروگرام کی دستاویز میں لکھا ہے کہ تعلیم کا قومی نظام، " National System of Education " یا (N.S.E) این۔ ایس ای۔ تعلیمی نظام کے اندر جو تفاوت راہ پا گئے ہیں ان کو جڑ سے مٹانا چاہتا ہے، اور سرکاری یا بہ الفاظ دیگر عوامی اسکولوں کے معیار کو اونچا کرنا چاہتا ہے تاکہ عام والدین کو اپنے بچوں کو ایسے پرائیویٹ اسکولوں میں نہ بھیجنا پڑے جہاں بڑی بڑی فیس دینا پڑتی ہیں۔ اسی مقصد کے لیے ضلع تعلیمی بورڈ یا ڈسٹرکٹ بورڈ آف ایجوکیشن، تعلیم و تربیت کے ضلع انسٹی ٹیوٹ (District Institutes of Education + Training) اور دیہی تعلیمی کمیٹیاں (Village Education Committees) بنائی جائیں گی۔

اس وقت ننھے بچوں کے نشو و نما کے لیے Integrated Child Development Services "بچوں کے نشو و نما کی مجموعی اور متحدہ خدمات" نے قابلِ قدر کام کر دکھایا ہے۔ ارادہ ہے کہ آئی سی ڈی ایس پروگرام کے کارکنوں کی تعداد بڑھادی جائے۔ نگہداشت اطفال میں کام کرنے والوں کو بالآخر پرائمری اسکول کے استادوں کے برابر لایا جائے گا۔ اس پروگرام کے تحت جن طبقات کی طرف خصوصی دھیان دیا جائے گا ان میں گندی بستیوں کے مکین، اہلِ حرفہ کے خاندان، اور غیر منظم صنعتوں میں کام کرنے والے مزدور بچے شامل ہیں۔ ہدف یہ ہے کہ ساتویں منصوبہ کے خاتمہ تک صفر سے ۶ سال تک کے بچوں کے لیے

نگہداشت و تعلیم (ای سی سی ای) کی سہولتیں قبائلی بلاکوں، اور ان بلاکوں میں جہاں درج فہرست ذاتوں (شیڈیولڈ کاسٹس) کی معتد بہ تعداد ہے، اور بڑے شہروں کی گندی بستیوں میں فراہم کردی جائیں۔ ۱۹۹۰ء تک کم سے کم ڈھائی لاکھ مراکز مزید کھل جانے چاہئیں۔ "آئی سی ڈی ایس" یا Integrated Child Development Services کے علاوہ قبلِ ابتدائی (پری پرائمری) اور روزینہ نگہداشت (Day-care) کے مراکز کو اس ضمن میں بڑھاوا دیا جائے گا اور ان کی مدد سرکار کرے گی۔

ای سی ای مرکزوں میں صحت اور غذا کے پروگراموں کا اضافہ کیا جائے گا اور استادوں کی تربیت، اور تعلیمی مسالہ کی فراہمی کا انتظام ہوگا۔

جہاں تک میڈیا کا تعلق ہے ٹی وی، دوردرشن، آکاش وانی، این سی ای آر ٹی وغیرہ اہم علاقائی زبانوں میں سافٹ ویئر یا پروگرام تیار کریں گے۔

مانیٹرنگ یا نفاذ و تعمیل کا متواتر جائزہ لینے کے طریقے اپنائے جائیں گے۔

ابتدائی اور غیر رسمی تعلیم کے ضمن میں "عملی پروگرام" میں تجویز کی گئی ہے کہ ان بچوں کے لیے جو کام کرنے کی وجہ سے اسکول نہیں جا سکتے یا جن کے گھروں سے اسکول بہت دور ہیں، بڑے پیمانے پر غیر رسمی تعلیم کا نظام برپا کیا جائے گا۔

نفاذ یا تعمیل کی حکمتِ عملی کا مرکزی وصف ہوگا علاقہ وار اور آبادی وار منصوبہ سازی کرنا۔ ان بچوں کا جو اسکول سے باہر ہیں ۷۵ فی صد حصہ ۹ ریاستوں یعنی آندھرا پردیش، آسام، بہار، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، اُڑیسہ، راجستھان، اُترپردیش اور مغربی بنگال میں ہے۔ ان ریاستوں کو تعلیمی اعتبار سے پسماندہ تسلیم کیا گیا ہے۔ دوسری ریاستوں اور خود ان ریاستوں میں زیادہ پچھڑے ہوئے علاقے بھی ہیں جن پر خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ ملک، کامن اسکول سسٹم یعنی عام اچھے اسکولوں کے ہمہ گیر نظام کی طرف بڑھے گا۔ اسکولوں کے سُدھار کا پروگرام ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشے تک پھیلا دیا جائے گا۔ "یو ای ای" یونیورسل ایلیمنٹری ایجوکیشن یا ہمہ گیر ابتدائی تعلیم کی ہر منزل پر مقامی لوگوں کو شریک کیا جائے گا اور اربابِ تعلیم مقامی سوسائٹی کے رُوبرو جواب دہ ہوں گے۔ نئے اسکول ہر

اس جگہ کھولے جائیں گے، جہاں پچاس بچوں کے داخلے کا امکان ہو۔ یہ کام تعلیمی نقشے اور مقامی آبادی کے اعداد و شمار کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ درج فہرست قبائل اور ذاتوں اور دوسرے محروم طبقوں کے لیے اقامتی اسکول اور بورڈنگ کھلیں گے۔ آشرم اسکولوں کے پروگرام کو بہتر بنایا جائے گا۔ مقامی آبادی کے افراد اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے استادوں کے ساتھ گھر گھر جائیں گے۔ ان سارے خاندانوں کی لڑکیوں کو جو غریبی کی لکیر سے نیچے ہیں، مفت کتابیں، کاپیاں، دو جوڑے یونیفارم اور دوسری ہمت افزا امداد دی جائے گی۔ جو بچے ابتدائی اسکولوں میں پڑھتے ہیں انھیں ریاستی بسوں میں بغیر کرایہ دیے اسکول لے جایا اور وہاں سے گھر لایا جائے گا۔ ان اسکولوں، استادوں، دیہاتوں اور غیر رسمی تعلیمی مراکز کو جو بچوں کو گھر بیٹھنے سے روکیں گے، قابل لحاظ انعام دیے جائیں گے۔ وہ لوگ جو بچوں سے اپنے کارخانوں میں کام لیتے ہیں قانوناً مجبور کیے جائیں گے کہ انھیں آرام، خوراک اور جز وقتی تعلیم دیں۔ مقامی عوام اور والدین کے حسب اطمینان "یو ای ای" ہمہ گیر ابتدائی تعلیم کا پروگرام چلایا جائے گا۔

غیر رسمی یا نان فارمل تعلیم کا فائدہ تعلیم نسواں کو بالخصوص پہنچے گا۔ جہاں کہیں ممکن ہوگا اس کے لیے انسٹرکٹر خواتین رکھی جائیں گی۔ ہر بیس پچیس مراکز پر ایک نگراں یا سپروائزر کا تقرر ہوگا۔ ۱۰۰ مرکز مل کر ایک پروجیکٹ بنائیں گے جو بالعموم ایک بلاک پر حاوی ہوگا۔ "این، ایف ای" اور "تعلیم بالغان" کی انتظامی اور نگرانی سطح، جہاں ممکن ہوگا، ملا دی جائے گی۔ رضا کارانہ خدمت کرنے والی ایجنسیوں کو غیر رسمی تعلیم کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ ان کی امداد کی تجاویز عطیات دینے والی ایک کمیٹی کی نظر سے گزریں گی اور جب کبھی ضرورت ہوگی تو رضا کار یا والنٹری ایجنسیوں (وی اے؛ V.A.) کو کمیٹی سے گفتگو کے لیے بلا بھی لیں گے۔ اُن کی ابتدائی تجاویز جن کی میعاد ۳ یا ۴ سال ہوگی، ریاستی حکومت کے ذریعہ مرکز کو بھیجی جائیں گی، اور بعد کی تجاویز براہِ راست۔

ضرورت مند بچوں خصوصاً کام کرنے والے بچوں کو وظائف دیے جائیں گے تاکہ وہ رسمی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ ان بچوں کے لیے جو غیر رسمی دھارا سے فارغ ہوتے ہیں،

پیشہ ورانہ (ووکیشنل) اور ٹیکنیکل تعلیم و تربیت کے بہت سے نصاب مرتب ہوں گے۔

ساتویں پنج سالہ منصوبے میں، چھٹے منصوبے کی طرح، تعلیمی اعتبار سے پچھڑی ہوئی نو ریاستوں میں حسبِ ذیل ڈھنگ سے امداد دی جائے گی۔

۱- ریاستوں کو نان فارمل مراکز قائم کرنے اور چلانے کے لیے ۵۰ : ۵۰ کی شرح سے امداد۔ ان مراکز میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تعلیم پائیں گے۔

۲- صرف لڑکیوں کے لیے نان فارمل (غیر رسمی) تعلیم کے مراکز قائم کرنے اور چلانے کے لیے مرکز ریاست کو ۱۰ : ۹۰ کی شرح سے امداد دے گا۔

۳- رضا کار یا والنٹری ایجنسیوں کو نان فارمل تعلیم کے مراکز کھولنے اور چلانے کے لیے مرکز ۱۰۰ فی صد امداد دے گا۔

تعلیمی اعتبار سے ترقی یافتہ ریاستوں میں منجملہ دوسروں کے ان بچوں کو بھی ان اسکولوں کا فائدہ ملے گا جو یا تو سلمس یا گندی بستیوں میں رہتے ہیں یا کام کرتے ہیں۔

ہمہ گیر تعلیم (یا یونیورسل ایجوکیشن۔ "یو ای") کی پیش رفت اور کیفیت (کوالٹی) کے احتساب اور مانیٹرنگ کا بہت مضبوط انتظام ہوگا۔ مقامی سماج کو اس احتساب میں شریک کیا جائے گا۔

ثانوی تعلیم اور "نادودیہ" یا نئی طرز کے مثالی اسکولوں کے سلسلہ میں "عملی پروگرام" کی دستاویز منجملہ دوسری باتوں کے، کہتی ہے کہ ہر ریاست میں ایک نقشہ یہ دکھانے کے لیے بنایا جائے گا کہ اسکول اس وقت کہاں کہاں ہیں اور کون سی ایسی جگہیں ہیں جو اسکول سے محروم ہیں اور جہاں اسکول کھلنے چاہئیں۔ اس پلاننگ یا منصوبہ سازی میں لڑکیوں کے اسکولوں اور پچھڑے ہوئے کو اوّلیت ملے گی۔ کوٹھاری کمیشن کی سفارش کے مطابق پرائمری اور اپر پرائمری اسکولوں کا باہمی تناسب ۱ : ۳ رکھا جائے گا۔ اس پروگرام کو عملی جامہ "نیپا" (NIEPA یا National Institute of Educational Planning & Administration تعلیمی منصوبہ سازی و تعلیمی اہتمام کا قومی انسٹی ٹیوٹ) ایس سی ای آر ٹی (State Council of Educational Research & Training

یا تعلیمی تحقیق و تربیت کی ریاستی کونسل) کے تعاون سے پہنائے گا۔ ۲۰۰۰ء تک کوئی علاقہ بغیر اسکول کے باقی نہ رہے گا۔ اوپن یا آزاد اسکول ان لوگوں کے لیے قائم کیے جائیں گے، جن کی ابتدائی تعلیم غیر رسمی ڈھنگ سے ہوئی ہے۔

ناوودیہ اسکول، جو بہت ہی ہونہار اور کارگزار بچوں کے لیے مخصوص ہے، ہر ضلع میں کھولا جائے گا۔ اس میں ۷۵ فی صد بچے دیہات کے ہوں گے۔ کوشش ہوگی کہ اسکول کی آبادی کا ایک تہائی لڑکیوں پر مشتمل ہو۔

ان ذہین لڑکوں کے لیے جن کی لیاقت بعض مضامین میں بہت اچھی اور بعض میں معمولی ہے، الگ انتظام کیا جائے گا تاکہ ان کی صلاحیتیں بروئے کار آسکیں۔

"عمل پروگرام" میں ووکیشنل یا پیشہ ورانہ تعلیم کے منصوبہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ ہم یہاں صرف یہ کہہ کر آگے بڑھیں گے کہ "جے سی وی ای" "ایس سی وی ای" اور متعلقہ ریاستی شعبے عورتوں، قبائلیوں اور اپاہجوں، مدد کرنے والی رضاکار تنظیموں کی نشاندہی اور مدد کریں گے۔

عورتوں کو برابری دینے کے لیے تعلیم :-

ہماری اَن پڑھ آبادی کا ۷۵ % عورتیں ہیں اور جو بچے اسکولوں میں داخلہ نہیں لیتے ان میں ۷۰ % لڑکیاں ہیں۔

نشانے :-

۱۔ ۱۹۹۰ء تک لڑکیوں میں پرائمری تعلیم ہمہ گیر ہو جانی چاہیے اور ۱۹۹۵ء تک ابتدائی (ایلیمنٹری) تعلیم۔

۲۔ ۱۹۹۵ء تک ۱۵ سے ۳۵ سال عمر کی عورتوں کے لیے (جس کی تعداد تخمیناً ۸ کروڑ ہے) تعلیم بالغان۔

۳۔ ووکیشنل، ٹکنیکل اور پروفیشنل تعلیم تک عورتوں کی رسائی میں اضافہ۔

۴۔ تعلیمی نظام پر نظرِ ثانی اور اس کی تنظیمِ نو تاکہ عورتوں کو ہر طرح سے برابر لایا جاسکے۔

"پروگرام" نے عورتوں کے مرتبہ، طاقت، اہمیت اور اختیار کو بڑھانے کے لیے بہت سی تجاویز رکھی ہیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ اساتذہ کے تقرر میں عورتوں کو ترجیح دی جائے۔

ملک میں ۱۰۴ آئی ٹی آئی (انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ) یا صنعتی تربیت کے ادارے لڑکیوں کے لیے مخصوص ہیں اور عام صنعتی تربیت کے اداروں میں ۹۷ ونگ لڑکیوں کے لیے مختص کر دیے گئے ہیں۔ اس پروگرام کو نئی تنظیم اور تقویت دی جائے گی۔

"عملی پروگرام" کا ایک باب "اقلیتوں کی تعلیم" کے لیے وقف ہے۔ یہ باب دستور کے آرٹیکل ۲۹، ۳۰ اور الف ۳۵۰ کے حوالے سے شروع ہوتا ہے اور یہ اعتراف کرتا ہے کہ ان آرٹیکلوں کی دی ہوئی ضمانتوں کی تعمیل ناہموار رہی ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق مذہبی اقلیتیں کُل ملا کر ہندوستان کی آبادی کا ۱۷،۴۴ فی صد ہیں: مسلمان ۱۱،۴۲٪، عیسائی ۲،۴۴٪، سکھ ۲٪، بدھ ۰،۷٪ اور جین ۰،۵۲٪۔ وزارتِ داخلہ نے قومی سطح پر مسلمانوں اور نو بدھوں کو تعلیمی اعتبار سے پسماندہ تسلیم کیا ہے۔ خاص اقدامات کی ضرورت ہے ان پچھڑی ہوئی اقلیتوں کو بقیہ سماج کے برابر لانے کی تاکہ وہ قومی ترقیاتی کارروائی میں پوری طرح حصہ لے سکیں۔

۸۶-۸۷ کے لیے پروگرام:-

۱- دس کمیونیٹی پالی ٹیکنیکوں کے ذریعہ ان علاقوں میں ٹیکنیکل مہارت بہم پہنچانا جہاں اقلیتوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔

۲- نصاب کی کتابوں کا جائزہ اور تخمینہ قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے۔ یہ کام این سی ای آر ٹی نے شروع کیا ہے۔

۳- اقلیت کے تعلیمی اداروں کے منیجروں اور پرنسپلوں کے زاویۂ نگاہ کو نئے رُخ دینے اور استادوں کی تربیت کا پروگرام جسے "این سی ای آر ٹی" بتدریج عمل میں لائے گی۔

۴- یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی وہ اسکیم جس کے تحت یونیورسٹیوں اور کالجوں کو تعلیمی اعتبار سے پسماندہ طالب علموں کو مقابلہ کے امتحانوں کے لیے تیار کرنے کے واسطے امداد دی جاتی ہے۔

ساتویں پلان کے بقیہ تین سالوں کے لیے پروگرام
(۸۸-۸۷ لغایت ۹۰-۸۹):

مذکورہ بالا اسکیمیں جاری رہیں گی۔ علاوہ بریں این سی ای آر ٹی، ڈیپارٹمنٹ آف ویلفیر (شعبۂ فلاح) اور شعبۂ تعلیم مشورہ کر رہے ہیں علی گڑھ، کشمیر، عثمانیہ اور مراٹھواڑا یونیورسٹیوں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلروں سے ریسورس سنٹروں (Resource Centres) یا مراکز وسائل و تدبیر کے متعلق۔ یہ مراکز اپنے حلقہ کے اقلیتی تعلیمی اداروں کو تربیت و ہدایت دیں گے۔ ساتویں پلان کے لیے ان مراکز کو چلانے کے واسطے ۶۵ لاکھ روپے کی مانگ کی گئی ہے۔ اس پلان میں اقلیتوں کی آبادی کے لیے ۵ مزید پالی ٹیکنک قائم کیے جائیں گے

طویل مدتی پروگرام:-

روایتی وضع کے اسکولوں میں سائنس، ریاضی اور انگریزی پڑھانے کے سلسلہ میں کوشش کی جائے گی۔ جہاں کہیں ممکن ہوگا "ابتدائی طفولیت کے تعلیمی ادارے" (ای ای سی) مذکورہ اسکولوں اور ان علاقوں میں کھولے جائیں گے جہاں اقلیتوں کی کثیر آبادی ہے۔ ان اداروں میں سماجی اعتبار سے کارآمد اور پیداواری کام شروع کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے شعبۂ تعلیم ایک مرکزی اسکیم تیار کرے گا۔

پرائمری تعلیم:-

۱۔ تعلیمی سہولتوں کے بارہ میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کو جن اعداد و شمار کی ضرورت رہتی ہے، ان کی فراہمی کا مستقل انتظام ہوگا۔ یہ کام ریاستی حکومتوں پر چھوڑا گیا ہے۔

۲۔ لسانی اقلیتوں کے لیے استادوں کی منظوری اور تقرریں جو دیر ہوتی ہے اس کو دور کرنے کے لیے ریاستی حکومتیں یہ اختیارات ضلع کلکٹر کو تفویض کر دیں گی۔

۳۔ اقلیتی زبانوں میں نصابی کتابوں کی دستیابی کا جائزہ اور ان زبانوں میں کتابوں کے چھپنے کا انتظام۔ یہ کام بھی ریاستی حکومتوں کے کرنے کا ہے۔

۴۔ اقلیتی زبانوں کے استادوں کے لیے ٹریننگ کی سہولتوں کا جائزہ اور جہاں ضروری

ہو، وہاں ان سہولتوں میں اضافہ کرنے کے لیے اقدام۔

۵۔ کوشش کی جائے گی کہ نصابی وقت کا ۱۵ فی صد مقامی حرفتوں اور ہنروں پر صرف کیا جائے اور اہلِ حرفہ اور مزدوروں کے بچوں کے لیے شام کے کلاس شروع کیے جائیں۔

متوسط اور اعلیٰ ثانوی تعلیم (مڈل اور ھایر سکنڈری ایجوکیشن):

ایس سی ای آر ٹی (اسٹیٹ کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، یا تعلیمی تحقیق و تربیت کی ریاستی کونسل) اور دوسرے ریسورس مراکز اور ریاست کے ہدایتی ادارے اقلیتی اسکولوں/کالجوں میں سائنس، ریاضی، سماجی علوم (سوشل سائنسز) انگریزی، اور کیریر کی رہنمائی والے استادوں کو ٹریننگ دیں گے۔ فی الحال این سی ای آر ٹی یہ کام کر رہی ہے۔

۲۔ ایس سی ای آر ٹی کے ذریعہ اقلیتی اداروں کے منیجروں اور پرنسپلوں کو جدید تعلیمی طریقوں سے باخبر کیا جائے گا۔ یہ کام بھی فی الحال این سی ای آر ٹی چھوٹے پیمانے پر کر رہی ہے۔

۳۔ اقلیتی اداروں میں، قومی یکجہتی کی خاطر، علاقائی زبان کے استادوں کا تقرر، سہ لسانی فارمولے کے تحت۔

۴۔ اقلیتی اداروں میں طالب علموں کی کمزوری دور کرنے کے لیے کوچنگ یا خصوصی تدریس۔ یہ کام بھی ریاستی حکومتیں انجام دیں گی۔

۵۔ کمپیوٹر سے ابتدائی آگاہی کی اسکیم میں اقلیتی اداروں کو معقول حصہ ملے گا۔

ووکیشنل اور ٹیکنیکل تعلیم:۔

ان ہایر سکنڈری اسکولوں میں جو تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کو خاص طور پر فیض پہنچاتے ہیں، ووکیشنل کورسوں کا اجرا۔

۲۔ اس بات کا اطمینان کر لینا کہ اقلیتی ادارے، ووکیشنل اور ٹکنیکل تعلیم سے پورا فائدہ اٹھائیں۔

۳۔ ان علاقوں یا بلاکوں میں جہاں اقلیتی آبادی کی کثرت ہے، کرافٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹس کا قیام، اس التزام کے ساتھ کہ ۸۰ فی صد جگہیں اہلِ حرفہ یا کاریگروں کے بچوں کے لیے ریزرو کر دی جائیں۔

عورتوں کی تعلیم : (۱) چونکہ عورتوں کی حرف شناسی اور لڑکیوں کے داخلہ کی شرح تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں میں سب سے کم ہے، اس لیے لڑکیوں کے اسکولوں کے کھولنے، خواتین ٹیچرس کے تقرر، لڑکیوں کے ہوسٹلوں کی تعمیر اور حصولِ علم کے لیے اس قسم کی ترغیبات جیسے دن کے کھانے اور یونیفارم کا اہتمام ان سب میں اقلیتوں کی عورتوں کی پوری طرح تشفی ہونی چاہیے۔

۲۔ اقلیتوں کی کثیر آبادی والے ہر ضلع میں حرفہ و ہنر میں لڑکیوں کو ٹریننگ دینے والے پروڈکشن کم ٹریننگ سنٹر (پیداواری و تربیتی مرکز) کا کھولا جانا۔ جہاں تک ممکن ہو ان میں خواتین ٹیچر رکھی جائیں۔ یہ کام بھی ریاستی حکومتیں کریں گی۔

تعلیمِ بالغاں اور ننھے بچوں کی تعلیم کی رضا کارانہ تلقین کے لیے اقلیتوں کے پیشہ وروں کو تربیت دی جائے؛ ہر اقلیتی ادارے کے ساتھ ایک مرکز کو منسلک کر دینا تاکہ ان اسکیموں سے لوگ آگاہ ہو جائیں اور نگرانوں یا سپر دائزروں کو تربیت دی جا سکے۔ یہ کام بھی ریاستی سرکاریں کریں گی۔

لائبریریاں، ریڈنگ روم اور اکسٹینشن کا (توسیعی) کام :

اقلیتی علاقوں میں لائبریریاں اور ریڈنگ روم کھولے جائیں گے؛ کچھ علاقوں میں تجربہ کے طور پر تعلیم کی توسیع کا کام پائلٹ پروجیکٹ کے طور پر۔ یہ کام بھی ریاستی سرکاریں کریں گی اور اس کے لیے وسائل کا ان کی طرف سے معقول انتظام ہوگا۔

اقلیتوں کے زیرِ اہتمام تعلیمی ادارے :

۱۔ ان اسکولوں کو تسلیم کرنے اور درخواستوں پر بلا تاخیر فیصلہ کرنے کے لیے واضح رہنما خطوط اور ہدایات۔ ہر ریاست اسکولوں کو تسلیم کرنے کے بارے میں پالیسی بنائے گی اور اسے اچھی طرح مشتہر کرے گی۔

۲۔ ان پروگراموں کی صحیح تعمیل اور نفاذ کے لیے مانیٹرنگ کا مؤثر انتظام ہونا چاہیے۔

۳ - اقلیتی اداروں کا ایک ریاست گیر فیڈریشن یا وفاق کا قیام تاکہ اقلیتی اداروں کا تعاون تعلیمی ترقی کے اقدامات کے نفاذ اور ضروری انفرا اسٹرکچر کی فراہمی، تعلیمی معیاروں کے برقرار رکھنے اور اساتذہ کے مفاد کی حفاظت کے لیے حاصل کیا جا سکے - ان جماعتوں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے اور ان کو مالی امداد دی جائے -

---

علاقائی کیفیت کا لحاظ (ایریا اَیپروچ) :

نئے اسکول کھولتے وقت اقلیتی کثرت کے چالیس اضلاع کا لحاظ رکھنا ہوگا، تاکہ اقلیتی بچّوں کی رسائی تعلیم گاہوں تک بخوبی ہو سکے - وہ چالیس اضلاع حسبِ ذیل ہیں :

ریاست		اضلاع
اُترپردیش	:	رامپور، بجنور، مرادآباد، سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، بہرائچ گونڈہ، غازی آباد، پیلی بھیت، دیوریا، بارہ بنکی، بستی -
مغربی بنگال	:	مرشدآباد، مالدہ، مغربی دیناج پور، بیربھوم، ندیا، ۲۴ پرگنے، کوچ بہار، ہاوڑا -
کیرلا	:	ملاپورم، کوزی کھوڈ، کنانور، پالگھاٹ، ویاناڈ -
بہار	:	پورنیا، کٹیہار، دربھنگا -
کرناٹکا	:	بیدر، گلبرگہ، بیجاپور -
مہاراشٹر	:	بڑا بمبئی (گریٹر بامبے)، اورنگ آباد -
ہریانہ	:	گوڑگاؤں -
مدھیہ پردیش	:	بھوپال -
راجستھان	:	جیسلمیر -
گجرات	:	کچھ

کمزور طبقات کے لیے صلاحیت اور ذرائع (میرٹ کم مینس) کی بنیاد پر وظائف کی اسکیم جس کے تحت اچھے اداروں میں داخلے کی ضمانت بھی ہو، فیس معاف کی جائے

یا فیس میں رعایت دی جائے، اور اہلِ حرفہ اور دوسرے کمزور ورگوں کو اس مزدوری کے نقصان کا معاوضہ دیا جائے جو ان کا بچّہ اسکول جانے کی وجہ سے کر نہ سکا۔ یہ اسکیم بھی ریاستی حکومتیں عمل میں لائیں گی۔

تنظیمی اور انتظامی مسائل :

۱۔ بنیادی یا ابتدائی جائزے (یا سروے) اور ان کے بعد معیّن وقفوں کے ساتھ ایسے سروے جن سے پڑھے لکھوں کی تعداد اور تعلیمی اکتسابات میں اضافہ کی رفتار معلوم ہوتی رہے؛ مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مطالعے یا ریسرچ اسٹڈیز، تاکہ ان اقدامات کو جن کا مُدعا کمزوریاں دُور کرنا ہے، بہتر بنایا جاسکے۔ بالخصوص اقلیتی علاقوں میں اسکولوں کے تناسب کی اصلاح۔ یہ کام بھی ریاستی سرکاریں انجام دیں گی۔

۲۔ تعلیمی اعتبار سے پچھڑی ہوئی اقلیتوں کی مؤثر نمائندگی تعلیمی بورڈوں اور صلاح کار کمیٹیوں پر، مرکز اور ریاستوں میں ہوگی۔

۳۔ مذکورہ بالا اقدامات کی مؤثر تعمیل سے باخبر رہنے (کو مانیٹر کرنے) کے لیے مرکز کے اور ریاست کے شعبہ ہائے تعلیم میں ایک اکائی (یا سیل) قائم کیا جائے گا۔

۴۔ ہر سال اقلیتی سے متعلق پروگراموں پر نظرِ ثانی (ریویو) کی جائے گی۔

تعلیم بالغان :

۱۹۵۱ء اور ۱۹۸۱ء کے درمیان خواندگی کی شرح ۱۶٫۶۷ سے بڑھ کر ۳۶٫۲۷ فی صد ہوگئی لیکن اس عرصے میں اَن پڑھوں کی تعداد ۳۰ کروڑ سے ۴۳٫۷ کروڑ ہوگئی۔

نئی پالیسی ۱۵ سے ۳۵ سال کی عمر والے دس کروڑ انسانوں کو تعلیم بالغاں کا فائدہ پہنچائے گی۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ بالغوں کی تعلیم پُرکشش اور کامیاب تبھی ہو سکتی ہے جب اس کے ساتھ وہ اطلاعات اور ہنر اور مہارتیں بھی ہوں، جو بالغ طالبِ علم کے پیشے یا کاروبار کو فائدہ پہنچا سکیں۔ اس کے علاوہ " این پی اے ای " (نیشنل پروگرام

آف ایڈلٹ ایجوکیشن) یا "تعلیم بالغاں کا قومی پروگرام" قومی نشان اور وکاس
اور ترقی کے پروگراموں سے آگاہی اور ظلم سے نجات کے شعور پر زور دے گا۔ طے کیا
گیا ہے کہ تعلیم بالغاں کی رفتار اور ماحول کو بہتر بنانے کے لیے سائنس اور ٹکنولوجی
کا استعمال اور طریق تعلیم (پیڈاگوجی) میں تحقیق کی جائے گی۔ وکاس کے پروگراموں
سے تعلیم بالغان کا ناتہ جوڑیں گے۔ کاروباری خواندگی (فنکشنل لٹریسی) کا ایک
زبردست ہمہ گیر پروگرام شروع کیا جائے گا۔ عوام کا مکمل تعاون اس پروگرام کی
کامیابی کے لیے حاصل کیا جائے گا۔ سارا تعلیمی نظام اس مہم کی کامیابی کا بیڑا
اٹھائے گا۔ "آر ایف ایل پی (RFLP) یا Rural Functional
Literacy Projects (دیہی کاروباری خواندگی کے پروجیکٹ)
اور SAEP (State Adult Education Programme) یا تعلیم بالغاں کے ریاستی پروگراموں
کو مضبوط کیا جائے گا۔ معلمات کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ رضا کار ایجنسیوں کا تعاون
زیادہ حاصل کیا جائے گا اور انھیں اپنے طور سے پروگرام کو چلانے کی آزادی ہوگی
مزدوروں کی تعلیم کے پروگراموں پر نظر ثانی کی جائے گی۔ شرمک ودیاپیٹھ
مزدور عورتوں اور بچوں اور دیہاتی مزدوروں کی طرف زیادہ دھیان دیں گے "سنٹرل
بورڈ آف ورکرز ایجوکیشن" یا "مزدوروں اور محنت کشوں کی تعلیم کا مرکزی بورڈ" خواندگی
یا ابھرتا اور مزدوروں کی تعلیم کے پروگرام اپنے ہاتھ میں لے گا۔ ایمپلائر یا آجر کو (اگر
ضرورت ہوئی تو قانون کے ذریعے) آمادہ کیا جائے گا کہ اپنے مامورین، ماجورین یا ورکرز
کے لیے خواندگی اور مہارت کو بڑھانے کے پروگراموں کا اہتمام کریں۔ تعلیمی اداروں کو
ناخواندگی مٹانے کے لیے معقول مدد اور رشد دی جائے گی۔

تعلیم کو جاری رکھنا (Continuing Education): دیہات میں
۵۰۰ کی آبادی کے لیے ایک جن شکشن نلایم (عوامی تعلیمی مرکز) کھولا جائے گا۔ جے
ایس این "J.S.N." کو تعلیم بالغاں اور غیر رسمی تعلیم کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔
اسکول کی عمارت یا پنچایت گھر میں اس کے تحت لائبریری، ریڈنگ روم، چرچا

منڈل، ثقافتی سرگرمیاں فراہم کی جائیں گی۔ تعلیم اور تفریح کے مقاصد کے لیے ریڈیو، دور درشن، اور فلموں کو بروئے کار لائیں گے۔

میں نے نئی تعلیمی پالیسی کا ذکر بالقصد تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ "نئی تعلیمی پالیسی" اور "عملی پروگرام" دونوں دستاویزوں کے ایسے حصّوں سے اقتباس لیے گئے ہیں، جن کا فائدہ اقلیتیں براہِ راست اُٹھا سکتی ہیں۔ ایک راہ اس مطالعہ سے یہ بھی نکلتی ہے کہ پسماندہ اقلیتوں کے لیے مذکورہ اقدامات کے علاوہ بہت سے امدادی قدم اور اُٹھائے جانے چاہیے تھے۔ اس کی طرف علیٰحدہ توجّہ کی جائے گی، حالانکہ اس کا وقت جب تھا جب "تعلیم کا چیلنج" شائع ہوا تھا اور اس کے بعد جب "نئی تعلیمی پالیسی" بنی تھی، اور اس کے بعد جب "عملی پروگرام" کی تشکیل ہوئی اور وہ ایوان میں پیش کیا گیا۔ تھوڑا بہت جو کچھ آخری دونوں دستاویزوں میں راہ پاگیا ہے، وہ سیمناروں میں اس مسئلہ کو پے در پے اُٹھانے کا نتیجہ ہے۔ بڑی ضرورت اس وقت اس بات کی ہے کہ لمحہ کی نزاکت اور تعلیمی پالیسی کی غیر معمولی اہمیت کا احساس مسلمانوں کو ہو جائے اور وہ آگے بڑھ کر اس پالیسی کا پورا پورا فائدہ اٹھائیں، اور اس کے نفاذ میں حتی الامکان حصّہ لیں۔ ابھی تک یہ ہوتا رہا ہے کہ زیادہ تر عمّال کی بے رُخی اور کمتر ہماری بے حسی کی وجہ سے نہ صرف عام فائدہ کی پالیسیوں اور اسکیموں کا فائدہ ہمیں برائے نام ملا ہے بلکہ ان اسکیموں اور پروگراموں کی منفعت سے بھی جو ہمارے لیے وضع ہوئیں، ہم کم و بیش محروم رہے۔ بہت بڑی احتیاج اس وقت اس بات کی ہے کہ ہم میں سے ہر شہر اور ضلع اور راجدھانیوں میں کچھ لوگ ایسے ہوں جو تعلیمی پالیسی اور پروگرام کی سطر سطر سے واقف ہوں، اور جو برابر نگاہ رکھیں کہ پالیسی اور پروگرام کا پورا فائدہ ہمیں پہنچے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مقابلے کے امتحانوں کے لیے کوچنگ کی اسکیم جو ہمارے لیے چلائی گئی تھی غلط ہاتھوں اور غلط مرکزوں میں پہنچ جانے اور کچھ خود ہماری بے خبری یا بے حسی

کی وجہ سے ابھی تک ہمارے کچھ کام نہیں آئی (اُسے راہ پر لانے کی کوششیں جاری ہیں)۔ این سی ای آر ٹی کی ریسورس سنٹروں کی جو اسکیم اساتذہ کی صلاحیتوں میں اضافے کے لیے شروع کی گئی، وہ ابھی تک حکومت کی مالی منظوری کا انتظار کر رہی ہے اور ایسی یونیورسٹیاں جیسے علی گڑھ اور جامعہ، بددل ہونے لگی ہیں۔ اگر ہم نے تنظیمیں برپا نہیں کیں اور ان پروگراموں اور اسکیموں کے طرزِ نفاذ کو برابر زیرِ نظر نہیں رکھا تو ہم یہ دیکھیں گے کہ ہم عمومی اور خصوصی دونوں پروگراموں کے فائدے سے محروم رہ جائیں گے اور مُلک کے دوسرے طبقات تعلیم، اور اس کے نتیجے میں، دوسرے شعبوں میں، ہم سے اور زیادہ نکل جائیں گے۔ ہم مُلک کی تعلیم و ترقی میں اتنا بھی حصّہ نہیں لے سکیں گے جتنا اب تک لیا ہے، اور ان سے وہ قلیل فائدہ بھی نہ اُٹھا سکیں گے، جو اب تک اُٹھایا ہے۔ آپ اگر عزّت کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو علم کا دامن مضبوطی سے پکڑ لیجیے اور تعلیمی پروگراموں میں بڑھ چڑھ کے شرکت کیجیے اور ان پر اثر انداز ہوئیے۔ یہ خطرہ ہر وقت پیشِ نظر ہونا چاہیے کہ بعض تنگ نظر اہلکار دورانِ نفاذِ پالیسی اور پروگرام کے رُخ کو اس طرح بدل سکتے ہیں کہ نفع کے بجائے ہمیں نقصان پہنچے۔ یوپی کے بعض مراکز میں نئی پالیسی کے تحت اخلاقی تعلیم دینے کا جو انتظام کیا گیا ہے، وہ سخت قابلِ اعتراض ہے۔ اس کا نتیجہ یا تو گمراہی ہوگا، یا مسلمانوں کا جدید تعلیم سے برگشتہ ہو جانا۔ اس طرح کے اقدامات سے مسلمانوں میں اس علیحدگی پسندی اور کنارہ کشی کو شہ ملے گی، جس کی عام طور پر، بغیر اسباب میں جائے، شکایت کی جاتی ہے۔ نفاذ کے انحرافات کو فوراً ریاستی اور مرکزی حکومت کے علم میں دلائل کے ساتھ لانا چاہیے۔

ایک بات اس بارے میں اور درخورِ التفات ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت جو پروگرام اور اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں اور چلائی جائیں گی، ان میں روزگار کے بہت سے مواقع نکلیں گے۔ ان میں ہمیں انصاف، قومی یکجہتی، اور پروگرام کی قبولیت اور کامیابی، ان سب کی رُو سے پورا حصّہ ملنا چاہیے۔ ہمیں اس بات پر نظر رکھنی اور اس مطالبہ

کو زبان دینی چاہیے۔ نیشنل انٹیگریشن اور ہندوستان کے ثقافتی ورثہ اور جدّوجہدِ آزادی کو ہمارے نئے نظامِ تعلیم میں مرکزی مقام دیا گیا ہے۔ یہ بات برمحل اور قابلِ ستایش ہے۔ لیکن ہمیں چوکنّا رہنا چاہیے کہیں وہ لوگ جو فراخ دلانہ اور وسیع مشرب قومی پالیسی سے دلی اتفاق نہیں رکھتے، عصبیت کو راہ نہ دے دیں اور ایسا مواد اس میں داخل نہ کر دیں جو اسلام کے خلاف ہو یا مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرتا ہو۔ ہمیں اس پر نگاہ رکھنے کے لیے پڑھے لکھے اور باخبر لوگوں کی ایک انجمن بنانی چاہیے۔ ہمیں خود بھی ان تینوں موضوعات پر اپنے مؤرخین اور سماجی عالموں اور روشن خیال غیر مسلم اہلِ قلم سے لکھوانا چاہیے۔ یاد رکھیے کہ جو باتیں اب نصاب میں داخل ہو جائیں گی، وہ ہمارے بچّوں کے ذہن اور عقائد پر براہِ راست اثر انداز ہوں گی۔ دور درشن اور آکاش وانی کے پروگراموں کا ناظرین خصوصًا بچوں اور نوجوانوں کے ذہن پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ سوچ سمجھ کر ان پروگراموں میں اس طرح دخیل ہوں کہ ہندوستان کے حسین، وسیع، بوقلموں اور ملے جُلے تمدّن کا ان میں انعکاس ہونے لگے۔ اس تہذیب اور ثقافت کو بنانے میں مسلمانوں کا جو حصّہ ہے اس کو خوبصورتی کے ساتھ منظرِ عام پر لانا چاہیے۔ وہ حصّہ دبتا اور ڈھکتا جا رہا ہے۔

حاضرینِ کرام کو یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ یہ کام بہت بڑا اور ہشت پہلو ہے۔ اس کو اچھی طرح سے انجام دینے کے لیے عمومی تعاون کے علاوہ شہر اور ضلع، ریاست اور مرکز کی سطح کی تنظیمیں درکار ہوں گی۔ ان تنظیموں کے قیام کی طرف باخبر افراد کو قدم بڑھانا چاہیے؛ اس میں تاخیر مہلک ہوگی۔ لیکن ان سب تنظیموں کے بن جانے کے انتظار کرنے میں خرابی یہ ہے کہ زمانہ اور ہمارا ملک بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے؛ اس نے پہلے بھی ہماری سُست رفتاری اور دیر بیداری کا ساتھ نہیں دیا اور وہ اب بھی ہماری خوش خرامی سے ہم آہنگ نہیں ہوگا۔ جو لوگ اپنی رفتار کو سُست کر دیتے ہیں، وقت کا تیز رو قافلہ ان کو کچلتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ اور کوئی ان پر ماتم کرنے والا باقی نہیں رہتا۔ جن افراد کو اللہ تعالیٰ نے تھوڑا بہت

بھی علم، شعور اور عصری آگہی سے نوازا ہے، وہ اس درماندہ ملت کے مقروض ہیں۔ ان کو یہ قرضہ اُتارنا ہے۔ قرضہ اُتارنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے ان بھائیوں کی رہبری کریں، جنھیں علم اور آگہی حاصل کرنے کے مواقع نہیں ملے۔ ہم یہ کہہ کر مطمئن نہیں ہو سکتے کہ مسلمان جاہل ہیں یا غافل ہیں یا نفاق پرور ہیں اور اپنی تباہی اور زوال کے خود ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ جاہل اور بے خبر ہیں، تو اس کا الزام براہِ راست ان مسلمانوں پر آتا ہے جو پڑھے لکھے اور باخبر ہیں۔ مؤرخ ان کو بے قصور ٹھہرائے گا اور الزام ان پڑھے لکھے اور خوش حال افراد کو دے گا جنھوں نے انتہائی بے غیرتی اور بے حسی اور خود غرضی کے ساتھ اپنے آپ کو عامۃ المسلمین سے کاٹ لیا ہے۔ الگ کر لیا ہے اور جو ان کی رہنمائی اور مدد سے اس خیال سے بے تعلق ہو گئے ہیں کہ ایک تو وہ خود ترقی یافتہ ہیں، ترقی باختہ لوگوں کی انھیں فکر کیوں ہو۔ دوسرے ان میں سے بعض یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں سے خود کو الگ کر کے وہ دوسروں، بہ شمولِ حکومت، کی نگاہوں میں سرخرو ہوں گے۔ اس سے بڑی بھول کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہی شجر برگ و بار لاتا ہے جس کی جڑیں اسی زمین میں پھیلی ہوئی ہوں، تناور درخت کا یہی شیوہ ہے۔ البتہ کچھ بے غیرت بیلیں ضرور ایسی ہوتی ہیں جو درختوں سے لپٹ جاتی ہیں اور ان کے سہارے بڑھتی اور پنپتی ہیں۔ انھیں ایک چھوٹا سا بچہ بھی ہاتھ کے اشارے سے توڑ کر پھینک سکتا ہے۔

یہ بے بضاعت انسان بہت غور و فکر کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اقلیتوں کے جاندار اور سُرخرو ہونے کے لیے تین شرطیں ہیں اور ان تینوں کا پورا ہونا ضروری ہے:

۱۔ اپنے دین، مسلک، روایات، ثقافت اور زبان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔

۲۔ اس کے افراد اکثریت کے افراد سے کہیں زیادہ محنت کر کے اپنی کارگزاری اور لیاقت کا لوہا منوالیں اور ملک و قوم کے لیے اپنی افادیت کو تسلیم کرالیں، اور ۳۔ پہلی شرط پر کاربند رہتے ہوئے، اکثریت اور دوسرے فرقوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو خوش گوار اور شگفتہ رکھیں۔

گزشتہ سال پھر سے اکثریت کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات میں شگفتگی کی جگہ شکر رنجی اور تناؤ نے لے لی ہے۔ اکثریت کو یہ محسوس کرایا گیا ہے کہ وہ محاصرہ میں ہے اور اقلیتوں کے یرغمال ہیں۔ اس سے زیادہ گمراہ کن اور بے اساس بات کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمیں چاہیے کہ ہندوؤں کی طرف غیرت مندی کے ساتھ دوستی اور تعاون اور خوش فہمی اور خیر سگالی کا ہاتھ بڑھائیں۔ انھیں بتائیں کہ اسلام کا شیوہ تسلیم و رضا اور اس کا پیام رافت و رحمت و خدمت ہے۔ اسلام میں قریب والوں اور ہمسایوں کا بڑا حق ہے۔ ہر جگہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے ہیں، اور جب تک دفاتر میں مسلمانوں کا گزر تھا یہ دونوں قومیں ایک ساتھ کام کرتی ہیں اور اب بھی بعض دفتروں، کارخانوں، کاروباروں میں وہ ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں۔ اسلام وطن کا احترام کرتا ہے لیکن وطن دوستی سے آگے نہیں جاتا۔ وطن پرستی کی طرف نہیں بڑھتا، وہ ساری انسانیت کو ایک برادری تصور کرتا ہے۔ خالق کی عبادت اور خلق کی خدمت اس کی تعلیم ہے۔ ایسے مسلمان ملیں گے جو ایسا نہیں کرتے، لیکن انھیں ہم اسلام کا آئینہ دار نہیں کہہ سکتے۔ برادرانِ وطن کی خیر اندیشی ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ ہندوستان نے بے کیف اور مسلط کی ہوئی یک رنگی کو آزادی کے وقت صراحت کے ساتھ رد کر دیا۔ اس کی جمہوریت، مساوات اور سیکولر عقیدہ کی بنیاد ہی یہ ہے کہ مختلف طبقوں کو اپنے عقائد اور روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی میسر ہو۔ جو صاحبان ملک بھر کے لیے ایک سول کوڈ کے نفاذ پر زور دے رہے ہیں، وہ ہماری سیکولر جمہوریت کی جڑیں کاٹ رہے ہیں، اور اگر آپ مجھے ایک ہندی محاورہ استعمال کرنے کی اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ وہ ہمارے وطن کی سالمیت، وسعتِ نگاہ اور سیکولرزم پر کٹھور اگھات کر رہے ہیں۔ کیا وہ اتنی سی بات بھی نہیں جانتے کہ نارو اصرار سے ہمیشہ ضد پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ انھیں ہم سمجھائیں کہ عائلی قانون کے متعلق مسلمانوں کا نقطۂ نظر براہِ راست مذہب سے اخذ کیا گیا ہے، درآنحالیکہ ہمارے ہندو بھائیوں کے یہاں ایسا نہیں ہے۔

جب وہ یکساں سول کوڈ کی بات کرتے ہیں تو انھیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ اپنا مذہب چھوڑ دو۔ اگر وہ یہ جانتے تو کبھی ایسا نہیں کہتے۔

بعض قومی اخبار۔ نہ جانے کیوں اشتعال اور نفاق کو ہوا دے رہے ہیں تاریخ ان افعال و اعمال کا ریکارڈ ہے جو کبھی خیر پر اور کبھی شر پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایک اخبار نے اس قسم کی تصویریں چھاپنی شروع کر دیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ مسلمان بادشاہوں نے بعض مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کر لیا اور جو رام جنم بھومی اور اس کے جلو میں کرشن جنم بھومی کے متعلق تنازعہ کو ہوا دینے لگے۔ اس پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے وابستہ مؤرخین اور سماجیات کے ماہرین نے اس اخبار کو ایک خط بھیجا جس میں اس روش کے خلاف احتجاج کیا اور مذکورہ مولدوں کی تاریخی حیثیت کو نہایت مشتبہ بتایا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر تاریخ کے افعال کو ہم الٹنا چاہیں گے تو پھر ان مندروں کا کیا ہوگا۔ جو بدھوں اور جینیوں کی عبادت گاہوں کی جگہ پر بنائے گئے تھے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم ماضی کی پرچھائیں حال کے تعلقات پر نہ پڑنے دیں اور ایک خوشگوار اور ہم آہنگ مستقبل کی تیاری میں اپنے سارے بھائیوں کے ساتھ مل کر جُٹ جائیں۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تلخی رہی، تو مسلمان تو پسیں گے ہی، لیکن خود ہمارے ہندو بھائی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پائیں گے۔ اور ملک کی ترقی کی رفتار ترقی معکوس میں بدل جائے گی۔ حالیہ واقعات ہمیں بتا رہے ہیں کہ ہمارا ملک آشتی، امن اور انصاف کی بنیادوں پر ہی ترقی کر سکتا ہے۔ ناانصافی اور عصبیت اور تنگ نظری اور جہالت اور دشنام طرازی اور الزام تراشی، خواہ ہندوؤں کی طرف سے ہو خواہ مسلمانوں کی طرف سے، یکساں مذموم ہے۔

فرقہ وارانہ مسائل کو تو ناحق پھیلا دیا گیا ہے۔ جو مسائل خوشحالی، ترقی اور سکون کے راستہ کا روڑا بن گئے ہیں، وہ اخلاقی مسائل ہیں۔ جھوٹ، فریب، تشدد، ریاکاری، ظلم، ذخیرہ اندوزی، نفع خوری، ملاوٹ، تنگ نظری، عداوت، ہمیں

ان اخلاقی معائب کے خلاف اعلانِ جنگ کر دینا چاہیے؛ یہ وبا کی طرح پھیلتے ہیں تو مذہب، نسل اور زبان اور علاقہ کا امتیاز نہیں کرتے۔ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے ان اخلاقی عیوب کے خلاف جہاد کر رکھا ہے۔ ان کی پیامِ انسانیت کی تحریک، ہندوستان کے سارے باشندوں کو بُرائی چھوڑ کر بھلائی کی طرف آنے کی دعوت دیتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے باہمی غلط فہمیاں مٹانے کے لیے مکالمہ یا ڈائلاگ کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے جس میں وہ غیر مسلم دانشوروں سے خطاب کرتے ہیں۔ دور رہ کر بدگمانیاں بڑھتی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے اور ان کے رُخ، موقف اور رویّہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہندو صاحبان چونکہ اکثریت سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی خود بخود ہو جاتی ہے؛ میڈیا اور اخبارات اور اربابِ اختیار و اظہار کے ذریعہ۔ مسلمان ایسی اقلیت ہیں جس کی بڑی اکثریت اَن پڑھ ہے؛ وہ کمزور ہیں اور درماندہ اور دل برداشتہ۔ انھیں چاہیے کہ اپنی صورتِ حالات، اپنے مسلک اور اپنی مجبوریوں کو اہلِ وطن پر نرم اور مُدلّل ڈھنگ سے واضح کریں۔

اخبار کا ذکر آیا۔ ہمارے پاس کوئی انگریزی روزنامہ نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے اہلِ وطن اسے سمجھ ہی نہیں پاتے۔ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے اس اہم ضرورت کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ مجوزہ انگریزی قومی اخبار کے لیے سرمایہ کی فراہمی عوام کو ہی کرنا ہوگی۔ اس کے علاوہ ہر ریاست کے صدر مقام سے ایک روزنامہ مقامی علاقائی زبان میں بھی نکلنا چاہیے، جس کے لیے مقامی کوشش درکار ہوگی، اور راجدھانی سے ہندی کا ایک روزنامہ۔ اس کی چنداں احتیاج نہیں کہ یہ سب اخبار ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہوں۔ ان سب کا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ تازہ ترین صحافی خوبیوں سے خود کو خاص و عام کے لیے پُرکشش بنائیں، قومی نقطۂ نظر کی ترجمانی کریں، اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور نقطۂ نظر سے بھی قارئین کو آگاہ کریں۔ یہ دَور بے رحم حد تک ذرائع ترسیل و ابلاغ

کا دَور ہے۔ کوئی جماعت ان سے محروم ہو کر پنپ نہیں سکتی۔ اخباروں کا سلسلہ بتدریج وجود میں آئے گا۔ سعی یہ ہونی چاہیے کہ معیار کے بارے میں کسی قسم کی مفاہمت نہ کی جائے۔ ذہین اور ہونہار مسلم طلبہ کو صحافت کی طرف لے جانا چاہیے۔

اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں ایسے باخبر مسلمانوں کو چُن کر اُن کا ایک حلقہ بنانا چاہیے۔ ان کے ذِمّے یہ کام ہو کہ عام اخباروں میں مضامین اور خطوط کے ذریعہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو سامنے لائیں اور ان کے متعلق جو غلط خبریں نکلیں یا غلط فہمیاں پھیلیں ان کی تردید و توضیح کریں؛ بحث مباحثہ کے انداز سے نہیں بلکہ مدّلل طریقہ سے، نرمی کے ساتھ، سمجھانے اور دلنشیں کرانے کے لیے۔

ایک نئے ہندوستان کی تشکیل میں، جو ٹکنولوجی اور سائنس کی تازہ ترین ترقیوں سے ہم قدم ہو، اور جو مغربی تہذیب کی لعنتوں اور مشرق کی بعض برائیوں سے بَری ہو، مسلمانوں کو اہلِ وطن کے ساتھ پورا تعاون کرنا چاہیے۔ تعاون کرتے ہوئے انھیں یہ ملحوظ رکھنا ہوگا کہ تعاون برابر وں کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر ایک بالاتر ہے اور دوسرا فروتر، ایک تیز رفتار ہے اور دوسرا پا لنگ تو دونوں برابری کی سطح پر ساتھ ساتھ چل ہی نہیں سکتے۔ پھر تو ایک طرف سے تحقیر ہوگی اور غصّہ اور دوسری طرف سے جراحت خوردہ بدگمانی۔ تعاون ہمیشہ صحت مند مقابلہ کا ہمعنان ہونا چاہیے۔ غور کیجیے تو یہ پائیے گا کہ ہمارے وطن کی اکثریت باوجود احیائیت کی نمایاں کوششوں کے اپنے محور سے ہٹ چکی ہے۔ ہم سے بھی زیادہ، وہ تہذیبِ حاضر سے مرعوب ہے؛ غافل اس بات سے کہ:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

ترقی اور اخلاقیات کو اس نے بندشوں سے آزادی کے مترادف سمجھ رکھا ہے۔ سائنس کی لائی ہوئی مادّی ترقیات سے سرشار ہو کر وہ اپنے ورثہ کے صالح عناصر کو بھول

چکی ہے، ان کی تعبیر غلط انداز سے کر رہی ہے۔ اخلاقی احتساب اور گرفت اور جزا و سزا کے تصورات سے وہ رُخ پھیرے ہوئے نظر آرہی ہے۔ ان کی احیائیت جوابی ہے اور اس کا روئے سخن دراصل مسلمانوں کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اخلاقی حالت مسلمانوں کی بھی خراب ہے؛ جہالت اور بے حسی اس پر مستزاد؛ لیکن ان کے اس انتہائی جدید طبقہ کو چھوڑ کر جو جھاگ کی طرح اوپر آگیا ہے، مسلمان محور سے محروم نہیں ہیں۔ اگر وہ خود کو سنبھال پائے اور بے اخلاقی اور نری مادّیت اور سُست عنانی سے اپنے آپ کو بچا سکے، تو کیا عجب (اگرچہ ان کی عام پستی کو دیکھتے ہوئے بظاہر ایسا سوچنا شیخ چلی کا ساتھ دینا ہے) کہ وہ ملک میں اچھی قدروں کو رائج اور بحال کرنے میں ایک مثبت کردار ادا کر سکیں۔

دینی تعلیم ہی اخلاق و اقدار کی حفاظت کر سکتی ہے۔ مدرسے سخت ناموافق حالات میں دین کی حفاظت اور اشاعت کر رہے ہیں۔ لیکن ان کی جغرافیائی تقسیم ناہموار ہے۔ محلّہ محلّہ ایسے مدرسے کھُلنے چاہئیں؛ کوئی مسجد ایسی نہیں رہنی چاہیے جس میں دین کی تعلیم نہ دی جاتی ہو۔ ان کو سنوارنے اور مضبوط کرنے اور ان کے مسائل کو حل کرنے اور ان پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ بعض یونیورسٹیوں نے ان کی اسناد کو تسلیم کیا ہے؛ باقی یونیورسٹیوں سے بھی رجوع کرنا چاہیے۔ مدرسوں کی نگرانی معائنہ اور اعانت کے لیے ہر ریاست میں اسی طرح کا شیرازہ مطلوب ہے، جیسا کہ یو۔پی کی دینی کونسل کا ہے۔ ایک کُل ہند دینی کونسل کا قیام بلا مزید تاخیر

باضابطہ کوشش اس بات کی درکار ہے کہ دینی اور عصری تعلیم کا نقشِ دوئی مٹ جائے اور ہماری نئی نسل دونوں سے بہرہ ور اُٹھے۔ نئی تعلیمی پالیسی اس کے پروگراموں اور اسکیموں کے نفاذ پر قریہ قریہ نگاہ رکھی جائے، اور جہاں کوئی انحراف نظر آئے اس کی جانب موثر انداز سے مختلف سطحوں پر توجہ دلائیں۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے استادوں کی صلاحیت اضافہ کا تقاضہ کر رہی ہے۔ ہمیں ایک

تنظیم اس مقصد کے لیے قائم کرنا چاہیے۔ ہمارے طالبِ علموں کو، جو گھروں پر ماحول اور مدد سے اکثر محروم رہتے ہیں، ریمی ڈِیل اور پروموشنل امداد درکار ہے، یعنی جو کمزور ہیں ان کی کمزوری دور کی جائے اور جو ذہین ہیں ان پر صیقل کی جائے تاکہ وہ آگے چل کر مقابلوں میں کامیاب ہو سکیں۔ غیروں اور اپنوں کی آگہی کے لیے معیاری اخبار نکلنے چاہئیں۔ ان سب کاموں کے لیے تنظیم اور وسائل درکار ہوں گے۔ اُن کی فراہمی کا اہتمام جی لگا کر، سر جوڑ کر اور قدم ملا کر کیا جائے، یہ سوچ کر کہ یہ ڈوبنے سے بچنے کے لیے آخری کوشش ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اکیسویں صدی، ہماری حالت کو بیسویں صدی سے بدتر پائے۔

ووکیشنل اور ٹکنیکل تعلیم ہمارے لیے ضروری ہے اور موزوں بھی۔ علم سے طاقت آتی ہے، اور ہاتھ کے ہُنر سے خود مختاری اور آزادی اور اعتماد۔ (۱) ٹکنیکل تعلیم (۲) لڑکیوں کے اسکول اور بورڈنگ ہاؤس (۳) ریمی ڈِیل اور پروموشنل امداد۔ عصری تعلیم کے لیے ہماری یہ تصوراتی ترجیحات عملی تعبیر کی طالب ہیں۔ دینی تعلیم کے درسی نظام کو مضبوط اور وسیع کرنا ہے اور اس تعلیم کو گھر گھر پہنچانا ہے۔

ان ساری تجویزوں کا انحصار ایک دوسرے پر نہیں ہوگا۔ ہر ایک قائم بالذات ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری سے توانائی اخذ کرتی ہے اور اسے توانائی پہنچاتی ہے۔ ہمہ گیر تنظیمیں مختلف سطحوں پر قائم ہو جائیں بہت اچھا۔ لیکن ہمیں اس کا انتظار نہیں کرنا ہے۔ محلّے کی سطح سے کام شروع کر دینا ہے۔ اسی طرح ہمیں ان ساری قومی اسکیموں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے، جو منصوبہ بندی کے تحت ملک کے ہمہ گیر وِکاس کے لیے بنائی اور چلائی گئی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں اپنے اجتماعی شعور اور اپنی ملی ہمت اور کوشش کو مہمیز بنا دینا ہے۔ یاد رہے کہ ترقی کی دوڑ میں ملک کے برابر آنے کے لیے ہی ہمیں غیر معمولی کوشش کرنا پڑے گی۔ اور برابر آئے بغیر ہم مزید ترقی کے نئے منصوبوں سے فائدہ نہ اٹھا پائیں گے۔ برابر آنے کی کوشش انتہائی منظم ڈھنگ اور جانفشانی سے ہمیں کرنا ہوگی؛ کوئی دوسرا ہماری خاطر یہ کوشش نہیں کرے گا۔

حکومت سے ہمیں تقاضے متواتر کرنے چاہئیں۔ ہر تقاضے کے ساتھ خود اپنی کوشش کو دو چند کر دینے میں ہی خوش حالی، اقبال مندی اور ترقی ہے۔ تقاضے کا جواب اگر ہمدردی کے ساتھ دیا بھی گیا تو ہمارے ہاتھ کیا آیا؟ صرف چند الفاظ، اور نیم دلانہ تعمیل۔

دینی تعلیم کی توسیع کا فال آؤٹ یا ضمنی نتیجہ اردو کی بقا کے حق میں ہو گا۔ اُردو کا محاذ مطالبہ سے زیادہ مجاہدہ کا خواہاں ہے۔ فریاد و فغاں سے کام کبھی چلا ہے نہ اب چلے گا۔ اُردو کا حق ملک سے ہم مانگتے رہیں گے۔ لیکن اسے اس کا حق دیں گے ہم ہی۔ اور اس کو حق دینے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے: بچّوں کو گھر پر اُردو پڑھانا۔ اُردو جیسی زبان کے ساتھ، جو ہندوستان کی مِلی جُلی تہذیب کا جیتا جاگتا مرقع ہے، نا انصافی کا برتاؤ، رواداری کے دعووں کو کھوکھلا بنا دیتا ہے۔ لیکن ہمارے پاس نکتہ چینی اور شکوہ سنجی کے لیے وقت نہیں ہے۔ یہ لمحہ کمر کسنے اور دعا کے لیے ہاتھ اُٹھانے کا ہے۔ دعا کے لیے التجا کرنے کا ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہے

ہر چپقلش دہرِ مخالف میں ترا نام
ہتھیار جوانوں کا ہے، پیروں کا عصا ہے

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

(خطبۂ افتتاحیہ، دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش بنارس، منعقدہ ۲۲، ۲۳ نومبر ۱۹۸۶ء)

••

جناب سید شہزاد حیدر
3- Madrasa, Upper Kote
بلند شہر

ذاکر صاحب: چند یادیں



میرے والد سید افتخار حیدر زیدی مرحوم کا اور ڈاکٹر ذاکر صاحب مرحوم کا ساتھ ۱۹۰۶ء میں جب کہ تقسیم بنگال کی وجہ سے ملک میں شورش تھی، لارڈ کرزن کا زمانہ تھا، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ (یو پی) کے درجہ چہارم میں ہوا اور یہ ساتھ لگاتار اسی اسکول میں درجہ نہم تک قائم رہا۔ پھر ۱۹۲۰ء تک مختلف مقامات پر تعلیم مختلف شعبوں میں ہوا جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان ایسی محبت اور قربت قائم ہو گئی جو تا دم حیات قائم رہی۔ یہاں کی تعلیم سے فارغ ہو کر ذاکر حسین صاحب مزید اعلیٰ تعلیم کی غرض سے جرمنی چلے گئے اور میرے والد نے تعلیم سے فارغ ہو کر وکالت کا ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد فوجداری کے وکیل کی حیثیت سے اپنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز کیا۔ میرے والد کو چونکہ وکالت کا پیشہ شروع ہی سے ناپسند تھا، اس لیے اس پیشہ کو چھوڑنے کی غرض سے کچھ دیگر راستے ۱۹۲۶ء تک اختیار کیے، مگر کسی میں کامیابی نہ ہوئی اس وجہ سے ۱۹۲۶ء کے بعد سے مستقل طور پر پیشۂ وکالت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ اس پیشہ میں میرے والد کو جو کامیابی مثل دیگر وکیلوں کے نہ ہوئی، اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ انھوں نے کبھی بھی کسی جھوٹے مقدمہ کی پیروی نہیں کی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ایک مسلمان وکیل کا جھوٹے مقدمہ میں جھوٹے موکل کی طرف سے پیروی کرنا، مذہب اسلام اور قرآن سے خیانت ہے۔ ظاہر ہے ایسے وکیل کو کامیاب ہونے کے مواقع کہاں حاصل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی زندگی بلکہ ان کے محرروں کی بھی زندگیاں تنگدستی اور افلاس کا شکار رہیں۔



جناب سید افتخار حیدر زیدی مرحوم

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اپنی شروع زندگی ہی سے کانگریسی خیالات کے رہے اور گاندھی جی و پنڈت نہرو وغیرہ لیڈروں کے حلقہ میں رہے۔ برخلاف اس کے میرے والد نے کبھی بھی سیاست سے دلچسپی نہیں لی۔ غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اوّل تو مذہبی زندگی جس میں تزکیہ نفس بھی شامل تھا گزارنے کے عادی تھے، اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ فرنگیوں کی مکاری، کانگریس کی قومی یکجہتی، خلافت کمیٹی کی تحریک ترک موالات اور آغاخان کی صدارت میں مسلم لیگ کی پالیسی کو سمجھنے میں اپنے آپ کو قاصر پاتے تھے۔ اور یہی ایک فاصلہ تھا جو میرے والد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے درمیان تھا مگر اس سے تعلقات اور قربت پر کبھی اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے، تو انھوں نے خود ہی یہ محسوس کیا کہ میرے والد کے اندر وہ خوبیاں نہیں ہیں جو ایک کامیاب وکیل کے واسطے ضروری ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنی چٹھی نمبر ۱۸۷ ڈی ۲۰ مئی ۱۹۵۲ء کے ذریعہ میرے والد کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اندر نائب رجسٹرار کے عہدے کی پیشکش کی جس کو میرے والد نے قبول نہ کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مسلم یونیورسٹی سے نکل کر صوبہ بہار کے گورنر، پھر وہاں سے نائب صدر جمہوریہ ہند اور آخر میں صدر جمہوریہ ہند کے عہدے پر پہنچ گئے۔ اس تمام عرصہ میں دونوں ہستیوں کے تعلقات مستحکم رہے۔ خط و کتابت رہی، آنا جانا رہا۔ جب بھی ہمارے یہاں کوئی پریشانی ہوتی اور ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہو جاتا تو وہ اس کو حل کر دیتے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب میرے بھائی بہن ایک ساتھ بیمار پڑ گئے، تو انھوں نے دہلی بلا کر ان کا علاج کرا دیا۔ جب میں نے انٹر کلاس پاس کر لیا تو انھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور مزید تعلیم کو جاری رکھنے کے واسطے پڑھائی کا خرچہ برداشت کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ چنانچہ وہ ہمیشہ پرنسپل ڈی، اے، وی کالج بلند شہر کے نام جہاں میں تعلیم پاتا تھا چیک روانہ کر دیا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا، جہاں تک وہ ہمارے ساتھ ہمدردی اور مدد اپنی جیب اور ذاتی کوشش سے کر سکتے تھے ہمیشہ تیار رہتے تھے، مگر جب ہماری مدد کا سوال بجائے ذاکر حسین کے راشٹرپتی یا راشٹرپتی بھون سے جڑتا نظر آتا تو اس کے واسطے دروازہ مقفل ہو جاتا اور ایسا ہوتا کہ ہماری ہزار کوشش کے باوجود بھی نہ کھلتا۔ مثلاً انھوں نے جب وہ راشٹرپتی تھے تو کسی ایسے فنڈ سے جو صدر کے پاس ایسے کاموں کے واسطے مخصوص ہوتا ہے، میرے والد کا ایک قلیل سا وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو ان کو تاحیات ملتا رہا۔ چونکہ نام وظیفہ کا تھا اور تھا بہت قلیل اس وجہ سے میرے والد نے ان کو تحریر کیا کہ کیا اچھا ہو کہ اگر آپ اس وظیفہ کو اُس PENSION میں تبدیل کر دیں جو مجھے ماہ کی پہلی تاریخ کو یہاں خزانہ سے مل جایا کرے، تو اس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اس طرح دیا۔ "میں آپ کے مقصد کو سمجھ گیا۔ مگر چونکہ آپ اپنی زندگی کے کسی حصہ میں بھی سیاست میں داخل نہیں ہوئے اس وجہ سے آپ پولیٹیکل سفرر نہیں ہیں جب

آپ اس خانہ ہی میں نہیں آتے تو میں کس طرح آپ کی PENSION کا بوجھ سرکاری خزانہ پر ڈال سکتا ہوں۔ جو وظیفہ مل رہا ہے، وہ آپ کو زندگی بھر ملتا رہے گا، خواہ صدر کوئی ہو۔" جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ملک کے صدر تھے، تو کبھی کوئی ایسا کام نکل ہی آتا کہ وہ میرے والد کو بُلا لیتے اور جب وہ بھون میں پہنچ جاتے خواہ میں ہی کیوں نہ ساتھ ہوں، سرکاری سطح پہ مہمان بن کر قیام کرتے۔ مگر جب کبھی میرے والد اپنے کسی کام سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کی تاریخ مانگتے تو ڈاکٹر صاحب بڑی احتیاط سے تاریخ دیتے۔ مگر ساتھ میں یہ بھی تحریر فرما دیتے کہ آپ کا قیام راشٹرپتی بھون میں نہیں ہو سکے گا۔ ایک مرتبہ میرے والد نے میری ملازمت کے بارے میں طویل خط لکھا، اور یہ بھی لکھا کہ شہزاد نے اب بی۔ اے کر لیا ہے۔ اگر اس کو کوئی مناسب ملازمت مل جائے، تو ہمارے واسطے کافی سہولت ہو جائے۔ جس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیے ہوئے خط سے دیا (چٹھی نمبر ۵۶۴۰/۱۲/یو پی۔ مورخہ ۲۲۔ مارچ ۱۹۶۶ء):

"WITH REGARD TO SHAHZAD I AM AFRAID I WILL NOT BE ABLE TO DO ANYTHING. I HAVE MY OWN REASONS FOR SAYING THIS. I HOPE YOU WILL UNDERSTAND AND EXCUSE ME."

پھر اسی مضمون کو تفصیل کے ساتھ اردو میں اپنے ہاتھ سے تحریر کر کے REPEAT کیا۔ تعجب تو یہ تھا کہ باوجود ایسی سرد مہری کے جواب سے دونوں کے تعلقات میں کوئی کمی نہیں آتی تھی، اور درمیان میں کوئی فاصلہ نہ پڑتا تھا۔ یہاں تک ایک مرتبہ صدر کی حیثیت سے بلند شہر کراس کر رہے تھے تو وہ ڈاکٹر ذاکر حسین جس کو تمام دنیا کے دوست ممالک قومی ترانہ کے ساتھ گارڈ آف آنر دیں، ۲۱ توپوں کی سلامی دیں۔ ملک کے اندر جب وہ دہلی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے آئیں تو انتظامیہ پوری جامع مسجد کو اپنے گھیرے میں لے لے، لیکن جب وہ بلند شہر کراس کرے تو اوپر کوٹ محلہ کی گلیوں میں سے گزرتا ہوا اپنے مخصوص عملہ کے ساتھ ہمارے گھر میں آ گئے، ناشتہ کرے، قہقہوں کے درمیان باتیں کرے، اپنا بچپن یاد کرے۔ بچپنے کے بعض دوستوں کو یاد کرے، خود ملے اور دوسروں کو ملائے گویا صحیح معنوں میں افتخار صاحب کا بچپنے کا لنگوٹیا یار آیا ہے۔ درمیان میں نہ کوئی شکوہ ہے نہ شکایت۔ ایک طرف شہزاد ہے، اس کے باپ ہیں اور بھائی بہن ہیں اور دوسری طرف ذاکر حسین ہیں۔ بچپن کی یادیں ہیں اور خلوص ہے، یا یہ جملہ ہے "شہزاد ابھی نوکری کر کے کیا کرو گے۔ ابھی پڑھو کیا پریشانی ہے۔"

یہاں تک تو میرے والد اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے تعلقات کی تصویر تھی۔ اب میں اپنے ایک واقعہ کا تذکرہ کرتا ہوں، جو قریب قریب ڈاکٹر صاحب کی حیات کے آخر میں واقع ہوا۔

جیسا کہ مندرجہ بالا مضمون سے ظاہر ہے میں نے اپنے بچپن میں ذاکر حسین صاحب کی گود بھی دیکھی تھی اور انگلی بھی پکڑی تھی۔ جب بڑا ہوا تو کبھی گھڑی مانگ لی اور کبھی قلم جھٹک لیا۔ پھر جب سنِ بلوغ کو پہنچا تو وہ نہ صرف میرے دعاگو

رہے، بلکہ ہمدرد اور کسی قدر سرپرست کے خانے میں آگئے تھے۔ ایسی ایسی نصیحتوں کے خطوط لکھتے جو دل پر اثر کر جائے۔ جب میں نے بی۔ اے کرلیا، تو میرے گھر کا ماحول میری مزید تعلیم کے سلسلے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا، مجبور ہو کر میں نے ایک درخواست ایک سرکاری محکمہ میں بغرض ملازمت گزاری۔ اس ملازمت کے سلسلہ میں میری جملہ کوالیفکیشن مکمل تھیں بجز عمر کے مطلوبہ حد سے صرف چھ ماہ زائد تھی۔ عام طور پر چونکہ لوگوں کی تاریخ پیدائش میں صرف سال کا اندراج ہوتا ہے اور مہینے کا نام نہیں ہوتا تو انکی عمر کی پیدائش کا مہینہ جون تصور کیا جاتا ہے خواہ پیدائش جنوری میں ہو یا دسمبر میں۔ چونکہ محکمہ کا سوال تھا۔ ملازمت باعزت تھی اور اتفاق سے انٹرویو بھی دہلی میں ہوتا تھا۔ اس لیے درخواست جمع کرنے کے بعد دہلی میں صدر صاحب سے ملاقات کرنے کا ارادہ کرلیا اور بغیر پروگرام فٹ کیے ہوئے دہلی پہنچ گیا۔ گو اس دور میں راشٹرپتی بھون کی اہمیت میرے واسطے ایک حویلی سے زاید نہ تھی، چونکہ متعدد بار اُس میں گھوم چکا تھا۔ اسی طرح اُس دور کا راشٹرپتی میرے واسطے ایک چچا کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی خواہ کوئی بھی ہو اور کتنا ہی قریب سے قریب کیوں نہ ہو اس کے واسطے بھی ان قواعد کی پابندی کرنا لازمی ہوتی ہے جو مقرر ہیں اور ان رکاوٹوں کو عبور کرنا ضروری ہوتا ہے جو شروع ہی سے کھڑی کر دی گئی ہیں۔ مختصر یہ کہ دہلی پہنچ کر میں ان سب کو عبور کر گیا۔ یہاں تک کہ راشٹرپتی بھون کے ایک کمرہ میں مہمان کی حیثیت سے مقیم بھی ہو گیا تو متعلقہ سکریٹری نے مجھے مطلع کیا کہ آپ کی آمد کے سلسلے میں یہ حکم ہے کہ آپ قیام کریں مناسب وقت پر ملاقات کے واسطے طلب کر لیا جائے گا۔ چنانچہ اُس سکریٹری کی نگرانی میں میرے تین دن گذر گئے۔ ایک دن اتفاق سے میرا اور ان کا سامنا ہو گیا اور پھر اُسی دن دوپہر کے بعد مجھے طلب کیا گیا۔ میں اس مقام پر پہنچا دیا گیا جہاں چچا صاحب براجمان تھے۔ چند سکنڈ دعا سلام اور مسکرانے میں گذرے، اس کے بعد فوراً ہی سنجیدگی سے سوال کر لیا: "کیسے آئے ہو شہزاد۔" میں نے بہت خوبصورتی سے گھر کی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ اپنا مقصد بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ چچا جان میرے مستقبل کا سوال ہے، والد صاحب بھی کافی کمزور ہو گئے ہیں، ملازمت کے ملنے میں صرف عمر میں چھ ماہ کی زیادتی رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔ اگر آپ فلاں صاحب کو ایک ٹیلیفون کر دیں تو میرا کام بن جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب جیسا کہ ان کی عادت تھی بہت سکون سے مجھے بولنے کا وقت دیتے رہے۔ جب میں خاموش ہو گیا تو میرے منھ بولے چچا نے اپنے منھ بولے بھتیجے کو جواب دیا: "شہزاد میاں تم کو معلوم ہے میں نے متعدد بار تحریر بھی کر دیا ہے کہ میں نے سفارش کا کھاتا بند کر دیا ہے۔ میں سفارش کے چکر میں کسی کے پیچھے نہیں پڑتا۔ تم خود کوشش کرو، اگر اس محکمہ میں نوکری نہ ملے، دوسرے محکمہ میں کوشش کرو۔ اچھا تو یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو ابھی اور پڑھو۔" ذاکر صاحب کے اس جواب پر میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کچھ اور بول رہے تھے، مگر میری قوت سماعت مفلوج ہو چکی تھی۔ صرف میں نے یہ سنا کہ میں کسی کو ٹیلیفون نہیں کروں گا۔ چنانچہ میں نے بھی کوئی مہمل سا جواب دیا، جو مجھے یاد نہیں کہ کیا کہا۔ کرسی پر سے کھڑا ہو گیا یہ کہہ کر کہ اب کبھی کسی کام سے شہزاد آپ کے پاس نہیں آئے گا اور بغیر آداب کیے ہوئے دروازہ کی طرف چل پڑا۔ لیکن ابھی دروازہ تک پہنچا نہ تھا

کہ انھوں نے آواز دی "شہزاد" میں نے جیسے آواز کو سنا ہی نہیں۔ بدستور قدم اٹھاتا رہا اور چلتا رہا۔ لیکن پھر ایک کڑک دار آواز سنائی دی "شہزاد" میں رک گیا۔ واپس آیا۔ فرمایا بیٹھ جاؤ۔ چند سکنڈ تک ڈاکٹر صاحب بھی خاموش رہے اور میں بھی خاموش رہا۔ اب میں نہیں بول رہا تھا میرا متفکر اور رنگین چہرہ بول رہا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب اس کو پڑھ رہے تھے، اس کے بعد فرمایا "شہزاد ناراض ہو گئے، میں تمہارا چچا ہی نہیں مثل باپ کے ہوں۔ تم کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا رہا اور سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ سب اپنی جگہ پر ہے۔ میں اس ملک کا صدر ہوں، راشٹرپتی ہوں۔ اس ملک کے تمہاری عمر کے تمام بچے میرے پریوار کے بچے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تم میرے اوپر اپنا زیادہ حق رکھتے ہو، مگر کیا تمہاری طرح کے اس پریوار میں اور ہزاروں جوان نہیں ہوں گے جو اپنی کسی نہ کسی کمی کی وجہ سے مجبور نہ ہوں گے۔ مگر وہ بچے میرے پاس آ نہیں سکتے، تم آ سکتے ہو، وہ بھلے ہی میرے پاس نہ آئیں، نہ آ سکیں۔ میرے نزدیک آنے والے اور نہ آنے والے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میں تمہارے سلسلہ میں یہ سفارشی چکر چلاؤں تو مجھے اُن سب کے ساتھ بھی اسی طرح کا چکر چلانے کے واسطے ہر وقت تیار رہنا پڑے گا، جس کی وجہ سے DESERVING CANDIDATE کی حق تلفی ہوگی۔ اور میرے پاس نہ تو اس کام کے واسطے وقت ہے اور نہ میرا ضمیر گوارا کرتا ہے۔ اب تم جا سکتے ہو، I AM SORRY EXCUSE ME ڈاکٹر صاحب نے چند جملوں میں سب کچھ کہدیا، سب کچھ آئینہ کر دیا۔ اب میرے واسطے کوئی گنجائش نہ تھی، زبان گنگ ہو گئی تھی۔ میں کھڑا ہوا۔ آداب گذارا۔ رخصت ہوا اور چل پڑا۔ میں دروازہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور وہ اب دبے لہجے میں مجھے ہدایت کر رہے تھے۔ فلاں ... سے مل کر جانا۔

دہلی سے واپس ہو رہا تھا اور نہ معلوم کتنی مرتبہ یہ شعر پڑھا ہوگا ؎

گلگونۂ عارض ہے نہ ہے رنگِ حنا تو — اے خوں شدہ دل تو، تو کسی کام نہ آیا

میں نے اپنا مقصد آگے چل کر اپنی کوشش سے حاصل کر لیا۔ اس ملاقات کا ذکر بیان میں نے مندرجہ بالا سطور میں اپنے الفاظ میں کیا ہے۔ لیکن زیادہ تر الفاظ اور جملے وہی ہیں جو ذاکر حسین صاحب مرحوم کی زبان سے نکلے تھے۔ آج میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ پر بالکل صحیح تھے۔

ہمارا یہ عظیم لیڈر، ہمارا یہ محبوب لیڈر، قوم اور ملک کی خدمت کرتے کرتے ۱۹۶۹ء میں ہم سے رخصت ہو گیا۔ ہم نے اس کی خدمات کے سلسلہ میں جو کچھ انجام دیا۔ اس کی ترجمانی شاید یہ اشعار کرتے ہوں ؎

لہجے کا رنگ نکہتِ فن ساتھ لے گیا — وہ کیا گیا کہ حسنِ سخن ساتھ لے گیا
جب ہو گیا تمام اُجالوں کا ایک دور — اپنی وہ ایک ایک کرن ساتھ لے گیا
دے کر کتابِ زیست کا ہم کو ورق ورق — ہم نے جو دے دیا وہ کفن ساتھ لے گیا

ڈاکٹر محمد اکرام خاں
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ذاکر صاحب
میرے استاد

ذاکر صاحب بڑے آدمی تھے اور بڑے بھی اُن بڑوں میں تھے، جو قریب سے دیکھنے پر اور بڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسے بڑے تھے جن کی دُور سے دیکھنے والے عزت کرتے ہیں اور قریب سے دیکھنے والے اُن پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب کے ایک عاشق خواجہ غلام السیدین بھی تھے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"حبیب محترم!

ہوائی جہاز کا سفر اور قلم اشک افشاں۔ اس لیے قلم سرمہ سے لکھنے کی معافی چاہتا ہوں۔ اس سفر کے دوران میں نے علی گڑھ کا خطبۂ صدارت پڑھا۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَان، اور علی گڑھ گزٹ کا "ذاکر نمبر" دل عقیدت سے لبریز ہے اور آنکھیں پُرنم۔ اور قدرت سے یہ شکایت کہ جب وہ ایسی تخلیق کر سکتی ہے تو ہم جیسے خس و خاشاک پر طبع آزمائی کی زحمت کیوں فرمائی۔" آپ کا

سیّدین ۸، فروری ۷۰ء

یہ خط میں نے اس لیے پڑھا کہ اس مجمع میں ایسے بہت سے بزرگ اور احباب تشریف فرما ہیں جنھوں نے سیدین صاحب کی طرح ذاکر صاحب کو دیکھا ہے، اُن کے ساتھ برسوں کام کیا ہے، اُن کے سامنے بیٹھ کر پڑھا ہے، اُن کے مشوروں کو مانا ہے، ان کی سرپرستی اور نگرانی میں، ان کی کڑی تنقید اور ماں باپ جیسی شفقت سے اپنے کو بنایا ہے اور اپنی زندگی کے رُخ اور رنگ کو بدلا ہے۔ یہاں کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو ان کی نگرانی اور شفقت کے ہٹ جانے کے بعد یہ سمجھے ہوں گے کہ ان کے نہ ہونے سے کون سا اچھا کام ہے جسے دھکا نہیں لگا۔ وہ جب تک ساتھ رہے تو اُن کے کاموں کا حلقہ پوری طرح دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب اُن کے اٹھ جانے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ایک آدمی کا ہاتھ کہاں کہاں تھا اور اس کی عقابی نظر کہاں کہاں پہنچتی تھیں اور وہ حاجت مندوں، دکھ درد کے ماروں اور زمانے کے ستائے ہوئے لوگوں کی کس طرح مدد فرماتے تھے۔

اس مجمع میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنھیں ذاکر صاحب کے ساتھ کام کرنے یا ساتھ رہنے کا موقع نہیں ملا ہوگا اور کچھ ایسے بھی ضرور ہیں جنھوں نے ذاکر صاحب کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ ویسوں کی تعداد اب بڑھتی چلی جائے گی۔ نئے حالات ہوں گے، نیا زمانہ ہوگا اور نئے مسائل۔ کیا عجب ہے کہ جامعہ جس کے چپہ چپہ میں ذاکر صاحب کی روح موجود ہے اور جس کی نئی اور پرانی عمارتوں کی ایک ایک اینٹ سے ان کے خون جگر اور پسینے کی مہک آتی ہے زندہ رہے اور ذاکر صاحب کو بھلا دیا جائے۔ اگر خدا نخواستہ ایسا ہوا تو ہمارے بعد آنے والی نسلیں بہت بڑی قومی دولت سے محروم ہو جائیں گی۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکے گا، اور ان شاء اللہ ہوگا یہ کہ جو ذاکر صاحب سے نہیں مل سکا ہے وہ اُن سے جامعہ میں مل لے گا۔ جو ان کو نہیں دیکھ سکا ہے وہ اُنھیں یہاں دیکھ سکے گا، جو اُن کے پاکیزہ خیالات اور ان کی جسمانی، ذہنی اور روحانی قدروں سے استفادہ نہیں کر سکا ہے وہ انھیں جامعہ میں پائے گا اور پورے طور سے فائدہ اٹھا سکے گا، پھر ان سے مل کر، ان کو پا کر اور ان کو دیکھ کر اپنے کو بنائے گا اور اپنی زندگی کا رُخ صراطِ مستقیم کی طرف موڑ سکے گا۔ جامعہ ذاکر صاحب کے فلسفۂ حیات اور فلسفۂ تعلیم کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

ذاکر صاحب کا ذکر کروں اور یہ نہ بتاؤں کہ میری تقدیر ان کے ذریعے بدل گئی ہے اور بنائی گئی ہے تو احسان فراموشی ہوگی اور زبردست ناشکری۔ انھوں نے میری طرح اَنگنت بے سہارا اور بے یار نوجوانوں کی زندگیاں بنائی اور سنواری ہیں۔ انھوں نے ہزاروں غریبوں کا پیٹ پالا ہے۔ ہزاروں بیواؤں کی سرپرستی فرمائی، ہزاروں یتیم بچوں اور بچیوں کو ماں باپ جیسا پیار دیا۔ کیا بتاؤں خدا نے ان سے کیسے کیسے اور کتنے نیک کام کرائے ہیں اور اس احتیاط میں کہ کسی کا دل نہ دکھ سکے، اپنے دل کو مستقل دُکھیا بنا لیا۔ انھیں دوسروں کی خدمت کا شوق تھا اور اس شوق میں انسان سے کبھی غافل نہیں ہوئے تھے۔ خطاؤں سے چشم پوشی کرتے اور اچھائیوں کو ڈھونڈھ نکالتے۔ کہتے تھے کہ: "آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے اور چاہے روز فریب کھائے، ہر روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے اور عقل مندوں کو اور بیوقوفوں کو کہ دونوں گمراہ ہوتے ہیں، معاف کرے۔" ذاکر صاحب علی گڑھ میں آٹھ سال بحیثیت وائس چانسلر رہے۔ اپنی صحت کی خرابی کی بنا پر استعفیٰ دیا تو انڈین اکسپریس کے نامہ نگار نے یہ سوال دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک اچھی اور کامیاب زندگی کیسی ہونی چاہیے؟ ذاکر صاحب نے جو جواب دیا وہ یہ ہے: "زندگی میں سب سے سکون بخش چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے ساتھی انسانوں کی خدمت کر سکے اور اس کے دل میں یہ یقین ہو کہ وہ گھٹیا کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ ہے میرا نظریہ اچھی زندگی کے بارے میں۔"

اگر یہ بات بے محل اور بے جوڑ نہ معلوم ہو تو میں علی گڑھ یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ سے وہ چند جملے پیش کروں جن میں ذاکر صاحب کی خدمات کو سراہا گیا ہے: " انھوں نے دلیری سے حالات کا مقابلہ کیا۔ اپنے اعتماد اور اپنے

ساتھیوں اور طلبا کے پکے عقیدے کے ساتھ اس ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ مقصد کی لگن، تعلیمی مسائل پر گہری نگاہ، استادوں اور طلبا کی مشکلات پر ہمدردانہ غور و فکر اور تمام مسئلوں میں انسانی نقطۂ نظر رکھنے کی بدولت وہ یونیورسٹی کے طلبا اور اسٹاف کے لیے جوش و خروش اور امنگ کا وسیلہ بنے رہے۔ کونسل انتہائی محبت اور احسان مندی سے ہمیشہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی بے پایاں خدمات کو یاد رکھے گی اور ان کے نظریات کی کامیابی کیلئے ان تھک جد و جہد جاری رکھے گی۔"

ذاکر صاحب فطری طور پر استاد تھے اور اچھے استاد تھے۔ اچھے استاد کی تمام تر خوبیاں اُن کی شخصیت میں یکجا ہو گئی تھیں۔ ان کی طبیعت کا رجحان اپنی ذات کی طرف نہیں دوسروں کی طرف تھا۔ ان میں قوت کی آرزو، کمائی کا چسکا جمع کر کرکے ڈھیری لگانے کی لت، لالچ، ہوس اور غرور نہ تھا۔ ان کا دل ہمدردی، ہمدمی، میل ملاپ، فیاضی، دوسروں کو سہارا دینے اور مدد کرنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ وہ سماجی آدمی تھے۔ اور دوسروں کو اچھا سماجی انسان بنانے کا شوق تھا۔ ان کا دل محبت اور خدمت کے جذبے سے لبریز تھا۔ ان کی محبت میں نہ مذہب و ملّت کا امتیاز تھا اور نہ رنگ و نسل کا لحاظ۔ انھیں بچوں سے بھی محبت تھی اور بڑوں سے بھی۔ انھیں جانوروں سے بھی محبت تھی اور انسانوں سے بھی۔ انھیں پودوں سے بھی محبت تھی اور پتھروں سے بھی۔ انھیں پھولوں سے بھی محبت تھی اور کانٹوں سے بھی۔ انھیں تو خدا کی ساری مخلوق سے محبت تھی اور اُن کی محبت کی اساس عزّت اور خدمت تھی۔ ان کی بڑی صاحبزادی بیگم سعیدہ خورشید نے اپنی کتاب "ذاکر صاحب کی کہانی" میں لکھا ہے:- "میاں کو بچوّں سے بھی محبّت تھی اور بڑوں سے بھی۔ وہ ہر انسان کو عزّت اور محبت کا مستحق سمجھتے تھے۔ انھوں نے شاید ہی کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے شخص کو بھی حقارت سے مخاطب کیا ہو۔ ہمیشہ اچھے الفاظ اور اچھے القاب سے خطاب کرتے تھے۔ آپ، جناب، میاں، صاحب، نام کے ساتھ ضرور لگاتے۔ کبھی کسی پر اپنی برتری نہ جتاتے۔ اپنی تکلیفوں کا اظہار کبھی نہ کرتے۔ دوسروں کی تکلیفوں کو سنتے اور ہمدردی کرتے اور دلاسہ دیتے ... لوگ ان کے پاس مایوس آتے اور خود اعتمادی اور حوصلہ کی دولت اپنے ساتھ لے کر لوٹتے۔ لوگ اپنے دکھ درد سنا کر ہلکے ہو جاتے اور یہ راتوں کو سو نہ سکتے۔ کروٹیں بدل کر تدبیریں سوچتے رہتے اور ان کے مداوے کے جتن کرتے رہتے۔"

ذاکر صاحب استاد بھی تھے اور مفکر تعلیم بھی۔ انھوں نے تعلیم کے متعلق جو سوچا اسے جامعہ کے تعلیمی مرکز اور دوسرے اداروں میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جس طرح اسی زمانے میں جرمنی میں کرشنؔ اشائنر اور امریکہ میں جان ڈیوی پرانے تعلیمی نظام کو ختم کرنے اور جدید تعلیمی نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہے تھے، اسی طرح ذاکر صاحب کام کے ذریعے تعلیم کے اصول پر جامعہ میں تجربہ کر رہے تھے۔ اُن کے تعلیمی طرز فکر و عمل کو دیکھ کر گاندھی جی نے بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم ان کی صدارت میں مرتب کرائی۔ ذاکر صاحب کے یہاں تعلیم کا مقصد بچے کی تمام تر پوشیدہ صلاحیتوں

کو اُبھارنا اور اُنھیں سماجی کاموں میں استعمال کرنا ہے۔ ان کے نزدیک ذہنی نشو نما فرد اور اس کے ماحول کے درمیان عمل اور ردّ عمل سے ہوتی ہے۔ وہ ذہن کی مجہولیت کے مقابلہ میں فعّالیت پر زور دیتے ہیں، اسی لیے چھ سے چودہ سال تک پوری تعلیم حرفوں اور سماجی اور قدرتی ماحول کے ربط سے مکمل کرانا چاہتے ہیں۔ ان کے یہاں انفرادی مقابلے کی بجائے اشتراکی عمل، تن آسانی کی بجائے محنت، نفرت کی بجائے محبت، انتقام کی بجائے انعام، بدگمانی اور خود غرضی کے بجائے اعتماد اور بے غرضی کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ وہ انفرادی زندگی کو جماعتی زندگی کا تابع بنانا چاہتے ہیں، لیکن انفرادیت کو دبانے اور کچلنے کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا مفہوم سماجی ہے، جینے کا مقصد خدمتِ خلق ہے اور تعلیم کا مقصد فرد کی شخصیت کی مکمل نشوونما کہتے ہیں" تعلیم نام ہی اس کا ہے کہ متعلم کے کُل قوائے ذہنی وجسمانی کی تربیت کر کے ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اور اسے تمدنی زندگی کے کل شعبوں کا محرم بنا کر اس میں ذہنی استعداد کے مطابق حصّہ لینے کیلئے تیار کیا جائے۔"

ذاکر صاحب کے قول اور فعل میں ہمیشہ مطابقت پائی گئی جو کہا وہ کیا، جو لکھا وہ تجربے کے بعد لکھا۔ میں نے سدا ان کے قول و فعل میں سچائی اور مطابقت پائی۔ مثال کے طور پر ان کی کتاب "تعلیمی خطبات" میں ان کا مضمون "سیرت کی تربیت" پڑھیے، بڑا دلچسپ اور سبق آموز مضمون ہے۔ پورے مضمون کی تشریح یا تفسیر کا وقت نہیں، لکھتے ہیں:
"کہ سیرت کی تعمیر کے لیے چار عناصر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ارادے کی قوت کا ایک کم سے کم درجہ، اجتہادِ فکر کا ایک کم سے کم مرتبہ، حسِ جماعتی کی ایک کم سے کم ذات اور اثر پذیری کی ایک کم سے کم وسعت، گہرائی اور پائیداری" حضرات! گستاخی ضرور ہے لیکن یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں نے ذاکر صاحب کو اکثر و بیشتر موقعوں پر گھر کے اندر اور باہر اس نظر سے دیکھنے کی کوشش کی کہ کہیں ان کے قول و فعل میں تضاد نظر آجائے۔ لیکن ہر موقع پر ان کی سیرت میں یہ چاروں عناصر ہموزن اور پختگی کی حالت میں پائے گئے۔ ذاکر صاحب مانے ہوئے اسکالر تھے، اُن کا تعمیری اندازِ فکر تھا، وہ بلند مرتبہ کے ماہرِ تعلیم تھے اور ہر دلعزیز استاد۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
شعبۂ اردو
لارڈ وینکٹشورلو یونیورسٹی، تیروپتی

رشید صاحب اور ذاکر صاحب

۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے میں نے "رشید احمد صدیقی: شخصیت اور فن" کے موضوع کا انتخاب کیا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ اُن اصحاب سے ربط پیدا کروں جن سے رشید صاحب کے مراسم رہے۔ ایسے اصحاب میں ذاکر صاحب کا نام سرِ فہرست تھا، جو ایک عرصہ تک رشید صاحب کے "ہم نوالہ، ہم اقامہ، ہم سبق اور ہم خیال تھے۔" ذاکر صاحب اس وقت ہمارے ملک کی نائب صدارت کے منصب جلیل پر فائز تھے۔ ان کو مکتوب لکھنے کا خیال آیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ وہ تو بڑے آدمی ہیں اور مصروف بھی۔ اور جیسا کہ ایسے آدمیوں کا خاصہ ہوتا ہے، عام طور پر خط و کتابت سے گریز کرتے ہیں اور اس میں بھی اپنی بڑائی پاتے ہیں۔ میں ٹھہرا ایک طالب علم، نائب صدر جمہوریۂ ہند بھلا مجھے کیا خط لکھیں گے، میرے خط کا جواب کیا دیں گے۔ چند روز اسی شش و پنج میں گذر گئے۔ آخر کار مکتوب روانہ کر دیا اس التماس کے ساتھ کہ فلاں تواریخ میں دہلی میں رہوں گا۔ رشید صاحب کے تعلق سے اُن سے ملاقات کا متمنی ہوں۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ جواب آئے گا۔ ہفتہ عشرہ ہی گذرا ہوگا، نہ صرف ذاکر صاحب کا جواب آیا بلکہ اُنھوں نے میری دی ہوئی تواریخ ہی میں ملاقات کے وقت کا تعین کر دیا۔

ذاکر صاحب سے ملاقات کے نقوش، آج بھی میرے ذہن میں تازہ، شفاف اور شاداب ہیں۔ میں یہ سطور تسوید کر رہا ہوں، لیکن محسوس ہوتا ہے جیسے ۲۲ نومبر ۱۹۶۲ء ہے۔ شام کی ۴½ ساعت۔ میں نائب صدر جمہوریۂ ہند کی کوٹھی، ۶۔ مولانا آزاد روڈ، نئی دہلی کے باذوق اور مہذب انداز سے سجے سجائے ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ لیجیے، ذاکر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں تعظیماً استادہ ہو جاتا ہوں۔ وہ مجھ سے مصافحہ کر رہے ہیں۔ ہم دونوں وہیں صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ چند الفاظ میں، میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ وہ مجھ سے، میری تعلیم اور حیدرآباد کے بارے میں اتنی باتیں کر لیتے ہیں کہ بیگانگی کا احساس مٹ جاتا ہے۔ جیسے میں کسی مشفق، اپنے کسی بزرگ رشتہ دار سے گفت و شنید میں

میں مصروف ہوں۔ وہ میرے ہر سوال کا جواب بڑی دلنشینی سے دیتے ہیں۔ رشید صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی نگاہوں میں روشنی، چہرے پر شگفتگی اور لہجہ میں دلنوازی پیدا ہو جاتی ہے۔ رشید صاحب کے بارے میں اُن کا یہ جملہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ "رشید صاحب جیسا دوست کسی کو ملے تو اس کو مطمئن ہو جانا چاہیئے۔ اسی دوران انھوں نے مجھ سے کہا کہ رشید صاحب کی سوانح کا باب تیار کر لوں تو اس کی ایک کاپی اُن کی خدمت میں ارسال کر دوں۔

میں بات چیت کرتا رہا، جو چیز، میں نے محسوس کی وہ یہ کہ ذاکر صاحب نے اپنے عہدے کے شکوہ، دبدبے، رعب اور شان کو کسی طرح نمایاں ہونے نہیں دیا، بلکہ وہ ایک عام انسان کی طرح گفتگو کرتے رہے اور بحیثیت انسان کے اپنی شرافت اپنائیت اور اپنے خلوص کا جادو جگاتے رہے، میں مسحور ہوتا رہا۔ کسی نے کہا ہے کہ بڑے آدمی کی پہچان یہ بھی ہے کہ اُس سے ملاقات کے بعد ہم میں بڑائی کا احساس پیدا ہو۔ کچھ اسی طرح بڑائی اور عظمت کا احساس لئے میں اُن سے وداع ہوا۔

اس ملاقات کو عرصہ ہو چکا۔ ۱۹۶۵ء میں اپنے مقالے کی تیاری کے سلسلے میں مجھ کو ایک بار اور دہلی اور علی گڑھ کا سفر درپیش ہوا۔ اُسی عنایت کے ساتھ میری دی ہوئی تواریخ میں ذاکر صاحب نے ملاقات کا شرف بخشا۔ ذاکر صاحب سے پہلی ملاقات کے نقوش، میرے ذہن میں تازہ تھے، کسی گلاب نہیں، گلابوں کے تختے کی طرح۔ اور ذہن میں یہ خیالات بھی آرہے تھے کہ ذاکر صاحب سے دوبارہ تعارف کی ضرورت ہوگی۔ پہلی ملاقات کو تین سال کا عرصہ ہو گیا ہے، اس طویل عرصہ میں وہ مجھ کو کیوں یاد رکھنے لگیں۔ پتہ نہیں ان کو روزانہ کتنے افراد سے ملاقات کرنی پڑتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ لیکن میرے استعجاب کی حد نہ رہی۔ میں اُسی ملاقاتی کمرے میں، جس میں نومبر ۱۹۶۲ء میں بیٹھا تھا۔ ذاکر صاحب کا انتظار کر رہا تھا، چند لمحے گذرنے نہ پائے کہ ذاکر صاحب تشریف لائے۔ اُن کے قدموں کی چاپ، اُن کے چلنے کا انداز میں آج تک فراموش نہ کر سکا ہوں، جیسے عزم و ایقان اور محکم ارادوں کی صلابت، کسی پیکر میں ڈھل چکی ہو، جیسے تدبر، سنجیدگی اور متانت نے کسی انسان کا روپ دھار لیا ہو۔ جیسے تفکر و فلسفہ مجسم ہو چکے ہوں، جیسے شائستگی اور شرافت خراماں خراماں ہوں، جیسے کلاسیکی قدریں گوشت پوست کی صورت میں ڈھل کر چلی آ رہی ہوں۔ ابھی میں تسلیم کر ہی پایا تھا کہ ذاکر صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے دریافت کیا: "کہیئے، اچھے ہیں آپ، آپ کا مقالہ ختم نہیں ہوا؟"۔ ذاکر صاحب کے ان الفاظ نے مجھ میں ایک عجیب امنگ اور حوصلہ پیدا کر دیا۔ ایک خود اعتمادی دے دی۔ مجھے مسرت ہوئی کہ ذاکر صاحب نے مجھے فراموش نہیں کیا ہے۔ میں نے انھیں رشید صاحب کی سوانح کا باب پیش کیا۔ چند لمحوں کے لیے انھوں نے اُسے ادھر اُدھر سے دیکھا۔ اظہار پسندیدگی کیا اور پھر میرے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں اپنے کسی عزیز سے مدت کے بعد مل رہا ہوں، اور وہ میرے حالات دریافت کر رہا ہے۔

میں سمجھتا تھا طنز و مزاح کے بارے میں ذاکر صاحب کی معلومات کچھ یونہی سی ہوں گی لیکن انھوں نے تو اردو طنز و مزاح نگاروں پر ایک پُر مغز لکچر دیدیا، بلکہ ترکی کے نامور مزاح نگار نصرالدین خواجہ کے بارے میں اتنی معلومات بہم پہنچائیں جو مجھے شاید ہی کہیں اور سے دستیاب ہوتیں۔ میں ہمہ تن گوش بنا ذاکر صاحب کی گفتگو سنتا رہا۔ چائے مع لوازم کے آئی، انھوں نے مجھ سے چائے پینے کے لیے کہا، اور خود کہنے لگے۔ اسلوب کیا ہے؟ تنقید کیسی ہونی چاہیے؟ ادب میں شخصیت کا کیا مقام ہے؟ خطوط میں شخصیت کیونکر واضح ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ! غرض مختلف موضوعات پر۔ ذاکر صاحب کے بارے میں جو کچھ پڑھا اور سنا تھا، ذاکر صاحب کی شخصیت کو اس سے کہیں زیادہ وقیع، عظیم، جامع، گمبھیر، قد آور، باوزن، باوقار، پُر شکوہ اور بیکراں پایا۔ کہیں زیادہ، کہیں زیادہ!!

ذاکر صاحب سے ملاقات کے لیے جتنا بھی وقت مقرر ہوتا وہ ازراہِ عنایت، ہمیشہ اس سے زیادہ گفتگو کرتے آنکہ پرائیویٹ سکریٹری آکر، کہہ نہ دیتے کہ ملاقات کے لیے کوئی اور آچکا ہے۔ میں چاہتا کہ وہ بیٹھے رہیں۔ اور میں رخصت کی اجازت چاہوں، لیکن وہ عجیب بڑے آدمی تھے کہ استادہ ہو کر مصافحہ کرتے اور میرے ساتھ کمرے سے باہر تک آکر وداع کرتے۔

ذاکر صاحب سے دوسری ملاقات کے بعد اُن کی شفقت کچھ ایسی رہی کہ جب بھی خط لکھتا، بڑی چاہ سے بڑے شوق سے جواب سے سرفراز کرتے۔ صدر جمہوریہ کی حیثیت سے اُن کے انتخاب پر، نیز اُن کی ہر سالگرہ پر خط لکھتا چند ہی روز میں جوابی مکتوب آتا۔ تہنیت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نیک خواہشات کا اظہار اور ڈھیر سی دعائیں!

میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اُن کا مبارکباد کا مکتوب آیا۔ میں نے اپنے مقالے کی اشاعت کی تیاری شروع کی۔ رشید صاحب سے گہرے مراسم کی روشنی میں، چاہتا تھا کہ میری کتاب "رشید احمد صدیقی: شخصیت اور فن" کا پیش لفظ ذاکر صاحب تحریر فرمائیں۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ وہ صدر جمہوریۂ ہند کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ ان کی مصروفیات اور افزوں ہو چکی تھیں۔ اُن کو پیش لفظ لکھنے کے لئے وقت کہاں؟ میرا ایقان یہی تھا۔ اس لئے بھی کہ اپنی قومی و ملکی مصروفیات کے باعث ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں ختم نہ بھی ہو چکی ہوں، ختم ہونے کے برابر تھیں۔ انھوں نے پیش لفظ تو نہیں لکھا، لیکن جس عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ گریز کیا۔ اس سے میری دل شکنی نہیں، ہمت افزائی ہوئی، حوصلہ ملا۔ وہ خط میرے سامنے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سچ تو یہ ہے مجھے یہ رسم پسند نہیں۔ دوسروں سے کچھ لکھانے کی بجائے خود ہی لکھنا چاہیئے۔ آپ بھی اگر اس رسم سے بچ سکیں تو احتراز فرمائیے۔"

کتاب شائع ہوئی۔ میں نے سب سے پہلے ذاکر صاحب کی خدمت میں روانہ کی۔ ۲۰، ۲۵ روز ہی میں ذاکر صاحب

کا عنایت نامہ ملا۔ انھوں نے کتاب کے بارے میں اپنی گرانقدر رائے ان الفاظ میں تحریر کی :

"یہ کتاب مجھے اس لیے عزیز ہے کہ میرے ایک عزیز ترین دوست کی زندگی اور کام کی تصویر پیش کرتا ہے۔"

ذاکر صاحب نے رشید صاحب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ "رشید صاحب میرے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں وہ رشید صاحب کا فن ہے، کیونکہ رشید صاحب کے ذہن میں ایک کردار موجود ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اُن کو اپنے تصور کا یہ کردار میری شخصیت میں ملتا ہے۔ یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ مصنف کے کرداروں کا وجود خارج میں ہوا کرتا ہے، کیونکہ کردار کا تصور تو مصنف کے ذہن میں موجود رہتا ہے۔ وہ خارج سے اپنے کردار کے لیے کوئی نام لے سکتا ہے۔ لیکن کردار تو بہر حال اُس کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ میں نے ذاکر صاحب سے پوچھا کہ آپ کی شخصیت میں آخر ایسی کیا بات ہے کہ رشید صاحب نے اس کا اس قدر زیادہ اثر قبول کیا۔ ذاکر صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "میں نہیں سمجھتا کہ مجھ میں ایسی کوئی خوبی ہے جس نے رشید صاحب کو متاثر کیا۔ ظاہر ہے میں نے اپنی زندگی میں کئی لوگوں سے ملاقات کی ہے اگر مجھ میں خوبی ہوتی تو ہر شخص مجھ سے متاثر ہوتا لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ ہر شخص مجھ سے متاثر نہیں ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مجھ میں کوئی خوبی ہونے سے زیادہ مصنف کے ذہن میں خوبی موجود ہے جو اس کو میرے بارے میں لکھنے پر مجبور کرتی ہے اس سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اہم بات یہ ہے کہ ہم فنکار کے فن کو دنیا کی اور چیزوں سے تقابل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ فن کو فنکار کی تخلیق سمجھ کر دیکھنا چاہیے اور بس۔

بات شخصیت کی بھی ہو رہی تھی۔ ذاکر صاحب کے نزدیک، گویا شخصیت کی ایسی اہمیت نہیں۔ وہ کہنے لگے : "ادب میں مصنف جو چیز لکھ دیتا ہے وہ عموماً اُس کی شخصیت سے جداگانہ ہوتی ہے۔ فن پارے کو فنکار کی شخصیت سے رجوع کرنا اور اس کی شخصیت کے آئینہ میں دیکھنا کچھ غیر ضروری سی بات ہے۔ اور سچ پوچھیے تو شخصیت کا سمجھنا کیا ضروری ہے۔ ادب کو ویسے شخصیت کے بغیر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ادب کو ادب کی حیثیت سے دیکھا جائے، ادب کے اپنے معیارات ہیں، ان معیارات کی روشنی میں اس کو جانچا جائے۔ اسی طرح ادب کا سماجی اسکول ہوتا ہے اور اس ادب کے پیرو، فن پارے کو اس کے سماجی تناظر میں دیکھتے اور اس کے سماجی تعبیر ڈھونڈتے ہیں۔ یہ چیز غلط ہے۔ اچھے باپ کے بُرے بیٹے بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ اسی طرح بُرے باپ کے اچھے بیٹے بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ بہرکیف ادب، ادب ہوتا ہے۔ اس کا اسی زاویہ سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

رشید صاحب کے طرزِ تحریر کے بارے میں بعض تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ وہ غیر مربوط ہے۔ اس بارے

میں اظہار خیال کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا کہ کسی مصنف کا ہم ان بنیادوں پر تجزیہ کیوں کریں کہ وہ کس طرح لکھتا ہے اور اس کا طرزِ تحریر کس کا جیسا ہے یا اُس جیسا۔ کیونکہ مصنف یا کسی اور فنکار کے لیے دوسروں کی تقلید کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ مصنف کا طرزِ تحریر اُس کا اپنا ہونا چاہیئے۔ مصنف کی خوبی یہ ہے کہ وہ 'وہ' ہو، اوروں کی طرح نہ ہو، بلکہ صاحب اسلوب کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی طرح لکھتا ہے، 'وہ' جو کسی اور کی طرح لکھتا ہے، اچھا نہیں لکھتا۔

اپنے ہال میں دیوار سے آویزاں ماڈرن آرٹ کی ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے پوچھا: "یہ تصویر آپ کی سمجھ میں آتی ہے؟" میں نے کہا: "یک نظر تو سمجھ میں نہیں آتی۔" تب وہ کہنے لگے: "یہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے آرٹسٹ کی تصویر ہے۔ اس آرٹسٹ کی مقبولیت کا سبب یہی ہے کہ وہ نہ چغتائی کی طرح تصویریں بناتا ہے، اور نہ کسی اور نامور مصور کی تقلید کرتا ہے بلکہ اس آرٹسٹ کا فن اچھوتا اور اُس کا اپنا ہے۔ اسی طرح ہر مصنف کا اپنی طرزِ ادا ہوتی ہے۔ یوں بھی حکومت نے طرزِ ادا کے تعلق سے کوئی قانون تو منظور نہیں کیا ہے کہ ایسے لکھو اور ایسے نہ لکھو۔ وہ نقاد جو مصنف سے خاص خاص باتوں کا مطالبہ کرتے ہیں وہ عجیب و غریب ہیں۔ نقاد کی سب سے بڑی غلطی تو یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے اس کے پاس تمام معیار موجود ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آخر خود نقاد کا اپنا معیار کیا ہے۔

اردو میں تنقید کے بارے میں ذاکر صاحب نے اظہار خیال کیا کہ یہ لوگ تعصب سے الگ نہیں ہوتے۔ کہیں تو دوست داری کی جاتی ہے اور کہیں بلاوجہ مخالفت اور مذمت۔ ذاکر صاحب زندہ آدمی پر لکھنا علمی تحقیق کے لیے مناسب خیال نہیں کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک ادب کی تحریر کے بعد جب تک ایک طویل عرصہ نہ گذر جائے وہ پڑھنے کے قابل نہیں ہوتا اور لوگ اب تو ادیب کو مرنے بھی نہیں دیتے اور اس کو اپنی تحقیق اور تنقید کا عنوان بنا دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی زمانے میں جو ادب اچھا ہوتا ہے اور خاصی واہ واہ حاصل کرتا ہے دس سال گذر جانے کے بعد اس کو کوئی پڑھتا بھی نہیں۔ اس لیے چاہیئے تو یہی کہ ادب اور ادیب کو فوراً تحقیق اور تنقید کا موضوع نہ بنایا جائے۔

رشید صاحب کے بارے میں ذاکر صاحب کے خیالات بڑے ہی سیدھے سادے تھے۔ ذاکر صاحب تعلیمی زندگی میں رشید صاحب سے دو سال آگے تھے۔ ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں بحیثیت طالب علم ۱۹۱۲ء میں داخلہ لیا اور رشید صاحب نے ۱۹۱۵ء میں۔ لیکن ان دونوں میں دوستی انتہائی گہری اور پُرخلوص تھی، اوروں کے لیے باعث رشک! تعلیمی زندگی کے بعد جب دونوں نے مختلف شعبوں کو منتخب کیا، اُس کے بعد مرتے دم تک دونوں کی دوستی میں فرق نہیں آیا۔ وہی اپنائیت، وہی بے تکلفی! ذاکر صاحب رشید صاحب کو اپنا بہترین اور نہایت ہی عزیز دوست خیال کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر کسی کو ایسا دوست مل جائے جیسے کہ رشید صاحب تھے تو اُس شخص کو دوستوں کے معاملے میں مطمئن ہو جانا چاہیئے۔

وہ رشید صاحب کے خلوص و محبت کے بے پناہ قائل تھے۔ وہ رشید صاحب کو ایک بلند پایا مصنف قرار دیتے تھے لیکن ان کی نظروں میں رشید صاحب مصنف کی بہ نسبت معلم کی حیثیت سے زیادہ بلند تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ رشید صاحب نے کتنے ہی لوگوں کو لکھنے کا شوق دلایا اور کئی ایک کے ذوقِ سلیم کی تربیت کی کہ اس کا احسان اردو ادب پر ان کی تصانیف سے زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ میں ایک عرصہ تک اردو زبان کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ اردو فارسی کا جزو رہے۔ لیکن رشید صاحب کی وجہ سے علی گڑھ میں اردو کی حیثیت بن گئی۔

ذاکر صاحب، غیر معمولی جاذبِ توجہ، گمبھیر اور پر اثر شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے ان کے اندازِ گفتگو میں اُن کے عہدے اور منصب کا جاہ و جلال نہیں، اُن کی شخصیت کا تدبّر پایا۔ وہ بات اس طرح کرتے گویا لفظ لفظ، تول تول کر ادا کر رہے ہیں۔ وزیرِ اعظم نہرو کے پیکر میں نمایاں چیز اُن کی شیروانی کے بٹن میں لگا گلاب تھا۔ ذاکر صاحب کے سراپے میں بھی آپ کو ایک ایسی چیز ملتی ہے، اُن کا چشمہ۔ وہ خاموش بھی رہیں۔ اُن کے ہلکے سیاہ رنگ کے اس چشمے کے پیچھے سے اُن کی آنکھیں بہت کچھ کہتی نظر آتیں۔ اپنے بارے میں، مخاطب کے بارے میں، اور ـــــ اور ایک جہان کے بارے میں۔

جنابِ قیوم خضر
پٹنہ

ذاکر صاحب کی جامعہ میں

میں جامعہ ملیہ دہلی میں تعلیم پا رہا تھا اور قرول باغ کے خاکسار ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اسی ہوسٹل میں ہمارے گیا شہر کے ڈپٹی یعقوب صاحب کے لڑکے میاں حسنات بھی میرے ساتھ رہتے تھے۔ ایک رات کو مجھے جو شرارت سوجھی تو میں ان کی الماری کھول کر ڈبّے سے سارا خشک میوہ یعنی اخروٹ، بادام اور کشمش چٹ کر گیا اور اس کی جگہ پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ دیئے۔ جب میاں حسنات نے دوسری صبح کو ڈبّہ کھولا تو میوہ کی بجائے پتھروں کے ٹکڑوں کو دیکھ کر بہت برہم ہوئے۔ اِن کا شک براہِ راست مجھ پر گیا اور اُنھوں نے ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ ارشاد صاحب کو جا کر میری شرارت کی شکایت کی۔ ارشاد صاحب نے مجھے بُلوا بھیجا، جیسے ہی میں اُن کے کمرے میں پہونچا، ویسے ہی شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب بھی آگئے۔ ان کو دیکھ کر تو میرے چھکّے ہی چھوٹ گئے، اور سوچا کہ آج بُرے پھنسے اور اگر کہیں سزا کے طور پر ہوسٹل سے نکل جانے کا حکم صادر ہو گیا تو پھر بڑی رسوائی ہوگی۔ یہ دل میں سوچ ہی رہا تھا کہ ارشاد صاحب نے مُجھ سے شرارت کی وجہ پوچھی، تو میں نے برجستہ عرض کیا: ”جناب! میری قسمت میں جو تھا، سو میں نے کھایا اور حسنات صاحب کی قسمت میں جو ہے سو وہ کھائیں۔“ جواب کی اس برجستگی سے ذاکر صاحب اور ارشاد صاحب دونوں مسکرا پڑے اور پھر ذاکر صاحب نے ارشاد صاحب سے میری شرارت کی تفصیل پُوچھی، اس کے بعد میری طرف پلٹے اور بڑے پیار سے مجھ سے فرمایا: ”صاحبزادے! اگر خشک میوہ کھانے کی تمہیں خواہش ہو تو میرے پاس چلے آنا، میں تمہارے لیے انتظام کر دوں گا۔“ اور پھر آئندہ ایسی شرارت نہ کرنے کی تنبیہ کی۔

●●

ڈاکٹر محمد صدیق نیازمند
شعبۂ فارسی
کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

شرح احوال و آثار و سبک شعر ملا ساطع کشمیری

سرزمین کشمیر از نظر رشد زبان و ادبیات فارسی بسیار بارز و زرخیز بوده است. این زبان شیرین در عهد پادشاهان شهمیری که اولین خانوادهٔ پادشاهان مسلمان محلّی آن دیار می باشند، متقارن با عهد تیموریان در ایران به آن خطهٔ دلپذیر راه یافت. در عهد پادشاهی سلطان زین العابدین (بدشاه = شاه کبیر) این زبان برسمیت شناخته شد و حتّی زیاده نگذشت که جای زبان سانسکریت را که زبان رسمی آن دیار بود، گرفت. بدین منوال زبان فارسی اولین بار در کشمیر زبان اداری و درباری قرار گرفت. در طول مدت شش قرن اخیر یعنی از ۵۲۷ هجری قمری تا نیمهٔ دوم سدهٔ چهاردهم هجری قمری در جنبه های گوناگون از شعر و نثر و علوم و ادبیات گرفته تا طب و نجوم و هیئت شخصیت های برگزیده بوجود آمده و تمام اینها انگیزه های خود را باین زبان شیوا ابراز نموده اند.

دربار مغولان گورکانی هند از نظر تقویت شعر و بزرگترین تربیت گاه شاعران این عصر یکی از دوره های بسیار پُرارج بشمار میرود. زیرا شاعران بس نامدار و نثر نویسان چابکدست در همین عصر بوجود آمدند. از نمونه های برجستهٔ نثری و شعری آنها می توان باین نکته پی برد که شالودهٔ یکی از سبک و روش های ویژهٔ این عصر که بنام سبک هندی موسوم است، در هند استحکام پذیرفت و باوج خود رسید. ناگفته نگذریم که بعلّت یورشهای پی در پی و مساعی ارتشیان مغول کشمیر در سال ۹۹۲ هجری قمری استقلال خود را در زمان فرمانروایی اکبرشاه گورکانی از دست داد و بعنوان یکی از سرکارها (یعنی صوبه) بهند منسلک گردید. چون عنصر ایرانی مغول بکشمیر آمد و شد داشته اند و در نتیجه آن شاعران فارسی گوی کشمیر تحت تاثیر شاعران دربار مغول قرار گرفتند. لذا در نتیجهٔ تاثیر پذیری و آمیزش با شاعران دربار مغول سبک تازه ای یعنی سبک هندی که در هند نفوذ فوق العاده پیدا کرده بود، مورد توجه و تقلید شاعران کشمیری نژاد

قرار گرفت. شاعرانی مانند مظهری کشمیری، فانی کشمیری، غنی کشمیری بعمراو گویا بیدا شدند که سبک هندی را پیروی نموده اند ملّا ساطع کشمیری یکی از شاعران همین دسته بوده است که در اشعار خود پیروی از سبک هندی نموده و بالشت کاری فوق العاده و بزحمات خود یکی از برگزیدهٔ شاعران این سبک در آمده و بعنوان ستارهٔ درخشان در آسمان ادب فارسی ملادرخشد و نخواهد درخشید.

تذکره نویسان راجع به اسم ساطع اختلافِ نظر دارند. گروهی از تذکره نویسان وی را بنام ابوالحسن یاد میکنند علاوه بر این دیگر از تذکره نویسان اسم وی را ملّا عبدالحکیم نوشته اند محمد اعظم دیده مری صاحب واقعات کشمیر که با ساطع روابط دوستانه و صمیمانه داشته است و تقریباً بیست سال از محضر ساطع استفاده علمی می کرد. بعلاوه اغلب اوقات از وی اصلاح شعر هم می یافت، می نگارد که اسمش عبدالحکیم بوده است.[۲] اصلح میرزا مولف تذکرهٔ شعرای کشمیر که خود را بعنوان شاگرد ساطع معرفی نموده است، تائید میکند که اسم ساطع ملّا عبدالحکیم است[۳] اینکه بعضی از تذکره نویسان وی را ابوالحسن می پندارند کنیت وی است. در حالیکه ما در تائید این امر دلیل و براهین قاطعی بدست نداریم.

همانطور که تذکره نویسان درباره اسم ساطع باهم اختلاف دارند درباره اسم پدر ساطع هم همین مشکلات روبرو هستیم. بعضیها اسم پدر ساطع ملّا محمد علی کشمیری نوشته اند در صورتیکه محمد اعظم دیده مری و بعضی از تذکره نویسان و مورخان ساطع را پسر ملّا غالب می پندارند.

ساطع چطور ایام کودکی خود را بسر برده، ما درباره آن اطلاع قاطعی بدست نداریم و بدرستی نمی توان حدس زد که شاعر کی چشم بجهان گشوده است. اطلاعی که درباره ایام کودکی و طالب علمی وی بدست میرسد این است که وی طالب علمی می کرد و طبع موزون داشت و در ایام طفولیت و طالب علمی شعر میگفت و در وهله اوّل شاگردی لاله ملک شهید اختیار نمود. بیمن تربیتِ استاد در کمترین زمان در این فن تبحر پیدا کرد. حتی در فن شعر گوئی چنان پیش رفت نمود که لاله ملک شهید خود را شایسته تربیتِ او نیافته وی را بخدمت میرزا داراب جویا فرستاد[۵] بدین نحو ساطع شاگردی جویا اختیار نمود ساطع بکمک و معاونتِ میرزا داراب در جلسه ها و محافل علمی و ادبی آن زمان شرکت می جست. حتی که صحبت مجالست با استاد و بعضی از استادان معاصر آن روزگار طبع موزون ساطع را جلا بخشیده در شعر گوئی ترقی نمایان کرد و بر اقرانِ خود فائق شد. نکته سنجی که از استاد جویا یاد گرفته است ساطع استاد خود را بتعظیم النظیر یاد میکند:

مرا چو بندا استادان ز بهر نکته سنجیدن همین بس حجت ساطع که جویا بود استادم

ممدوحان ساطع: ساطع در کشمیر زندگانی خود را با نهایت فقر می گذرانید لذا مسافرت به پشاور نمود تا کسب معاش کند. در اثنای راه به ملا محمد سعید اشرف که یکی از شاعران بنام روزگار خود بوده است ملاقات نمود. چون طبع ملا را موزون و شیدا در شعرگوئی استعداد یافت شاگردیش اختیار نمود و اصلاح شعر از وی گرفت. پسر دوم عالمگیر محمد معظم در آن روزگار ناظم پشاور بود. وی خود هم شعرشناس بود و نیز شاعران و سخن سرایان را بسیار دوست می داشت. ساطع این موقع را غنیمت شمرده اول تقرب اسلام خان که میر آتش محمد معظم شاه بهادر بود، پیدا کرد و بعداً به رفاقت وی به دربار شاه بهادر پیوست. رساله مختصر بنام گلشن اسلام به نثر فارسی باسم اسلام خان نوشت. ساطع اکثر قصاید خود را بمدح همین اسلام خان سروده است. اینک نمونه هایی از آن در اینجا می آوریم:

۱- اسلام خان بهادر عالی جناب را | زیبا بود ز حلقه چشم ظفر رکاب

۲- من از نواب عالی دودمان اسلام خان گفتم | که آمد آسمان با ماه عید از جبهه سایانش

۳- یعنی آن نواب عالی دودمان اسلام خان | کز محیط همتش گردون بود کم از حباب

ساطع از اسلام خان احسان بیشتر دیده است خود می گوید:

گرچه فیض مهر یکسان میرسد ذرات را | ساطع ما دیده از نواب احسان بیشتر

وقتیکه عالمگیر فوت نمود محمد معظم بنام قطب الدین محمد معظم بهادر شاه بر تخت سلطنت هند جلوس نمود، شعر ساطع بیش از پیش رونق یافت و بدربار وی منسلک شد.

قطب الدین محمد معظم بهادر شاه ۱۹ ماه محرم ۱۱۲۴ هجری قمری فوت نمود و بعد از هرج و مرج نه ماه فرخ سیر پادشاهی یافت.

بمدح وی هم شعر گفته است. اشعار بعرض فرخ سیر رسانده و آن را وسیله تقرب و انعام و بخشش گردانید علاوه بر قصاید متعدد ساطع سه مثنوی مختصر از نظر همین پادشاه گذرانیده است و جایزه های فاخر بدست آورده است. اشعار زیر که بمدح این پادشاه از کلیات ساطع برگزیده شده است. بهترین دلیل برای این امر می باشد.

۱- ز توصیف شه اقبال مندی | به ایوان میرم شعر بلندی
زبان پیوسته میگردد بکامم | دهد نخل ثنا بار سلامم
بدرگاه شهنشاه حق آگاه | شه فرخ سیر غازی جمجاه

۲- بکام ساطع مدحت سرانجام | زبان گویاست بهر شکر انعام

بیا ساطع زبان رنگین بیان کن | رگِ ابرِ قلم گوهر فشان کن
بمدحِ آنکه آمد در شهان طاق | شه فرخ سیر غازیِ آفاق
ز مهر و مه ستاند تاج شه باج | که برد این سر فرازند ز معراج
چو دست شاه آمد گوهر افشان | فلک گردید سرتا پای دامان

در بیان ممدوحان ساطع باید عبدالعظیم خان، رضوی خان، امیر الامرا صمصام الدوله خاندوران و برادروی مظفر خان را اسم برد. ساطع در کلیات خود اشعار متعدد در مدح اینها دارد. وی رضوی خان را اینطور توصیف میکند:

رضوی خان که مهر مدحش کرد | مطلعِ رامشارق الانوار

در توصیف عبدالعظیم خان ساطع می گوید:

دید آفتاب کوکبهٔ عبدالعظیم خان | شان مبارزان فلک آقتدار را

در جای دیگر میگوید:

کجا بهدیه برد طبع من جواهر مدح | مگر بدرگه عبدالعظیم خان آرد

آخرین ممدوح ساطع امیر الامرا صمصام الدوله خاندوران بوده است. از الطاف و بخشش های این امیر ساطع بهره برده. وا ما دوری از وطن و سفرهای طولانی هند وی را ناراحت ساخته و از هوای سوزانندهٔ هند بسیار دل شکسته بود. لذا بفکر مراجعت کشمیر بود. صمصام الدوله شاعر را اجازه برای مراجعت بکشمیر داد. صاحب سفینهٔ هندی مینویسد:

"بخدمات عالیجاه امیر الامرا خاندوران خان بهادر پرداخته و بیمن تفضلات آن عالیجاه خدمتی در کشمیر یافت، آنجا رفت، چون قادری جاگیر هم در آنجا یافته بود، معیشت بخاطر جمع نمود."

صاحب روز روشن میگوید که: "بمدح صمصام الدوله قصیده های بلیغ گفته، بجایزه اش سیور غالی در وطن حاصل نمود."

اشعاری که ساطع در مدح صمصام الدوله سروده است بتعداد زیاد است و ما در اینجا نمی توانیم تمام آنها را نقل کنیم. اینک نمونه در اینجا نقل میگردد:

۱. نه خصوصِ سکندر بود اقبال جهانگیری | که ساطع خاندورانِ سپهسالار هم دارد
۲. بمدحِ خاندوران چون معانی ارتباط سازد | بساطع کی رسد سحبان فصاحت هم خبر دارد
۳. ثنای خاندورانِ بهادر پیشه کن ساطع | که غیر از مدح او مقصود ما زین فن نمی باشد

۴- قطع مشکل کند از بهر تو یکدم ساطع   خان دوران که ظفر خواند بصمصام او را

دیوان ص ۴۹) هم یکی از ممدوحان ساطع است. کلیات ساطع قطعه ای دارد که در مدح وی سروده شده است. یک بیت از آن درا اینجا نقل میکنیم:

بجز تو مدح و ثنا را بدرگه که برم   که مرجع بنود شعرا بجز دیوان

مسافرتهای ساطع: چنانکه قبلاً اشاره شد که ساطع بعلت کمبود سرمایهٔ زندگی و برای بدست آوردن معاش که از آن زندگی خود را اداره بکند، راه مسافرت را پیش گرفت. در ابتدا به پشاور رفت و چندین سال پشت سرهم در آنجا ماند و بالاخره بتوسط اسلام خان میرآتش شاه بهادر بدربار وی تقرب حاصل نمود. چون ممدوحش بدهلی رفت ساطع هم بهمراهی وی رهسپار دهلی گردید. و تا قتل رسیدن فرخ سیر که در سال ۱۱۳۱ هـ قمری بوقوع پیوست در دهلی ماند. اما چنان بنظر می رسد که وی از این مسافرتهای طولانی بسیار خسته و دلگیر شده بود. هوای گرم و سوزندهٔ هند وی را از پا درآورده بود کیفیت هوای پشاور را در اشعار خود اینطور بیان میکند:

قصد هلاک کرده هوای پشاورم   از تب فکنده بود در آتش سپندوار

جای دیگر دربارهٔ هوای گرم هند گله دارد و میگوید:

در هوای هند از نشو و نمای من مپرس   از گداز خود چو نخل شمع آبم داده اند

ساطع از سفرهای دراز بستوه آمده بود و خودش را در هند زنده بگور تصور میکرد چنانکه میگوید:

زنده در گور کرد این سفرم   درد شد صاف کامرانی من

چون آرزو برای برگشتن بوطن خود دارد لذا نیایش بدرگاه ایزد متعال میکند تا بوسیله حضرت امام موسی کاظم برایش راهی پیدا شود مراجعت بکشمیر کند. باشعار زیر توجه کنید:

شب از خرابی احوال خویش میگفتم   که می نخورده بدینسان کسی مباد خراب
سفر نمود تنک مایه ام چنانکه مرا   بجز هوای وطن نیست در گره چو حباب
خرد بگوش دلم این سخن نهانی گفت   که عرض حال بکن پیش آن رفیع جناب
امام موسی کاظم که مدح او ز قلم   نمود وقف کلیدی برای فتح الباب

جای دیگر میگوید:

نیم آن ریگ که در شیشهٔ ساعت باشد   روز و شب ارچه سفر کردن من در طینت

از اشعار زیر بر می آید که خاندوران ساطع را بالاخره بکشمیر فرستاده است. چنانکه می گوید :

فرستادی بگلگشت بهشت آباد کشمیرم   که غیر از همت بخشیده مور یرا سلیمانی

در عوض خدماتی که ساطع در دربار شاه بهادر انجام داده است ، بادشاه وی را در کشمیر جاگیر تفویض نمود چنانکه بدربار همین پادشاه بوده است که ساطع تقاضانامهٔ خود را برای اجرای جاگیر فرستاده است. و یک کپی از این تقاضانامه امروز در موزهٔ بریتانیا اشتباهاً با یک نسخهٔ نثری ملا طغرای مشهدی مضبوط است و دارای یک برگ است و شمارهٔ برگ[۸۶] دارد. صاحب مجمع النفایس می نویسند که صمصام الدوله ساطع را در کشمیر جاگیر تفویض نمود ولی چنانکه از اشعار ساطع روشن میشود که جاگیر تفویض شدن حق وی شامل لطف و عنایات شاه بهادر است. زیرا هنگامیکه کسی دست تطاول بسوی آن دراز کرده بود ساطع برای دادرسی اشعار زیر را بدربار پادشاه فرستاده بود :

مور در پیش سلیمان عرض حالی میکند   ذرهٔ پیش آفتاب آسمان عز و جاه

چند روزی شد که در دفتر خطِ انور رسید   گشت نازل گوئیا خط الشعاع از مهر و ماه

باوجود اینچنین لطفی که شد در حق من   باوجود این عنایات جناب پادشاه

ظالم از جاگیر من دست تصرف بر نداشت   من بدار العدل انصاف تو می کردم پناه

مجرّد بودن ساطع : در کلیات ساطع به بعضی از اشعار بر می خوریم که دال بر آن است که وی متاهل نبوده بلکه در تجرید زندگی بسر برده است آنجا که در شعر زیر جور و جفای روزگار را بیان می کند در ضمن آن اشاره به مجرّد بودن خود هم میکند :

برتنابداز تجرّد کلبه ام سامان فقر   موج سیلابست نقش بوریا در خانه ام

از اشعار زیر هم تجرید شاعر هویدا میگردد :

۱. گرچه تن چون صورت دیبا بکسوت داده ام   لیک میدارد تجرد همچنان عریان مرا
۲. هوای عالم تجرید در سر دارم آن طفلم   که باشد دامن صحرای امکان کاغذ بادم
۳. مرا عریان تجرد با جنون دارد درین وادی   نمیگنجم به پیراهن ز بس بالیده ام از شادی
۴. منصب آوارگی دارم تجرد مشربم   گردباد دشت عشقم خانه بردوش توام

فقر و گرسنگی ساطع : چنانکه گفته شد که ساطع از ممدوحان خود لطف و مهربانیهای فراوان دیده است.

ولی از اشعارش روشن میشود که وی زندگی خود را با نهایت فقر و گرسنگی بسر میبرد. به اشعار زیر توجه فرمائید:

وحشیم دارد بساط فقر گویا یافتند — از نی مژگان آهو بوریای خانه ام
فقر کی ساطع برد ما گوشه گیران از جای — این کشاکش بر ندارد چون کمان از خانه ام

چون ساطع از روزگار و اهل روزگار زجرها دیده است لذا از آنها نالان و بیزار بود. اشعار زیر بهمین مناسبت در اینجا نقل گردیده است:

خصم سرکشی کی حریف دیدهٔ گریان ماست — چهرهٔ گردون کبود از سیلی طوفان ماست
نان ما خونابه نوشان لالهٔ ما داغ دلست — هر که غم خوردن گوارایش بود مهمان ماست

بروایت تذکره نگاران وی دیوان شعر دارد. مولف سفینهٔ خوشگو درباره وی می نویسد که دیوانی ضخیم دارد. صاحب ریاض الشعرا میگوید که دیوانش از سه هزار بیت متجاوز است واما سراج الدین خان آرزو درباره دیوان اشعار او می نویسد که وی دیوان مختصری دارد. صاحب مخزن الغرایب تعداد اشعار ساطع را قریب چهار و پنج هزار مینویسد.

وفات ساطع: درباره تاریخ وفات ساطع مثل تاریخ ولادت وی تذکره نویسان باهم اختلاف نظر دارند. صاحب روز روشن سال وفات ساطع ۱۱۵۶ هجری قمری نوشته است و در سفینهٔ خوشگو و صحف ابراهیم تاریخ درگذشت وی ۱۱۵۰ هجری قمری درج است این اختلاف حتی تا آنجا رسیده است که بنظر بعضی از تذکره نویسان ساطع در دهلی فوت کرده. درباره سال وفات ساطع منابع قابل ملاحظه ای که از نظر تاریخی بسیار پر ارج هست واقعات کشمیر است و نویسندهٔ آن محمد اعظم دیده مری میباشد. دیده مری نه تنها معاصر ساطع بوده است بلکه میان وی و ساطع روابط دوستانه برقرار بود. علاوه بر این دیده مری از وی در شعر اصلاح هم میگرفت در هنگام وفات ساطع دیده مری زنده بوده است آنچه که وی درباره ساطع می نگارد از روی شواهد عینی است. لذا روایت وی بر تمام تذکره نویسان فوقیت دارد. درباره وفات ساطع وی مینویسد:

"(ساطع) بیست و یکم رمضان سال چهل و سه هجری (۱۱۴۳ه) رحلت نمود. عالمی را از خویش و بیگانه گرفتار تاسف و تلهف فرمود، بتخصیص راقم حروف که قریب بیست سال بفرط محبت و اتحاد مجلس آرائی صحبت و باده پیمائی الفت بذکر اشعار آبدار و طرح قافیه های لطف مقالات شعار چه در حضور و غیبت بزم طبع را راحت افزائی مایل بود. قرین درد فراق گذاشت و این تاریخ را راقم حروف عبدالله بن صفو بر نگاشت. تاریخ:

"نور ایمان بمرقدش ساطع"

« نور ایمان بمرقدش ساطع» برابر است با ۱۲۴۳ ه بر طبق روایت مذبور ساطع بیست و یکم رمضان المبارک ماه ۱۲۴۳ هجری قمری در کشمیر بجهان پدرود گفت.

آثار ساطع : طبع ساطع برای سرودن اشعار فارسی موزون بوده است. وی از آغاز زندگی بشعر وسخن علاقه داشت و پیروی از استادانِ بزرگ و سخنسرایان نامدار فارسی کرده تقریباً در تمام اصناف شعر مهارت بدست آورده بود کلیاتی که ساطع از خود باقی گذاشته است. شامل قصاید، غزلیات، قطعات، ترکیب بند، رباعیات مثنویات و منشآت است علاوه بر نظم و نثر ساطع در علم لغت نیز آشنائی داشت. چنانکه وی کتاب معروفِ لغت برهان قاطع را تلخیص نموده و سرنو آنرا ترتیب داده است و اسم آن کتاب محیطِ ساطع گذاشته بود

نسخهٔ کامل از کلیات ساطع در کتابخانه سازمان تحقیق واشاعتِ استان جموں وکشمیر سری نگر بشماره ۵۲۵ مضبوط است. ونسخهٔ دیگر از کلیات ساطع بشماره - در همین کتابخانه نگهداری میشود. کلیاتِ مورد بحث ۲ مثنوی، ۲۹ قطعه، ۴۶ قصیده، ۱ ترکیب بند، ۱۴ رباعی تقریباً چهارصد غزل و منشآت به نثر فارسی دارد.

این نسخه دارای ۱۸۲ برگ است هر برگ ۱۲ سطری کاغذ نسخه کشمیر برنگ نخودی جلد چرمین برنگ قهوه ای. اسم کاتب وسنهٔ استنساخ ندارد. سه مهر روی این نسخه ثبت است. مهری که برگ ۱۶۵ الف دارد متن آن این است. "سبهع رام سبها ۱۹۰۹ بکرمی"

برگ ۱۷ الف و ۱۸ الف مهر "ملا صدرالدین محمد" ثبت است.

برگ ۱۰ الف مهر "محمد منور" و سنه ۱۲۳۶ ه دارد.

با در نظر گرفتن عبارات و متن مهر های فوق میشود حدس زد که این نسخه قبل از سال ۱۲۳۶ هجری استنساخ شده باشد.

با این همه که از سه نسخهٔ دیگر دیوان ساطع هم اطلاع داریم اما هر یکی از اینها گزیده ای است لذا لازم است که هر سه دیوان را در اینجا اجمالاً معرفی بکنیم.

یک نسخه از دیوان ملا ساطع کشمیری در کتابخانهٔ آصفیه حیدرآباد (که کنون اسمش "آندرا پردیش گورنمنت اورینٹل مینوسکرپت لائبریری" شده است.) بشماره ۴۴۰ ثبت است. تعداد اوراق ۹۷، کاغذ کشمیری، جلد برنگ مشکی سرلوح مطلا نسخه جدولدار دارای ۴۰۰ غزل و ۴ رباعی.

نسخهٔ سوم دیوان ملا ساطع که در موزه سالارجنگ حیدرآباد (آندهرا پردیش) بشماره ۲۲۹۱ مضبوط است. دارای ۱۰۷ برگ است. هر صفحه دارای ۱۰ سطر. نسخه بخط نستعلیق متوسط استنساخ شده است. نسخهٔ مورد بحث ۱۲ قصیده، ۱ ترکیب بند، تقریباً چارصد غزل و چهار رباعی دارد.

نسخهٔ چهارم از دیوان ساطع در کتابخانه رضا رامپور ثبت است و ۱۴۹ برگ دارد.

چنانکه گفته شد که ساطع نثر خوب هم مینوشت و در آن مهارت وافر داشت. در فن نثر نویسی بی همتا بود محمد اعظم دیده مری در باره نثر نویسی وی می نگارد که "در نثر هم بی نظیر وقت بود". بقول صاحب مرآة آفتاب نما ساطع نثر خوب مینوشت. بروایت سفینهٔ هندی ساطع در نثر برابر نصیرای همدانی عبارت رنگین می نوشت.

یک نسخهٔ خطی خط نستعلیق از منشآت ملا ساطع کشمیری در کتابخانه دیوان هند بریتانیا بشماره ۲۹۴۲ مضبوط است که در یازدهم ماه ربیع الثانی ۱۱۷۷ هجری قمری استنساخ شده است گویا نسخهٔ مذبور فعلاً قدیم ترین نسخهٔ خطی از منشآت ملا ساطع کشمیری است. نسخهٔ دوم از منشآت ملا ساطع همانست که در آخر کلیات وی قرار میگیرد در سازمان تحقیق و اشاعت استان جموں و کشمیر نگهداری میشود.

مطبوعات خدابخش لائبریری، پٹنہ

قیمت

۱۔ ایک مشرقی کتابخانہ: خدابخش لائبریری کا تعارف از اطاکرم برق (انگریزی) 15/-

۲۔ خدابخش: خدابخش لائبریری کے بانی کی ایک مختصر مگر جامع سوانح از سر جدو ناتھ سرکار اور صلاح الدین خدابخش (انگریزی) 15/-

۳۔ منصوری کا تاج محل: خدابخش لائبریری میں محفوظ اپنی نظیر کے ایک نادر مخطوطہ تاریخ خاندان تیموریہ کا تعارف اور نوادر کی ۱۲ رنگین تصاویر۔ (انگریزی) 15/-

۴۔ مجموعۂ مقالات پروفیسر سید حسن عسکری، پہلی جلد: شیخ ارشدی، شرف الدین یحییٰ منیری، زین بدر عربی اور ایک [illegible] پر مضامین۔ (انگریزی) 10/-

۵۔ تدوین متن کے مسائل: خدابخش سیمنار کے مقالات اور مباحثے (اردو) 15/-

۶۔ پنڈت موتی لال نہرو کا خطبۂ صدارت: انڈین نیشنل کانگریس کی یو پی کی پہلی صوبائی کانفرنس (۱۹۰۷ء) میں: ایک اہم دستاویز (اردو) 10/-

۷۔ فرہنگ آصفیہ، مولفہ سید احمد دہلوی پر تبصرہ عظیم محقق قاضی عبدالودود کے قلم سے (اردو) 10/-

۸۔ بہار اردو لغت جلد اول: فرہنگ بہار از یوسف الدین احمد [illegible] (م ۱۹۶۱ء): بہار میں عام طور پر بولے جانے والے الفاظ اور محاورات کی ایک اہم لغت (اردو) 15/-

ترتیب و تدوین

۹۔ مجمع النفائس از سراج الدین علی خان آرزو (م ۱۱۶۹ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعراء کا ایک اہم تذکرہ (فارسی) 10/-

۱۰۔ باغ معانی از نقش علی (م ۱۱۔۔ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعراء کا دوسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10/-

۱۱۔ صحف ابراہیم از علی ابراہیم خان خلیل (م ۱۲۰۸ھ) بارہویں صدی ہجری کے شعرائے فارسی کا تیسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10/-

۱۲۔ مثنوی تصویر محبت از شمس الدین فقیر (م ۱۱۸۳ھ) عظیم آبادی کی ایک داستان محبت جو ہیر کی شاعری عشق کا ماخذ ہی (فارسی) 10/-

۱۳۔ شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان از مرزا جان طپش (م ۱۲۲۹ھ): شاہ عالم کے عہد کی محاورات اردو کی لغت 10/-

۱۴۔ تاریخ ہائے پیدائش و وفات معاصران: قطعات عبرت از شمس العلماء محمد عبرت عظیم آبادی (م ۱۳۰۴ھ) (فارسی) 10/-

۱۵۔ کنز تاریخ: شاہ نعیم یحییٰ عظیم آبادی (م ۱۳۰۲ھ) کے قطعات تاریخی (فارسی) 10/-

۱۶۔ تذکرہ کاملان رام پور: مرتبہ حافظ احمد علی خاں شوق (م ۱۳۴۲ھ) (عکسی اشاعت ۱۹۲۹ء) امتیاز علی عرشی کی انتخاب یادگار کے عہد تک رامپور کے شاعروں اور روہیلوں کی تہذیبی تاریخ کا تنہا ماخذ، تقریباً ۲۰۰۰ مشاہیر رامپور کا تذکرہ تصحیح و اضافے کے ساتھ۔ (اردو) 50/-

رسائل کے ذخیرے سے اردو ادب کی بازیافت

۱۷۔ جلد اول: ادیب الٰہ آباد: نوبت رائے نظر کے ماہنامہ ادیب الٰہ آباد کے کل فائل (۱۹۱۰-۱۲ء) سے ادبی، علمی، تہذیبی، لسانی اور سیاسی مضامین کا ایک انتخاب۔ 45/-

۱۸۔ جلد دوم: العصر لکھنؤ: جیالے لال ناگ کے ماہنامہ العصر لکھنؤ (۱۹۱۳-۱۷ء) کے تمام دستیاب شماروں کا انتخاب جس میں ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ فلسفہ، سائنس اور صنعت و حرفت پر بھی مضامین شامل ہیں۔ ۲۲ مشاہیر کی نادر عکسی تصاویر کے ساتھ 45/-

۱۹۔ جلد سوم: صبح امید، لکھنؤ: برج نرائن چکبست کے ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ (۱۹۲۱-۱۹۱۰) کے مکمل فائل سے ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ تحریک آزادی کی معاصر دستاویزات اور انقلاب روس کے ہندوستان پر اثرات سے متعلق مضامین کا انتخاب 45/-

۲۰۔ ۱۹۳۶ میں قاضی عبدالودود کا معیار: قاضی عبدالودود کے تحت اردو ماہنامہ "معیار" پٹنہ (۱۹۳۶) کے مکمل فائل کی عکسی اشاعت، ایک طویل تعارفی شذرہ کے اضافہ کے ساتھ 45/-

۲۱۔ جدید غزل گو: ۱۹۳۱ کی ایک دستاویز، نیاز فتح پوری کے ماہنامہ "نگار" ۱۹۳۲ کے خاص نمبر کی عکسی اشاعت، ۱۹۳۰ تک کے غزل گو شعراء کا خود انتخاب کردہ کلام، خود نوشت سوانح، شعراء کی اسی عہد کی تصاویر اور خود نوشت تحریریں۔ 35/-

• **خدابخش سلسلۂ خطبات**

۲۲۔ عہد سلطنت (۱۲۰۶-۱۵۲۶ء) کے صوفی ادب پر ایک طائرانہ نظر: از ڈاکٹر بروس بی لارنس (امریکا) (انگریزی) 10/-

۲۳۔ عہد نبوی کی تقویم کی تشکیل نو: از ڈاکٹر ہاشم امیر علی (انگریزی) 10/-

۲۴۔ فارسی اور ہندوستان: از پروفیسر نذیر احمد (اردو) 10/-

۲۵۔ میری تنقید: ایک بازدید، از پروفیسر کلیم الدین احمد (اردو) 10/-

۲۶۔ صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات: سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ، از پروفیسر سید حسن عسکری (انگریزی) 10/-

۲۷۔ اسلام کی چودہ صدیاں مکمل ہونے کی تقریب میں: ہند مسلم مسئلہ اور اسلام و عصر جدید کے بارے میں چند خیالات از ڈاکٹر عابد حسین (انگریزی) 10/-

۲۸۔ فارسی ادبیات میں ہندوستان کا حصہ، جدید تحقیقات کی روشنی میں، از ڈاکٹر امیر حسن عابدی (انگریزی) 10/-

۲۹۔ فکر اسلامی: بدلتی دنیا میں، از پروفیسر رشید احمد الدین (انگریزی) 10/-

۳۰۔ مشرق وسطیٰ: (شمالی افریقا اور مشرق وسطیٰ) از پروفیسر آصف فیضی (انگریزی) 10/-

۳۱۔ بین المذاہب عالمی مکالمہ: ایک تاریخی جائزہ اور ایک مذہبی واردات، از ڈاکٹر آر ولیم کینٹول اسمتھ (انگریزی) 40/-

۳۲۔ افکار رومی: از عبدالسلام خاں (اردو) 40/-

• **فہارس مخطوطات خدابخش**

۳۳۔ مفتاح الکنوز: جلد اول — سوم (فہرست مخطوطات عربی) فی جلد 10/-

۳۴۔ مرآۃ العلوم: جلد اول — سوم (فہرست مخطوطات فارسی) فی جلد 10/-

۳۵۔ فہرست مخطوطات اردو جلد اول 10/-

• **توضیحی کیٹلاگ: مخطوطات خدابخش (انگریزی)**

۳۶۔ جلد اول و دوم: مخطوطات فارسی (شعر فارسی) جلد ۷: مخطوطات فارسی (تاریخ ہند)
جلد ۲۹: مخطوطات عربی (قرآنیات) جلد ۳۰: مخطوطات عربی (حدیث)
جلد ۳۱: مخطوطات فارسی (شعر فارسی، تاریخ، سوانح اور قصص) جلد ۳۲: مخطوطات فارسی (دائرۃ المعارف، سائنس، طب، منطق اور اخلاقیات)
جلد ۳۳: مخطوطات عربی (فقہ اسلامی) فی جلد 50/-

• **خدابخش لائبریری جرنل (سہ ماہی)**

۳۷۔ خدابخش لائبریری جرنل: اردو، انگریزی، عربی و فارسی چاروں زبانوں میں مضامین شائع کرنے والا ایک سہ ماہی تحقیقی مجلہ، ۱۹۷۷ سے جاری، اب تک ۲۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

قیمت فی شمارہ: 15 روپے

سالانہ: 60 روپے (ہند) 12 ڈالر (ایشیا)، 24 ڈالر (دیگر ممالک)

تازہ مطبوعات

۱۔ امیر خسرو بحیثیت مورخ (دوم): از پروفیسر حسن عسکری (انگریزی) 25/-

۲۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل: از سید حامد 30/-

۳۔ طب اسلامی: جنوبی ایشیائی علاقائی سیمینار: روداد و مقالات 50/-

۴۔ رقعات رشید صدیقی: از ڈاکٹر مسعود حسین 30/-

۵۔ قومی یکجہتی کی روایت : از بی۔ان۔پانڈے	5/-
۶۔ مولانا آزاد کی یادیں : (ہندی)	15/-
۷۔ خوشتر منگروری کا رسالہ 'زبان' ۱۹۲۶ء (مکمل عکسی نائل)	50/-
۸۔ اسلامک اسٹڈیز : از ڈاکٹر زبیر صدیقی (انگریزی)	10/-
۹۔ علیگڑھ تحریک : از سید حامد	5/-
۱۰۔ سجاد حیدر یلدرم : از ترکمان ایرکمان	10/-
۱۱۔ اسلام اور ہندستان : از بی۔این۔پانڈے	10/-
۱۲۔ اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر : از ڈاکٹر اوم پرکاش (ہندی)	15/-
۱۳۔ آثار آزاد : خطوط آزاد بنام رنجور عظیم آبادی : از قدرت اللہ فاطمی	30/-
۱۴۔ ہندستانی مسلمان عصری دستاویزات کے آئینہ میں	50/-

It passed through many stages of growth during the period of Industrial Revolution in Europe. The Arabs took off from where the Greeks had left and the west took off from where the Arabs had left.

In conclusion we may say that it is absurd to say that *Tibb or Arabian* medicine in India is eastern and that Allopathy is western. They are the two branches of the same tree. The difference lies in their evolution and progress. Most of the Muslim countries today have adopted Allopathy and have given up Tibb. But in India the tradition continues. It has survived mainly for two reasons : In the first place, it is cheaply available in the masses and secondly, until the nineteenth century, there was no competition with Allopathy which gradually became popular after the domination of the British in India. Prejudices against Allopathy, however, do continue to remain in the minds of the masses, but these are gradually dying out. Another aspect of its popularity is that it avoids operations and drugs are prepared by the physicians himself or ingredients recommended by him which are acquired by the patient. With dawn of the twentieth century, **Tibb** came under the direct influence of Allopathy, its twin sister which posed as a forceful competition. This century has produced, however, eminent physicians like *Hakim Ajmal Khan* of Delhi. He is well known for his invention, the Ajmaline. Modern Muslim Physicians like *Hakim Abdul Hamid* of Delhi are paying greater attention to research in **Tibb** and are thus modernizing the ancient science. Let us hope that **Tibb** will bear the scientific rigours of modern times and shall become a supporter of Allopathy rather than remain its adversary. Allopathy, however, has no limits in its scope and incredible achievements today due to the advancement of science and technology.

—:-:—

new theory or concept was met with severest opposition from the Church and anything that did not conform to the teachings of the Bible was denounced as a heresy. In medicine, a critical attitude developed. Experimentation was emphasized. The Arabic texts were studied from a critical point of view and were compared with the original Greek texts Thus developed a tendency against Arabism. The medical students in Madrid revolted against study from the term above and learnt the works, of Galen and Avicenna. Paracelsus (d-1541) who reformed alchemy and medicine openly revolted against Galen and Avicenna and burnt their works in the market-place openly. In the same century, Harvey propounded his blood circulation theory. Traditionalism in medicine thus released itself from the dogmatic influence of Christianity as well as from traditionalism in education. Paracelsus also freed chemistry from the concept of soul, spirit, etc. which had dominated it from the ancient times. It was thus that Arabian medicine took a new turn in Europe. Anatomy and physiology were studied afresh by dissecting bodies and such other experiments. The second major step forward was taken in the nineteenth century when the bacteria was discovered as the cause of diseases. Muslim physicians of Spain had freed themselves from the theological prejudice which regarded plague as a divine punishment and considered the epidemic (Black Death, 14th century) as a contagion. But the sources of the disease had not yet been discovered. This was done in the nineteenth century. The doctrine of the contagious character of the disease was not emphasized by the Greek physicians and was almost passed over by most medieval medical writers.

It was the new shape of the ancient Greeco-Arab medical science as it appeared in Europe from the sixteenth century onwards that came to be known as *Allapnthy*.

Allopathy has, therefore, incorporated in it the human experience of medical knowledge of over two thousand years. It has in it the elements of ancient Greek system, the ancient Iranian and Indian systems which had enriched the Arabian medicine in the middle ages, and above all, the rich experience of the Muslim physicians of over four centuries. Today, it is a universal science incorporating in it the major portion of human medical experience.

Inspite of the shortcomings of the Muslim physicians and in the face of all the restrictions imposed by religion against dissection, etc. it can be said with authenticity that Muslims' contribution to medicine was in no way insignificant. Apart from the development on the clinical side, they advanced surgery though in a limited way. Instruments used by the surgeons could have improved and become refined if chemistry and matellurgy were allowed to grow after the eleventh century as they did before. They used a variety of anaesthetic material to make the patient go to deep sleep before any operation. They looked down upon the method of surgery as used in contemporary Europe. They specialised in drugs and produced pharmacopoeias of immense utility to the physicians. Above all, they made significant contribution in diagnosis and methods of treatment which was purely pragmetic. It is their big experienc in diagnosis and treatment of disease as recorded in the extant medical literature that forms an interesting source material for research and investigation on the drugs and the compounds prepared by them. Chemical analysis of the ingredients of the medical plants, minerals, etc. used by them would reveal a host of valuable knowledge for modern medicine. Thus, although they did not produce a William Harvey or a Louis Pasteur, but they certainly produced an Alhazen or an Avicenna whose works remained the sole texet-books taught in Europe till the seventeenth century.

The causes of the general stagnation of the Islamic Sciences from the 12th century downwards were in my opinion (1) growth of orthodoxy in Islam from the time of al-Ghazzali, (2) change of the educational system, (3) rise of *fundamentalism* in Islam from the time of the Turkish invasions (4) lack of patronage on the part of the Musilm rulers of the sciences except a few; and (5) the entry of the portiguese in the Indian occean. When Harvey discovered the blood circulation, medical knowledge of both the east and the west was at the same level. It was only when the west was able to have direct access to Greek texts that the European physicians were able to compare them with their Arabic commentaries and were able to judge the comparative value of the two. This was the beginning of the Renaissance in Europe. Science was struggling against the hold of the Church and against traditionalism. Every

Among them was special type of syringe, double barrelled, for extracting sceptic material from the body. However, surgery could not advance much, because of the theological concepts that flesh was impure and that genital organs should always remain covered, came in the way of the surgical operations. These ideas were propagated through the commentaries and given wide publicity by those who wanted to keep the position of the surgeons inferior to that of the physicians. Although the surgeons were not looked down upon by the physicians as they were in medieval Europe, Avicenna, according to Elgood, is partly responsible for forcing this positions upon the surgeons. The commentaries spread the lies for it fitted well with the theological concept of the impurity of flesh. But Haly Abbas considered treatment by drugs and treatment by surgery of equal importance, though he gives surgery a secondary position in his treatise '*Liber Regius*'. The surgeons figured on the staff of the hospitals of Baghdad as equals of the physicians.

Muslim scholars and physicians did not make any significant advance in increasing their knowledge of the body itself, and depended upon the theoretical knowledge and concepts acquired from the Greeks. E. G. Browne rejecis the story given in *Nam-a-i Danishwaran* that Yuhanna b. Masawayh dissected bodies of monkeys acquired from Nuba for its soruces. Ibn Abi U aybi'a does not give full details of it. He was, therefore, of the opinion that to accept the story of Ibn Abi Usaibi'a there is no other authentic and dependeble evidence. Whatever the truth of the srory the fact remains that, generally speaking, human bodies were not dissected by the physicians. Had they done so, they would have revolutionalized theoretical knowledge and would have long discarded the Greek theories. This did not happen in the history of Unani medicine. This took place in Europe when the texts of Galen and Avicenna were discarded and the physicians turned to the body directly. As a result new theories arose and were propounded on the basis of direct experience of the body. Ibn al-Nafis is, credited with the discovery of the theory of blood circulation long before Harvey. Was it based on dissection or mere conjecture ? This is a most point.

Finally, two bio-bibliographical works of high importance were written, one by al-Qifti (d. 1248) and the other, Ibn Abi Usayb'a's work (d. 1270).

From the eleventh century onwards, the works of the Muslim physicians and their knowledge passed on to Europe through translations into Latin from Arabic, mainly from Spain and Sicily. Eleventh century also marked the period of the stagnation of Arabian medicine, as well as of general stagnation in most of the sciences. Many of the modern historians of science writing on Islamic sciences have raised the question as to the causes of the general intellectual decline from this period onwards and generally agree upon it, but none has so far been able to give a satisfactory answer. I have done some thinking of the subject.

But before going into this general question which affected the future development of medicine also, let us explain to the lopsided growth of mdicine itself up to the eleventh century. The Greeks, had the theory of medicine. The Muslim physicians, on the other hand, added to medical knowledge by referring to clinical and therapeutic experience only. They leave the theory and the thought of the Greeks untouched. They would have improved and added to the theoretical side also provided there were no religious or social taboos against dissecting the bodies. Science cannot advance unless theory and practice go hand in hand. Max Meyerhof points out, 'It must be remembered that Muslims were strictly prohibited from dissecting either human bodies or living animals. Thus experiment was practically impossible in medicine, so that none of Galen's anatomical and physiological errors could be corrected. E. G. Browne is of the opinion that there was no practice of dissecting the bodies. However, considerable advance was made by the Muslim physicians on the clinical side. The hospital system (bimAristAn) was developed. Doctors visited the patients in the hospitals and even took classes there. Hygienic sites were selected for the establisment of the hospitals. Nursing system neither developed in east nor in the west until the time of Florence Nightingale.

Muslim physicians also practised surgery and operations were performed. Operations of the eye were the most advanced. A number of instruments for operation were invented and developed.

of great independent thinkers, it was certainly a very important factor in their supperession. The twelfth century was the watermark in medical activity. The work of Rhazes, Avicenna, and 'Jabir' were reproduced, summarized, commented on, but outstanding works became rare.

During this period *Pharmacological* treatises abound and later Arabic books on compound remedies are still in fervour. With the beginning of the fourteenth century, magic and superstitious practices began to creep into the medical works of the Muslim writers whose medical knowledge was often derived from religious writings. There is thus a further deteriorations of the general standard of the material.

In Spain the philosophical bias predominated among medical men. Ibn Zuhr (d.1162) displayed disdain for surgery and surgeons and was a more consulting physician than a general practitioner. Averros reveals himself as an Aristotelian thinker, particularly in the second part of his book *Kulliat fi'l Tibb* where he deals with physiology and psychology. Often he pits the opinions of Rhazes and Evezoar against those of Hippocrates and Galen. The great plague of the fourteenth century, the '*Black Death*' furnished an occasion for Muslim physicians in Spain to free themselves from theological prejudices which regarded plague as a divine punishment and to consider the epidemic as a contagion. To appreciate the teaching of these writers it must be remembered that the doctrine of the contagious character of disease is not emphasized by the Greek physicians and is almost passed over by most medieval medical writers. In the sciences other than medicine the output of books during the period of decline was very great, but the deterioration no less marked. There are known books of some forty Arabic and Persian alchemists after the eleventh century. Yet their works add very little to the subject. Ibn Khaldun was a violent opponent of alchemy. Prominent in optics was the Persian Kamal-al-Din (dc. 1320) who repeated and improved on Alhazen's experiments with the *Camera obscura*. He also observed the path of the rays in the interior of a glass sphere in order to examine the refraction of sunlight in raindrops. This led him to an explanation of the genesis of the primary and secondary rainbows.

Baghdad (Jesu Haly) and Ammar of Musul (Canamusali) left two excellent treatises, increasing the Greek canon of ophthalmology with numerous additions, operations and personal observations. Both were translated into Latin and were the best text-books on eye-diseases until the first half of the 18th century when the Renaissance of ophthalmology set in France.

Optics was developed to its highest degree by Abu Ali al-Haytham (Alhazen) (965). Alhazen opposes the theory of Euclid and ptolemy that the eye sends out visual rays to the object of vision. His name is still associated with the so-called 'Alhazen's problem'. He examined the refraction of light-rays through transparent mediums (air, water). In detailing his experiments with spherical segments (glass vessels filled with water), he comes very near to the theoretical discovery of magnifying lenses, which was constructed practically in Italy three centuries later. Roger Bacon and all medieval Western writers on optics—the Pole Witelo or Vitellio—base their optical works largely on Alhazen's *Opticae Thesaurus*. His work also influenced Leonard de Vinci and Johann Kepler. The latter modestly entitled his fundamental work on dioptrics *Ad Vitelionem Praralipponena* (Frankfurt 1604). Most of Alhazen's successors did not adopt his theory of vision, but al-Biruni and Avicenna share independently and fully his opinion that it is not a ray that leaves the eye and meets the object that gives rise to vision. Rather the form of the perceived object passes into the eye and is transmuted by its transparent body (i. e. the lens). The lens played an important role in the period of industrialization; it was fitted to the telescope which revaluationized astronomy. He wrote on physical optics and a book *on Light*. Light he regarded as a kind of fire that is reflected at the spheric limit of the atmosphere. Other of his treatises deal with the rainbow, the halo, and with spherical and parabolic mirrors, etc.

Whilst the orthodox thinkers of early Islam generally tolerated the growth of sciences and philosophy we may say that, from the time of the great religious teacher al-Ghazzali (d. 1111) onwards, this tolerance gave place to disapproval of these studies 'because they lead to loss of belief in the origin of the world and in the creator'. Whether or not this attitude was alone sufficient to prevent the rise

and apparatus, which is always devoid of mystical element. While 'Jabir' and the other Arabian alchemists divide mineral substances into 'Bodies' (gold, silver, etc.) 'Souls' (sulphur, arsenic, etc.), and 'Spirits' (mercury and sal-ammoniac), Rhazes classifies alchemical substances as vegetable, animal, or mineral, a conception which comes from him into modern speech.

'Jabir' (Geber to the Latin West) is not the same as the eight-century mystic of the same name. The works produced in the tenth century bearing that name were probably the works of a secret society similar to *Ikhwan-al-Safa* (Brethren of Purity). Due to the mystical tendencies derived from the Gnostics and the neo-Platonists, alchemy tended to become the subject of ineffable speculation and superstitious practice, passing into fraudulent deception. 'Jabir' clearly emphasized the importance of experiment than any other early chemist. Thus he was enabled to make noteworthy advances in both the theory and practice of the subject. His influence can be traced throughout the whole historic course of European alchemy and chemistry.

Haly Abbas (d. 994) was another important physician who composed an excellent and compact encyclopædia *al-Kitab al-Maliki* which deals with both theory and practice of medicine. It begins with a critique of previous Greek and Arabic medical treatises.

Abu Ali al-Husayn b. Sina (980-1037) was one of the greatest scholars of the Islamic world, though less remarkable as a physician than as a philosopher and a physicist. He concentrated the legacy of the Greek medical knowledge with the addition of the Arabs' contribution in his *al-Qanun fi'l-Tibb*, which is the culmination and masterpiece of Arabic systematization. With him, 'the Prince of Chief Physicians' Islamic medicine reached its zenith in the East.

During this period treatises on simple drugs were also written which formed parts of the great encyclopaedias, but were also composed as separate monographs.

Ophthalmology was another branch of medicine which reached its height about 1000 A. D. The Christian oculist 'Ali b. 'Isa of

works on medicine based on Greek medical science enriched by Indian system of medicine. Among the typical works produced by them were "pandects" and "cram books". The pandects were recapitulations of the whole of medicine, discussing the affections of the body, systematically beginning at the head and working down to the feet, but most of these are lost. These were typical of the period of Arab learning. Another type of medical literature was "the cram book" in the form of questions and answers, which gave to medicine its scholastic aspect. Again, pharmacological and toxicological treatises were composed by Arab physicians from Jabir b. Hayyan downwards. Medicine now passed from the hands of Christians and Sabacans into the possession of Muslim scholars, mostly Persians. Instead of pandects compiled from antique sources, imposing encyclopaedias were composed. From the ninth to the eleventh century, for about three hundred years, the Islamic world produced a galaxy of physicians, some of whom were the greatest of all times.

Among the great names of the period we have that of Muhammad b. Zakariya al-Razi (c.865-925), who was known as Rhazes in the Latin west. He produced more than 200 works, half of which are medical. His writings included many short missives of an ephemeral character. He also wrote on anatomy and the most celebrated of all of his works is : *On small-pox and Measles* which is "the first clear account of these two diseases which has came down to us". He gives sound and detailed advice as to the treatment of the pustules after the full development of small pox. But his greatest medical work is *al-Hawi. i. e.* "the Comprehensive Book" which included Greek, Syriac, and early medical knowledge in their entirety. It also includes a chapter on ophthalmology. For each disease Razi first cites all the Greek, Syrian, Arabic, Persian and Indian authors, and at the end gives his own opinion and experience and preserves many striking examples of his clinical insight.

In *alchemy* (chemistry), although dependent partly on the same sources as 'Jabir', Rhazes excels him in his exact classification of substances, and in his clear description of chemical processes

capital, Christian doctors visited the Umayyad court and popularized the science among the Arabs. But it was not until *Banu Abbas* came to power and established Baghdad as their capital that Greek medicine truly flourished all over the Islamic world. The well-known family of the *Bakhttishu'* served the cause of medicine during the Abbasid period. It was the genuine interest of the early Abbasids, their liberal attitude towards learning and patronage of scholars, establishment of research centres, that served the seeds of intellectual and literary activities. The intensive translations activity in the early stages inculcated a passion for Greek, Iranian and India n knowledge. This intellectual activity ultimately resulted in the Islamic renaissance which lasted until the 15th or the 16th century A.D. J.D. Bernal views it differently. In his opinion it was the continuation of the Greek tradition and may be described as a delayed action. But it was not simply a delayed action. The Muslim savants revived and, in fact, preserved ancient knowledge not only of the Greeks but also of the Iranians and the Indians through the translations. They went a step further : they not only learned the sciences but made original contributions in several disciplines like astronomy, algebra, chemistry, physics, geology, mechanics, logic, medicine, geography, philosophy and so on. Their knowledge was didactic encompassing the knowledge of several ancient civilizations.

Among the translators in the field of Medicine, the most prominent name was that of Hunayn b. Ishaq who was responsible for translating "practically the whole immense corpus of Galenic writings". His son Ishaq and nephew Hubaysh also made important contributions in this respect. Hunayn, in the opinion of Max Meyerhof, gave his supreme position in the east during the medieval period and indirectly also in the west. ? In the early period, both Syriac and Arabic translations were prepared but in the later half of the ninth century, Arabic tronslations increased in number and the centre of medical learning shifted from Jund-e-Shapur to Baghdad and Samasra. Thus, for nearly three centuries beginning from the period of translations, Christian, Sabacan, Jewish and Muslim scholars produced

rather "second class" in medical heirarchy. Hence, the term is used even today in a derogatory sense. But the term "*hakim*" (Philosopher) as used for a physician in India, was a respectable term and was synonymous with the term "doctor". Hence, both the terms "*hakim*" and "doctor" came to be used in east and the west in place of a '*tabib*" and "physician" which are more appropriate for the profession.

Until the dawn of the Industrial Revolution, or the 17th century, Greek medicine had not branched off into *Tibb* and Allopathy. It was taught largely on theoretical basis and practicals were shunned. It was from this period onwards that the teaching methods and the syllabi took a different course in Europe. This gave rise to Allopathy and *Tibb-i-Unani* lagged behind.

In order to get a clearer picture of the growth of Greek medicine in the medieval period, let us now examine the social, Intellectual and educational factors that gave rise to the break-up of the system into two branches. This will place both the branches in their proper and correct historical perspectives. It will also reveal the causes of the advancement of Allopathy and those of *Tibb's* stagnation in the east.

Ample work has been done by modern orientalists on how Greek medicine survived at different centres of learning like Rome, Alexandria, etc. and how it then passed on to the Islamic world after the rise of Islam. However, long before the rise of Islam, it had ceased to be a living force.[1] Although there is evidence of the existence of a system of medicine current in Arab before the rise of Islam, but it could hardly have been a scientific system. About the middle of the sixth century, A. D., there arose in Jund-e-Shapur (Iran), an important medical school at which the Nestorian Christians played an important role in introducing the ancient Greek system of medicine. When *Banu Umayya* established their gavernment with Damascus as the

---

1. Max Meyerhof. The Legacy of Islam (Old ed.), P. 312

knowledge had the priority in this respect. But once the Greek knowledge was actually transmitted through Arabic translations of Greek or Syriac original treatises, it acquired ascendancy and became popular. Indian Ayurvedic system gradually receded and then lost its importance. It was largely because of its therapeutic value. Although, the ancients like Susrud and Charaka, had developed surgery and performed delicate operations, this was not continued by the Indian surgeons or physicians of Baghdad.

In the early stages, Greek medicine was introduced to Europe through Latin translations of Arabic classics on the subject which in turn were based on Greek sources. By the eleventh and twelfth centuries Unani medicine was fairly advanced in the Islamic world. Western physicians during this period learned and taught the science either directly through Arabic or through their Latin translations. During this early stage, eminent scholars of Arabic like Adelard of Bath, rendered Arabic scientific works into Latin. Spain in the West and Sicily in the south were the main centres of Islamic-Arabic learning which were visited by these scholars and knowledge—philosophy, astronomy, mathematics, physics, chemistry, etc.—was transmitted by them to Europe. In fact, these literary activities helped a great deal in ushering in the age of Renaissance in Western Europe. However, it was not until the fall of Constantinople and its conguest by the Ottaman. Turks in 1453 that the renaissance movement received an impetus Christian scholars of the erstwhile Byzantine empire migrated to Western Europe introducing original Greek works on science and philosophy. Thus, Western Europe got a direct access to the Greek works at a time when they were already acquainted with part of it in Latin translations of Arabic works. The fall of Constantinople was a political victory for the Turks but it was also a boon for Western Europe intellectually.

Greek medicine, therefore, acquired a new footing and the classics of Greek as well as Muslim physicians, philosophers and doctors continued to be taught in both the east and the west. The term *tabib* in Arabic was applied to a physician and the term "*Jarrah*" to a surgeon. However, the latter were considered

There is a general impression in India and elsewhere too, that **Unani** 'Greek' medicine or *Tibb* and Allopathy are totally two different systems of medicine, unrelated to each other. That the former is 'eastern' while the latter, 'Western'. It is to clear this notion that I have ventured to state the correct historical position of the two systems. Then, there is a tendency, again based on similar notion, among the practitioners of both the systems, to belittle each other or to consider the other person's system inferior to his own. The historical truth, however, is that, in the ultimate analysis, both the systems, namely Unani and Allopathy have their genesis in the ancient Greek system. The very word "Unani" is derived from "Ionian", and throughout the medieval period, it was known as Greek medicine. If one is to look at the two systems historically, one will find that the difference arose in the latter medieval period as a result of the lack of progress of the one and the advancement of the other. Hence, it is the degree of evolution and scientific growth that demarcated the area of one from the other and a cleavage took place between the two in modern times.

The Greek system of medicine was adopted and practised by the Muslims from the Abbasid period(from the 8th century A. D.) when translations of masters like Hippocrates and Galen were made. The translation activity continued for quite some time and made Greek Medicine popular in the Islamic world. It may be pointed out, however, that even before the transmission of the Greek medical science through the translations, ancient Indian systems of medicine had become known to the Muslim scholars of Baghdad. In the case of the Indian system called Ayurved, the works of Susrud and Charaka were rendered into Arabic from Sanskrit through the efforts of the Indian scholars who took the medical treatises to Baghdad, and popularized them there. Indian physicians established their practice in Baghdad and were quite popular with the elite of the society.

Greek medical as well as other scientific knowledge, especially astronomy and mathematics was a late comer; Indian

Prof. S. Maqbul Ahmad (b. 1920 Approx.). Took his M. A. from the University of Bombay and B. Litt. and D. Phil. from Oxford University. He served Aligarh Muslim Uuiversity for over 28 years. He established serveral deptts. in the Universites of Aligarh and Kashmir. He also served Kashmir Univesity as Director, Centre of Central Asian Studies. He is fellow of the Royal Asiatic Society, London, Member, German Oriental Society and Hon. Member of the Royal Jordanian Society for Islamic Civilisation Research.

He is the author of a number of books and articles on Islamic history and geography, among them Al-Idrisi, India and the Neighbouring Territories, Leiden, Al-Idrisi, Opus Geographicum, Rome and Naples (ed.); Indo-Arab Relation, ICCR, New Delhi, articles in the Encyclopaedia of Islam (New edition). Leiden, Dictionary of Scientific Biography, New York.

Khuda Bakhsh Extension Lectures 1985

UNANI MEDICINE AND ALLOPATHY
A COMPARATIVE STUDY

by

PROF. S. MAQBUL AHMAD
Aligarh

CONTENTS

Printers : Liberty Art Press, New Delhi and Patna Litho Press, Patna.
Publisher : Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone 50109)
Editor : Dr. A. R. Bedar
Annual subscription : Rs100.00 (Inland), 20-00 Dollars (Asian countries), 40 Dollars (other countries)Rs. 25-00 per copy.

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

48

1988

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA-800004
(INDIA)

Khuda Bakhsh Library
JOURNAL

48

Khuda Bakhsh Oriental Public Library

PATNA